لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ○

یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا ہے۔ (سورۃ التین: آیت ۴)

امّت کے روشن چراغ

جلد دوم

حسبِ ایماء

شیخ طریقت حبیب الامت حضرت مولانا ڈاکٹر حکیم محمد ادریس حبان رحیمی ایم ڈی چرتھاولی حفظہ اللہ

خلیفہ ومجاز حضرت حاذق الامت پرنامبٹ (خلیفہ ومجاز حضرت مسیح الامت جلال آبادی) بانی ومہتمم دارالعلوم محمدیہ وخانقاہ رحیمی

مرتب

مولوی حکیم محمد عثمان عالم نادر قاسمی

استاذ دارالعلوم محمدیہ بنگلور

ناشر

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	:	امت کے روشن چراغ (جلد دوم)
حسبِ ایماء	:	حبیب الامت حضرت مولانا ڈاکٹر حکیم محمد ادریس حبان رحیمی حفظہ اللہ
مرتب	:	مولوی حکیم محمد عثمان عالم نادر قاسمی
کتابت وتزئین	:	حبان گرافکس بنگلور
صفحات	:	288
تعداد	:	گیارہ (۱۱۰۰) سو
قیمت	:	.....روپئے
ناشر	:	

مرتب کا مکمل پتہ

RAHEEMI SHIFA KHANA

#248, 6th Cross, Gangondanahalli Main Road,

Nayandhalli Post, Maysore Road

BANGALORE - 560039 (INDIA)

Ph.: 080-23180000, 23397836/72

www.raheemishifakhana.com

E-mail.: raheemishifakhana@yahoo.com

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
1	انتساب	15
2	حروفِ دلدار	16
3	مغل تاجدار شاہ جہاں	17
	تعمیر کے لئے ایک قابل قدر بورڈ کی ضرورت	18
	سب سے زیادہ قیمتی پتھر کا انتخاب	19
	سنگتراشوں کے انٹرویو لئے گئے	20
	ہر پتھر پر قرآن دم کیا جاتا	20
	۲۰ ہزار مزدور دن رات کام پر	21
	اس عمارت کا نام تاج محل رکھا گیا	22
	ممتاز محل شاہ جہاں کی زندگی	23
	سالانہ چالیس لاکھ لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں	24
4	لائق حکمراں نواب شاہجہاں بیگم	26
	شاہ جہاں بیگم کی پیدائش اور شادی	27
	جیل کو اصلاح خانہ بنادیا	27
	مذہبی اور عصری تعلیمی مراکز قائم کئے	28
	عمارتیں بنوانے کا شوق	29

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
	سیکولر روایات قائم کیں	31
	قرآن کی اشاعت کا کارنامہ	33
5	شہزادی زیب النساء بیگم	34
	زیب النساء حافظہ قرآن	35
	شہزادی زینب النساء کو شعر وسخن کا شوق	36
	وہ متعصب نہیں ہندو نواز تھے	36
	راجہ جسونت سنگھ اورنگ زیب کے جاں نثاروں میں	37
	شہزادی زینب النساء کی شادی	38
	زیب النساء بیگم نے شادی نہیں کی	39
	شہزادی غریب پرور تھیں	40
	شہزادی اپنے چھوٹے بھائی سے بہت محبت کرتی تھی	42
	شہزادی حافظہ قرآن تھیں	43
	شہزادی کا نام عشق ومحبت کی داستان ہیں	43
	شہزادی کا انتقال	44
6	شہزادی جہاں آرا بیگم	46
	قرآن کی حافظہ اور قاریہ بھی تھیں	47
	خواجہ اجمیری کے لئے عقیدت مندانہ اشعار	48
	شہزادی خواجہ اجمیری کے دربار میں	49
	آتشزدگی کا ناگہانی حادثہ	50
	شعر بیں کو بے مثال طریقہ سے نوازا گیا	51
	شہزادی کو اپنے والد سے بے حد نسیت تھی	52

	جہاں آراء کے بڑے صدمات	53
	والد کی خدمت میں جہاں آراء بیگم	54
	شاہ جہاں عبادت میں مصروف	55
	شاہ جہاں کا انتقال	55
	شہزادی جہاں آراء کی سیاسی طاقت	57
7	امۃ الحبیب-حمیدہ بانو بیگم	58
	امۃ الحبیب مسلمان ہوگئیں	59
	امۃ الحبیب کی تعلیم وتربیت	60
	امۃ الحبیب جنگ میں شریک	61
	امۃ الحبیب کا مردانہ لہجے میں بادشاہ کو خطاب	62
	امۃ الحبیب تیمور کی بیگم بن گئیں	63
	تیمور اور حمیدہ بانو بیگم کا انتقال	64
8	اعزاز النساء بیگم زوجہ سلطان شاہ جہاں	66
	اسی مسجد سے پہلی بار جہاد کا فتویٰ جاری ہوا	67
	اکبر آبادی مسجد کو شہید کر دیا گیا	69
	فرقہ پرستوں کے سامنے حکومت نے گھٹنے ٹیک دیئے	70
	اکابرین کے تاثرات مسجد اکبر آبادی کیلئے	71
9	آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر	74
	بہادر شاہ ظفر ہندوستان سے محبت کرتے تھے	75
	انگریز حکومت کے مظالم	76
	بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں کو شہید کر دیا	77

	بہادر شاہ ظفر کی آخری آرام گاہ	78
	بہادر شاہ ظفر کی اولاد کے ساتھ ناانصافی	78
	شاہ کی اولاد کی کسمپرسی	79
	شاہ ظفر کی ہندوستان سے محبت	80
	سور کی چربی کے کارتوس	81
	ہائے افسوس صد افسوس	82
10	شیر میسور اور عظیم مجاہد آزادی ٹیپو سلطان	83
	ٹیپو سلطان نے پہلی بار جنگ میں حصہ لیا	84
	ٹیپو سلطان کی دہشت اور رعب	85
	دریائے کاویری کا تاریخی بند	86
	اسلحہ سازی کے میدان میں کارنامے	87
	یا فتاح	88
	ٹیپو سلطان کی ذہانت	89
	حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ کا پیغام	91
	شہیدؒ کا دوسرا پیغام	93
	سائنسی دنیا کو ٹیپو سلطان کی دین	94
	بہترین ہتھیاروں کی تیاری	96
	راکٹوں کے موجد	96
	فوجیوں کی خصوصی ٹریننگ	97
	راکٹوں کی تیاری میں جدید تکنالوجی	98
	نیلی روشنیوں میں سرسراتے سانپ نما راکٹ	100

	ٹیپو سلطان کے زمانہ کے راکٹ لندن میں	101
11	بطلِ حریت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ؒ	103
	دینی تعلیم کا قلعہ تعمیر کرنے پر آمادہ کیا	104
	آپ کا تاریخی نام امداد حسین	105
	میدان کارزار کے امیر المجاہدین	106
12	مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور سر سید احمد خاں	107
	سر سید احمد کی تعلیم و تربیت	108
	مولانا قاسم نانوتویؒ کی تعلیم و تربیت	109
	تعلیم کے بعد دونوں کے راستے جدا جدا	110
	مسلمانوں کی مذہبی تعلیم پر کاری ضرب	111
	علماء کو پھانسی دی جارہی تھی	112
	ہمارے بزرگوں کی جدوجہد	113
	دو نظریوں کے دو ادارے قائم ہوئے	114
13	شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ	116
	آپ کے شاگرد ہزاروں میں	117
	ہر ہفتہ حضرت گنگوہی کی خدمت میں حاضری	118
	جمعیۃ الانصار کی تشکیل فرمائی	119
	غالب نامہ شیخ الہندؒ کے حوالے	120
	ہندوستان کی جلاوطن حکومت	121
	شیخ الہندؒ گرفتار کر لئے گئے	122
	حکیم سید نصرت کی شہادت	123

14	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ	125
	حکیم الامت کی سرگرمیاں	126
	حکیم الامت کی علمی خدمات	127
	حکیم الامت کا مقام اور مرتبہ	127
	دعوت تبلیغ میں درجہ کامل حاصل تھا	129
	ایک عجیب واقعہ	130
	حفیظ صاحب کی صاف گوئی	131
	حکیم الامت کی حکمت	132
	جگر اور مجذوب کی ملاقات	133
	حکیم الامت کا اصلاحی طور طریقہ	134
	حکیم الامت کی حق گوئی	135
	اشرف علی دراصل ایک ادارے کا نام	136
15	مولانا محمد علی جوہرؔ	137
	انقلابی رسالہ ''کامریڈ'' نکالا	138
	آپ کانگریس کے صدر بن گئے	139
	مولانا صبر و جمیل کا پیکر تھے	140
16	مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاںؒ	142
	طب یونانی میں جدید تحقیق	142
	حکیم اجمل خان کی خدمات	144
	حکومت کے خلاف اعلان جنگ	146
	جدید اصطلاحات کیلئے ریسرچ کمیٹی قائم	147

	حکیم صاحب کا انتقال	148
17	مولانا حسرت موہانی کی بیگم نشاط النساء	149
	بیگم حسرت خوداری کا مجسمہ تھیں	150
	بیگم نشاط کا خط مولانا حسرت کے نام	151
	اس اک عشق میں میں نے کیا کیا نہ دیکھا	151
	نشاط النساء بیگم کی خودداری	153
	عسرت اور تنگی کی داستان	153
	بیگم حسرت وفا شعار بیوی	155
18	شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ	156
	حضرت مدنیؒ کے والد محترم کا مشورہ	157
	حکومت برطانیہ کا تختہ الٹنے کی کوشش	158
	شیخ الہندؒ کا گرفتاری وارنٹ	159
	شیخ الہندؒ کا خطاب	160
	شیخ الہندؒ کا وصال پر ملال	162
	پسماندگان	162
	ایک تاریخی تقریر کا اہم اقتباس	162
19	مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ	164
	ایک دلچسپ واقعہ	165
	امیر شریعت کی گرفتاری	166
	مجذوب کی دعا	167
	امرتسر جیل سے روانگی	167

	بھنگی کا قبول اسلام	168
	خطیب الہند کا ذوق شاعرانہ	169
20	محترمہ آبادی بیگم	170
	وطن کے متعلق تلخ حقیقت	171
	بی اماں کی تقاریر	172
	بی اماں کا آزادی میں کردار	174
	بی اماں کی تقاریر کے پیغامات	175
	محترمہ آبادی بیگم کی ولادت	175
	بی اماں کی وفات	177
21	وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزادؒ	179
	مولانا آزاد بٹوارے کے لئے راضی نہ تھے	180
	ہندو مسلم ایک پلیٹ فارم پر	181
	مولانا آزاد کی زندگی کھلی کتاب	182
	مولانا آزاد کا قرآن سے شغف	183
	آزادئ وطن کی خاطر مولانا کی جدوجہد	184
	استخلاص وطن کے لئے قلمی جہاد کا آغاز	185
	نئی نسل کے نام مولانا کا پیغام	185
	مولانا آزاد کی پہلی تقریر	186
22	مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ	187
	ملک کی تحریکِ آزادی	188
	مولانا سیوہاروی کی خدمتِ خلق	189

	شیخ الہندؒ کی مالٹا سے رہائی	190
	نوجوانی میں شعلہ بیاں مقرر	191
	تادم آخر ممبر پارلیمنٹ	192
	مجاہد ملت کی گرانقدر تصنیفات	194
	اخبار الجمعیۃ بہترین روزنامہ	195
	مجاہد ملت کا تقویٰ	196
23	مولانا محمد عثمان فارقلیطؒ	198
	یہ بھی المناک حقیقت ہے	200
	مولانا فارقلیط کی خدمات	200
	مولانا کی صحافتی عظمت	201
	مولانا فارقلیط کا گھرانہ	202
	اسلام کی حقانیت اور صداقت کا اثر	204
	پادریوں سے مناظرے	205
	مولانا کی علمی قابلیت	206
	مساجد کی تعمیر اور مدارس کا قیام	207
	جمعیۃ علماء ہند کا اخبار	208
	کئی بار جیلوں میں گئے	209
24	فدائے ملت مولانا سید اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ	210
	فدائے ملت کی جدوجہد	212
	مولانا مدنی کو شیخ الاسلام کا خطاب	213
	فدائے ملت کی رحلت سے خسارہ	214

25	حضرت مولانا فیض احمد بدایونیؒ	217
	مولانا بدایونی عام آدمی نہیں تھے	218
	مولانا بدایونی کے آباواجداد	219
	مولانا بدایونی استاد مقرر ہوئے	220
	مساجد کے حصوں پر ناجائز قبضے	222
26	بیرسٹر اور صحافی مولانا مظہر الحق	224
	ناقابل انکار حقیقت	225
	سیاست میں فقیری یا ترک دنیا کا مفہوم	226
	مولانا کی ملکی اور سیاسی خدمات	227
	انجمن اسلامیہ جیسی تنظیم کی تشکیل	228
	یوپی کی عدلیہ کے منصف مجسٹریٹ	229
	بندھوا مزدور قانون پر تنقید	230
	کانگریس کی نمائندگی لندن میں	232
	ترکوں سے ہمدردی کا اظہار	233
	مظہر الحق ایک عظیم وطن پرست	234
27	ایڈوکیٹ شہید شاہد اعظمی	236
	مسلمانوں کے ساتھ پولس کی زیادتی	238
	شاہد اعظمی کو شہید کر دیا گیا	239
	ایڈوکیٹ شہید اعظمی کو دھمکی	239
	اعظمی کی شہادت پر رنج وملال	240
28	آمنہ قریشی اور بہن ریحانہ	242

	آمنہ کی خدمات کا تذکرہ	243
	آشرم میں شادی کا اہتمام	244
	امام عبدالقادر کا انتقال	245
	ڈاکٹر کچلو کا خاندان	246
	ڈاکٹر کچلو کا نعرہ	248
29	جنوبی ہند کے نامور مورخ محمود خان محمودؔ	250
	محمود خان کے آباواجداد	251
	محمود خان کے جذبات	252
	تاریخ کے موضوع سے دلچسپی	253
	فرقہ وارانہ گندے اثرات	254
	محمود خان کی شاہ کار تصنیف	255
30	غم خوارِ ملت مولانا محمد شفیع مونسؒ	258
	محمد شفیع مونس کا وطن	259
	اقامت دین کے جذبہ سے سرشار	260
	قید و بند کی صعوبتیں	262
	مطالعہ قرآن کا خصوصی شغف	262
	مولانا کا پائے استقامت	263
	معاملہ فہم بھی اور ذمہ دار بھی	265
31	خان بہادر عباس خان	267
	مسلمانوں کا کوئی ہمدرد نہیں	267
	خان بہادر عباس خان کی خدمات	268

	قومی بیداری مہم	269
	مسلم ہال کی تعمیر	270
	مسلمان قیدیوں کے لئے سہولت	272
	حکومت میں اثر و رسوخ	272
32	محمد غلام محی الدین مہکری	274
	مہکری صاحب حکمت کا مجسمہ	174
	پرتعیش بود و باش	275
	ایم جی مہکری ڈپٹی کمشنر	176
	مہکری کو معتمد الملک کا خطاب	177
33	شاعر مشرق علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ	180
	تعلیم	181
	اعلیٰ تعلیم	181
	تدریس اور وکالت	181
	علامہ اقبال کا مزار	182
	اقبال کی نظموں کا فنی فکری تجزیہ شکوہ	182
	شاعری کی شہرت	184
	شاعری کے مختلف ادوار	184
	شاعری کا پہلا دور	185
	روایتی غزل گوئی	186
	ترانۂ اقبالؒ	187

☆☆☆

بحمداللہ تعالیٰ ''اُمت کے روشن چراغ'' جلد دوم کا

اہل بیتِ اطہار، اور شہدائے کربلا یعنی حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کے ساتھ جامِ شہادت نوش کرنے والی جملہ ہستیوں کے ساتھ، شہیدِ اکبر عمِّ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے نام معنون کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ کہ جب بھی ان شہدائے عظیم کا ذکرِ خیر ہوتا ہے تو میرے استادِ محترم حضرت حبیب الامت عمت فیوضہم کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان عظیم ہستیوں کو اپنی شایانِ شان بلند درجہ عطا فرمائے۔ اور ان کے صدقے میں ہم لوگوں کو بھی حسن خاتمہ عطا ہو۔ آمین ثم آمین!

خادم

مولانا محمد عثمان عالم نادر قاسمی

مورخہ ۲۴ ستمبر ۲۰۱۳ء

مطابق ۱۷ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ، بروز منگل

حروفِ دلدار

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمُ . اَمَّا بَعْد

برادرِ اختر مولانا حکیم محمد عثمان عالم نادر قاسمی صاحب نے ''امت کے روشن چراغ'' جلد دوم میں حضرت حبیب الامت دامت برکاتہم کے پسندیدہ واقعات کو جمع فرمایا ہے۔ حضرت والا گاہِ گاہِ ایسے حضرات کے مضامین اور تاریخ بھی اپنی مجالس میں بیان فرماتے ہیں یا دیگر حضرات کے لکھے ہوئے مضامین سنتے ہیں کہ جن کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کا پتہ چل سکے ایسے ہی مضامین پر مشتمل یہ کتاب قارئین کرام کے ہاتھوں میں ہے۔ حضرت والا نے ان میں سے اکثر واقعات کو جا بجا ملاحظہ فرمایا اور پھر شائع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو خواص اور عوام کے لئے نافع اور ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین ثم آمین یارب العالمین!

خادم آستانہ حبیب الامت حفظہ اللہ

محمد عثمان حبان دلدار قاسمی

خانقاہ رحیمی بنگلور

مورخہ ۲۴ ستمبر ۲۰۱۳ء

مطابق ۱۷ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ، بروز منگل

مغل تاجدار شاہ جہاں[1]

محبت بڑا خوبصورت لفظ ہے لیکن محبت جب ایک بادشاہ کرتا ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ جہاں لونڈیاں اس کا استقبال کرتی ہیں اسکے ایک حکم پر دنیا کا حسن اسکے پہلو میں آسکتا ہے تو پھر اتنی طاقت والا بادشاہ اپنی بیاہتا بیوی سے محبت کرے، بے تحاشہ محبت کرے، اتنی محبت کہ جس کی مثال ڈھونڈے نہیں ملتی۔ حیرت کی بات ہے اور وہ بادشاہ جس نے ٹوٹ کر محبت کی تھی وہ شاہ جہاں تھا مغل بادشاہ جسکی حکومت کو مغلوں کے دور کا سنہری حصہ کہا جاتا ہے۔ بادشاہ شاہ جہاں کی کئی بیویاں تھیں لیکن ممتاز محل اسکی تیسری بیوی تھی جو بے حد خوبصورت تھی۔ حسن کی انتہا اور محبت کی پتلی بیوی تھی وفا شعار، خدمتگار اور نہایت نازک اندام۔ ممتاز محل کے تیرہ بچے تھے اور چودھویں اولاد کی پیدائش کے وقت اسکی موت واقع ہوگئی۔ اور اس صدمے کو شاہ جہاں برداشت نہیں کرسکا۔ اسکے انتقال کے ایک برس بعد شاہ جہاں نے سوچا کہ اسکی محبت ممتاز محل سے لافانی تھی۔ اور وہ دنیا کو بتا دینا چاہتا تھا کہ وہ ٹوٹ کر محبت کرنے والا انسان ہے۔ اور اسکا ثبوت وہ ایک ایسا مقبرہ بنا کر پیش کرنا چاہتا تھا جسے دنیا یاد کرے اور یہ عمارت شاہ کار بن کر رہ جائے اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اس کی محبت کا ثبوت دیتی ہے۔

[1] بشکریہ: ڈاکٹر سی وائی ایس خان بنگلور: سہارا، ۹ رمئی ۲۰۱۰ء

تعمیر کے لئے ایک قابل قدر بورڈ کی ضرورت

شاہ جہاں کو اس بات کا علم تھا کہ مغلوں نے اس سے پہلے کئی شاہ کار عمارتیں اور خوبصورت محلات تعمیر کئے تھے۔ اس کے پردادا کا مقبرہ ''ہمایوں کا مقبرہ'' اپنے اندر ایک عظمت رکھتا تھا۔ جمنا کے اس چار خوبصورت مقبرہ اور محلات جسے اعتماد الدولہ اور خود اس کی بنائی ہوئی کئی مسجدیں جس کا ثانی نہیں تھا، ایسی ہی ایک عمارت جامع مسجد اس نے دہلی میں بنائی تھی جو ایک شاندار مسجد مانی جاتی ہے اب اس کے سامنے ان تمام تعمیرات سے بہتر چیز بنانے کا خیال تھا۔ ایسی عمارت جو عمارتوں کی تاریخ میں ایک سنگ میل بن کر رہ جائے۔ ایسی عمارت جو اس کی لافانی محبت کا منھ بولتا نمونہ ثابت ہوجائے۔ لہٰذا اس نے اپنی قابلیت کے مطابق ایک بہت قابل بورڈ تشکیل دیا جس میں آخری فیصلہ خود اس کا ہوتا تھا۔ مہینوں تک مشورے ہوئے اس کے بعد وہ جگہ تجویز کی گئی جہاں مقبرہ بنایا جائے، جمنا ندی کے کنارے اس بات کا خیال بھی رکھا گیا کہ اگر جمنا ندی کا بہاؤ بڑھ کر اونچا بھی گیا تو کہاں تک بڑھ سکتا ہے اور پانی کی اونچائی کس حد تک بڑھ سکتی ہے اور پھر یہ جگہ اس لئے بھی تجویز کی گئی کہ جمنا ندی کا پانی جب گرمیوں میں بھاپ بن کر اٹھے گا تو اس ٹھنڈی بھاپ سے مقبرہ کو فائدہ ہی ہوسکتا ہے دوسرے ندی کے کنارے خوابوں کی تعبیر بے حد خوبصورت دکھائی دیگی۔ خصوصیت سے چاندنی راتوں میں جب چاندنی پانی پر پڑے گی تو یہ عمارت خوبصورتی میں اضافہ ہی کرسکتی ہے۔ اور خوبصورتی دوبالا ہوجائیگی۔ اس کے بعد ندی کے کنارے کنارے بہت سی منی کے سیمپل اکٹھا کئے گئے اس بات کو بھی خیال رکھا گیا کہ ندی کے کنارے وہ کونسی جگہ ہے جہاں کا بیڈ Bed سخت ترین ہو۔ کئی معماروں کو طلب کیا گیا۔ بیٹھکیں طلب کی گئیں۔ بحث ومباحثے کئے گئے اور جب اس بات کا

فیصلہ کرلیا گیا کہ مقبرہ کس طرح بنایا جائے۔ اگر ضرورت پڑی تو ممتاز محل کی قبر کو ہی مٹی کے تودے کے ساتھ لے آیا جائے۔ دنیا بھر معماروں کو بلایا گیا۔ انجینئر جو اپنے فن میں ماہر تھے اکٹھا کئے گئے۔ اس بڑے پروجیکٹ کے سربراہ استاد احمد لاہوری تھے اور انکا ساتھ دینے کے لئے عبدالکریم معمور خان، حکومت خان وغیرہ بہت سے معمار تھے۔ اس شاہ کار سے پہلے جو بھی شاہ کار عمارت بنوائی گئی تھی وہ سب کی سب Red Sand Stone سے بنائی گئیں تھیں۔ لیکن اس بار اس شاہ کار عمارت کو سنگ سفید میں بنوانے کی ٹھانی۔ بس کیا تھا ساری دنیا سے سنگ مرمر کے نمونے منگوائے گئے۔ ان پر تجربات کئے گئے انہیں پٹخا گیا، پھوڑا گیا، منوں وزن میں دبایا گیا غرض ہر قسم کے تجربے کے بعد سنگ مرمر کو چنا گیا اور اتفاق کی بات تھی کہ ہندوستان کے شہر راجستھان کا ہی پتھر ان تمام تجربات پر کھرا اور پورا اترا۔

سب سے زیادہ قیمتی پتھر کا انتخاب

اس نے تمام براعظم ایشیا سے ضرورت کے قیمتی پتھر منگوانا شروع کیا۔ سفید سنگ مرمر راجستھان سے منگوایا گیا معلوم ہوا کہ ان دنوں جس سنگ مرمر کو منگوایا گیا تھا وہ آدھا شیشہ جیسا تھا یعنی پتھر کے پار رکھی ہوئی چیز کو آسانی سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا لیکن اس بات کا پتہ چل جاتا تھا کہ پتھر کی دوسری طرف کچھ رکھا ہوا ہے۔ Translucent Marble۔ پنجاب سے Jasper پتھر منگوائے گئے چین سے کانچ جیسے Crystal اور Jade منگوائے گئے، تبت سے بیش قیمت پتھر Torqueise لایا گیا اور افغانستان سے بیش قیمت رنگین پتھر Lapis Lazuli منگوایا گیا۔ موجودہ سری لنکا سے ہرا پتھر جو ہیروں سے کسی طرح کم نہیں تھا Sapphire اور عرب سے چمکیلا ہیروں جیسا Carnelian پتھر منگوایا گیا۔ سنگ مرمر میں نقاشی کر کے اس میں رنگین ہیروں سے بھی

قیمت پتھروں کو بٹھانا تھا۔ معلوم ہوا کہ پورے اٹھاویس بیش قیمت پتھروں سے نقاشی کی گئی۔ ہر ذات کے پتھر کی جو کسی بھی طرح Precious Stone اور Semi Precious Stone تھے انکے نمونے منگوائے گئے۔ ماہرین کی رائے لی گئی۔ جوہریوں نے اپنی رائے دی۔ اس بات کا بھی خیال رکھا گیا کہ جو پتھر اور ہیرے اس عمارت میں جڑنے والے تھے وہ وقت کے ساتھ ساتھ اپنی خوبصورتی نہ رکھے جائیں۔

سنگتراشوں کے انٹرویو لئے گئے

سنگتراشوں کے انٹرویو لئے گئے۔ بہترین کاریگروں کو ایک ایک کر کے چنا گیا۔ اور آخر میں ایسے کاریگروں کی ایک ٹیم بنائی گئی جو اپنے کام میں ماہر تھے، جو فنکار تھے جو جانتے تھے کہ پتھروں کو زیادہ توڑ پھوڑ کئے بغیر خوبصورت شکل دی جاسکے۔ اور دور تک خیمے اور شامیانے لگوائے گئے کاریگروں کے آرام کی پوری پوری سہولت رکھی گئی تھی۔ ان کا کھانا پینا، چائے پانی اور ضرورت کی ہر بات کا خیال رکھا گیا۔ مال برداری کے جانوروں کے اصطبل بنوائے گئے۔ ان کے چارے پانی کا انتظام کیا گیا ان کی دیکھ بھال کرنے والے مہاوتوں اور دوسرے کارندوں کی رہائش کے انتظام کئے گئے۔ علماء کو بلایا گیا۔ انکے ٹھہرنے کے انتظامات کئے گئے، حفاظ کرام کی بہت بڑی ٹیم جمع کی گئی۔ ہر ایک حافظ کو ذمہ داری دی گئی کہ وہ پورے احترام کے ساتھ کلام شریف کو پڑھے اور عمارت میں لگائے جانے والے ہر پتھر کو اپنے سامنے رکھ کر کلام شریف کا دم کیا جائے۔

ہر پتھر پر قرآن دم کیا جاتا

نجومیوں اور عاملوں نے اس بات کا خدشہ ظاہر کیا تھا کہ اتنی عظیم عمارت کے بن جانے کے بعد بدنگاہوں کا شکار ضرور ہوگی اس لئے ایک طرف پروہت اپنے

شلوک کے ساتھ پتھروں کو عمارت کے قابل قرار دیتے تھے تو اس پتھر پر قرآن دم کیا جاتا تھا اور ان پتھروں کو نہایت ادب اور احترام کے سکھ کر مزدور سنگ مرمر کے تراشے ہوئے پتھروں کو مستریوں کے پاس لے جاتے تھے۔ اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ کسی بھی حالت ان تراشے ہوئے پتھروں کے ساتھ بے ادبی نہ ہونے پائے۔ لہٰذا ایک پتھر کے دیوار میں چن دئے جانے تک مزدور دوسرے پتھر کو سر پر اٹھائے ہی رکھتا تھا۔ اس طرح عمارت کا ایک ایک پتھر جوڑا گیا۔

۲۰ ہزار مزدور دن رات کام پر

حیرانی کی بات: حیرانی کی بات یہ تھی کہ ہر ایک پتھر کو دیوار میں چن دئے جانے کے قابل تھا اس پر قرآن شریف پڑھ کر دم کیا جاتا تھا پتہ ہو کہ ہر پتھر پر مکمل قرآن پڑھا گیا تھا۔ اس خیال سے کہ اس شاہ کار عمارت کو اس کے مکمل ہو جانے کے بعد وہ بد نگاہوں کا شکار نہ ہو جائے۔ پتھروں پر نقاشی کرنے سے پہلے آرٹسٹ الگ الگ رنگوں کے قلم سے پتھروں پر نقشے بنا دیتے تھے جس کی نوک پلک درست کرنے کے لئے ماہر مصور معمور کئے گئے تھے۔ ایک ایک نقشے پر دھیان دیا جاتا تھا۔ بڑے بڑے سنگ مرمر کی سلوں کو کاٹ کر تراشا جاتا تھا۔ جہاں ایک سیل کی ضرورت ہوتی تو دو دو بلکہ تین چار الگ سے سلیں بنوائی جاتی تھیں اس خیال سے کہ اگر سنگ تراشی کی غلطی ہو جاتی تھی۔ یا لانے لیجانے میں غلطی ہو سکتی تھی یا تراشی گئی سلوں کے گر جانے وغیرہ پر وقت نہ گنوانے کے لئے ایسے سارے انتظامات کر لئے گئے تھے۔ بیس ہزار مزدور دن رات کام پر لگ گئے تھے جس میں ہزاروں کی تعداد میں ایسے نازک کام کرنے والے سنگ تراش تھے جو بال سے بھی باریک کام کرنے کے قابل تھے۔ ان تمام مزدوروں انجینئروں اور سنگ تراش انسانوں کو فلسطین، ایران اور جنوبی

ہندوستان سے خاص طور پر بلایا گیا۔ خصوصیت سے بلوچستان سے ایسے کاریگر بلوائے گئے جو خالص سنگ مرمر سے نازک پھولوں کو تراشتے تھے۔ ان تمام کے اوپر پینتیس ایسے خاص کاریگر تھے جو اپنے فن کے استاد تھے۔ اس شاہ کار عمارت کو تیار کرنے والے بے حد اہم انجینئر اور نقاش کچھ اس طرح تھے اسماعیل آفندی عمان حکومت سے بلوائے گئے تھے اور وہ اس عمارت کے سب سے بڑے گنبد کے معمار تھے۔ استاد عیسیٰ اور محمد آفندی جن کا تعلق ایران سے تھا انہوں نے عمارت کا نقشہ بنایا۔ ایران کے پورے پراجیکٹ پورے آرکیٹیکٹ کے نگہبان تھے۔ کاظم خان کے ذمہ خالص سونے کے کام کا ذمہ تھا جنہیں لاہور سے بلوایا گیا تھا۔ فرش پر سنگ مرمر بٹھانے کے کام کے لئے چرنجی لال جن کا تعلق دہلی سے تھا یہ کام سپرد کیا گیا۔ امانت خان جو شیراز ایران سے بلوائے گئے تھے اہم کاتب تھے۔ جنہوں نے قرآنی آیات کی کتابت کی تھی ان تمام کے علاوہ چار اہم انسانوں نے بہت اہم کام کو اپنے ذمہ لیا تھا۔ سب لوگ اپنی اپنی ذمہ داری کو بڑی عرق ریزی سے نبھا رہے تھے کیونکہ ہر شام اپنے اپنے شعبہ کے سربراہ کو دن بھر کی کارروائی کی رپورٹ دینی ہوتی تھی۔

اس عمارت کا نام تاج محل رکھا گیا

اس عظیم عمارت کا نام تاج محل رکھا گیا اور اس کا کام 1632ء میں شروع ہوا۔ عمارت کی بنیاد چوکور رکھی گئی 192.5 فیٹ لمبی چوکور بنیاد رکھی گئی اور زمین سے بہت سے کوئیں کھودے گئے اس میں کوڑا کرکٹ ڈالا گیا تا کہ تاج محل کا بیڈ Bed بن سکے اور پھر اس پر 192.5 فیٹ بنیاد کو اوپر اٹھایا گیا اور اسی لمبائی اور چوڑائی کی بنیاد کو اوپر اٹھا کر عمارت کو شروع کیا گیا۔ بنیاد بنانے سے پہلے زمین کو پندرہ فیٹ نیچے تک کھودا گیا، مٹی نکالی گئی پھر موٹے پتھر ایک کے بازو ایک بٹھائے گئے۔ پتھروں کے درمیان

کی جگہ کو اینٹ، چونا اور انڈے ملا کر پیسا گیا مسالہ بھرا جاتا اور جیسے ہی بڑے پتھروں کی پہلی پرتھ چونا، ریت اور انڈوں کو ملا کر باریک پیسا ہوا مسالہ تیار کر کے دو دن پہلے سوکھے ہوئے پتھروں پر ڈالا جاتا اس کے بعد پتھروں کی پرتھ ڈالی جاتی جو پہلی پرتھ کے پتھروں سے سائز میں ذرا چھوٹے ہوتے تھے۔اس طرح ایک کے بعد ایک کر کے پتھروں کو بٹھایا جا رہا تھا۔

اور تب ایک مضبوط پلاٹ فارم بنایا گیا۔بیس ہزار مزدور دن رات برابر کام پر لگ گئے ملبہ کو ہٹانے ایک ہزار اونٹ معمور کئے گئے اور مال بردار اور پتھر سنگ مرمر اینٹ وغیرہ لانے کیلئے الگ سے ایک ہزار ہاتھی مقرر کئے گئے۔تاج محل کے چاروں طرف میناروں کی بھی تعمیر اسی وقت شروع کی گئی جب یہ مینار یں مکمل ہوئیں تو ان کی اونچائی 140 فٹ رکھی گئی۔ممتاز محل کی قبر کو عارضی کمرہ میں بند کر دیا گیا اس خیال سے کہ عمارت کے بنوانے کے دوران اینٹ اور پتھر نہ ٹکرا سکیں، آہستہ آہستہ تاج کی شکل بنتی گئی۔اور جب اس پر اس کا گنبد بنوایا گیا تو اس کی اونچائی 24.5 فٹ رکھی گئی۔تاج کی خصوصیت اس کا درمیانی گنبد ہی مانا گیا ہے۔ان دنوں اس گنبد کے اوپر سونے کا کنول پھول بنوایا جس کا وزن کئی من سونا تھا۔اور اسکی شکل لمبے ستون کے اوپر جھکا ہوا چاند تھا۔لیکن جب انگریزوں کی حکومت برسر اقتدار آئی تو اس سونے کے پھول اور چاند کو پیتل کی شکل میں بدل دیا گیا۔باہری نقش ونگاری مغلوں کی تمام بنائی گئی عمارتوں میں سے سب سے بہتر ہوئی تھی۔

ممتاز محل شاہ جہاں کی زندگی

تمام تاج کے چاروں طرف جو عربی آیات ہیں انکی تفصیل اس طرح ہے۔سورۃ: 35, 39, 48, 67, 77, 82, 84, 89, 91, 93, 94, 95, 98, 112, ۔دراصل اس

کاتب کا نام جس نے ان سورتوں کو لکھا، تراشا اور اپنی نگرانی میں چنا تھا اس کا نام عبد الحق تھا جسے ایران سے بلوایا گیا تھا۔لیکن جب اس نے شاہ کار بنا ڈالا تو شاہ جہاں نے اس شخص کو امانت خان کا لقب دیا۔تاج محل کی تکمیل کے دوران جب بھی نور جہاں کی موت کا دن آتا تو شاہ جہاں اپنی بیگم ممتاز محل کے مزار کے قریب دوزانوں ہو کر بیٹھ جاتا تھا اور پوری عقیدت سے اپنا سر خم کر کے قرآن کی تلاوت کرتا تھا۔اس کا خیال تھا کہ اس طرح اس کی تلاوت سے مرحوم ممتاز محل کی روح کو سکون ملے گا اور اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کر دے گا۔ممتاز محل شاہ جہاں کی سب سے چہیتی بیگم تھیں اور شاہ جہاں کی زندگی کہلاتی تھیں۔وہ نہ صرف شاہ جہاں کی بیگم تھیں بلکہ ایک مخلص دوست اور رہنما بھی تھیں اور جہاں بھی وہ حکومت کے فیصلوں کیلئے مشکل میں پڑ جاتے تو وہ ممتاز محل ہی تھی جو اسکی رہنمائی کیا کرتی تھی۔ممتاز محل کے چودہ بچے ہوئے تھے۔ان میں صرف سات بچے زندہ بچ سکے تھے۔ممتاز محل کی آخری اولاد کو جنم دیتے دیتے اسکی موت واقع ہوئی تھی وہ پیدا ہوئی ایک صحت مند لڑکی تھی۔ممتاز محل کے انتقال کے بعد شاہ جہاں نے اپنے آپکو ایک کمرے میں قید کر لیا اور پورے ایک ہفتے تک کھانے پینے سے انکار کر دیا۔کہا جاتا ہے کہ جب بہت منت کرنے کے بعد شاہ جہاں اس کمرے سے باہر نکلا تو کسی نے اسے پہچانا نہیں کیونکہ اسکے سر کے بال اور داڑھی کے بال سفید برف جیسے بن گئے تھے۔آپ نے تاریخی کتابوں میں جہاں بھی شاہجہاں کو دیکھا ہے تو ان تمام تصاویروں میں اس کی داڑھی کالی بتائی گئی ہے۔

سالانہ چالیس لاکھ لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں

1998ء میں مورخ Christine Moorcraft نے اپنی کتاب تاج محل میں لکھا ہے کہ تاج محل بنوانے کے لئے جس جگہ کا انتخاب کیا تھا وہ شاید جمنا ندی کے ساحل کا

سب سے خوبصورت حصہ تھا اور شائد اس لئے بھی کہ لال قلعہ سے صاف دکھائی دینے والی جگہ تھی۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے تاج کو دیکھ کر کہا تھا کہ وقت کے گالوں پر نکلا ہوا ایک خوبصورت آنسو تھا جو کسی بھی طرح موتی سے کم نہیں ۔ تاج محل کے صدر دروازے سے داخل ہوتے ہی جو مزاریں دکھائی دیتے ہیں وہ دراصل نقلی مزاریں ہیں نیچے تہہ خانے میں اصل مزاروں کے بالکل اوپر نقلی مزاریں ہو بہو بنوائی گئی ہیں۔ بلکہ اصل مزاروں سے کہیں خوبصورت اور نقاشی کا بہترین نمونہ نقلی مزاریں بنائی گئی ہیں۔تاج محل کا پرانا نام: جب تاج محل بنوایا گیا تو اس کا نام ''روضہ'' رکھا گیا تھا لیکن اس کی مقبولیت اور شاہ جہاں کے ڈیزائن کو دیکھنے کے بعد تاج محل نام رکھا گیا تھا۔ تاج محل جمنا ندی کے کنارے بنایا گیا ہے، تقریباً 42 ایکڑ زمین اسکی خوبصورتی کے لئے باغ بنوا کر مختص کیا گیا ہے اسے دیکھنے کے لئے سالانہ چالیس لاکھ لوگ آتے ہیں جن میں ۲ لاکھ غیر ملکی سیاح ہوتے ہیں اس شاہ کار عمارت کو دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک قرار دیدی گئی ہے۔ جب Seven Wonders of the World کا مقابلہ رکھا گیا تھا تو تاج محل کیلئے 100,000,000 لاکھ دنیا بھر سے ووٹ ڈالے گئے تھے۔تاج محل کو دیکھنے کے اوقات مقرر کئے گئے ہیں۔تاج محل کو دیکھنے کے اوقات صبح چھ بجے سے شام سات بجے تک مقرر کئے گئے ہیں۔ جمعہ کے دن چھٹی دیدی گئی ہے۔ جمعہ کے دن جب چھٹی ہوتی ہے تو دوپہر بارہ بجے سے دو بجے تک نماز کے لئے احاطہ کھول دیا جاتا ہے۔

☆☆☆

لائق حکمراں نواب شاہجہاں بیگم [۲]

برطانوی اقتدار کی زیر نگیں ملکی ریاست میں بھوپال کی خاتون حکمرانوں کے عہد کو وسط ہند کے اس خطے کی تاریخ میں سنہرے باب کی حیثیت حاصل ہے۔نواب گوہر قدسیہ بیگم اور نواب سکندر بیگم کی کامیاب حکمرانی کے بعد نواب شاہجہاں بیگم کا نام اپنی غیر معمولی خوبیوں کے باعث ہندوستانی خواتین کے لئے گرانقدر سرمایۂ فخر وناز ہے۔اس عظیم خاتون کے دور حکومت کو ریاست بھوپال کی تاریخ میں ''عہد شاہجہانی'' کا نام دیا گیا ہے۔شاہجہاں بیگم کی شخصیت پر ان کے نام کی طرح عظیم مغل شہنشاہ شاہجہاں کا پرتو تھا۔اس اولوالعزم والی ریاست کو بھی عمارات کی تعمیر کا شوق تھا۔شہر بھوپال میں نواب شاہجہاں بیگم کا تعمیر کردہ تاج محل پلیس اور مشہور عالم مسجد ''تاج المساجد'' اور متعدد شاندار تعمیرات اسی ''دورِ شاہجہانی'' کی لافانی یادگاریں ہیں۔نواب شاہجہاں بیگم کے عہد میں تمام علوم وفنون بالخصوص اردو زبان وتہذیب اور اقدار اسلامی کو تاریخ ساز فروغ حاصل ہوا۔بھوپال عہد شاہجہانی میں عظیم المرتبت علماء، فضلاء، ادباء وشعرا کا مرکز بن گیا تھا۔

(مقالہ نواب شاہجہاں بیگم، سہ ماہی فکر وآگہی، بھوپال نمبر 1996ء)

۲ مضمون کی تیاری میں فاروق ارگلی کے مضمون سے اقتباسات لئے گئے، سہارا، ۲۶/اپریل ۲۰۱۱ء

شاہ جہاں بیگم کی پیدائش اور شادی

نواب شاہجہاں بیگم کی پیدائش 29 جولائی 1838ء کو اسلام نگر بھوپال میں ہوئی۔ 1844ء میں نواب سکندر جہاں بیگم کو اپنے شوہر نواب جہانگیر محمد خاں کے انتقال کے بعد والی ریاست بھوپال اور صرف چھ سال کی بیٹی شاہجہاں بیگم کو ولی عہد تسلیم کیا گیا۔ نواب سکندر جہاں بیگم نے شاہجہاں بیگم کو بہترین تربیت اور اعلیٰ ترین تعلیم سے آراستہ کیا، ان کی تعلیم کے لئے اس وقت کے نامور اساتذہ مولوی حبیب احمد، مولوی حیدر علی، منشی رضا حسین اور دیوان ٹھاکر پرشاد وغیرہ مقرر ہوئے۔ شاہجہاں بیگم کو شہسواری، نشانہ بازی اور فنون حرب کی بہترین تربیت دلوائی گئی۔ والد سکندر جہاں بیگم نے کافی غور وخوض اور تلاش کے بعد نواب شاہجہاں بیگم کی شادی 1855ء میں ریاست کے وفادار اور خاندانی پٹھان بخشی محمد باقی خاں سے کر دی۔ سکندر بیگم سرکار برطانیہ سے یہ بات منوا چکی تھی کہ انکی بیٹی کا شوہر صرف علامتی نواب ہوگا اور تمام اختیارات حکومت نواب شاہجہاں بیگم کو ہی حاصل ہوں گے۔ نواب شاہجہاں بیگم دو بچیوں سلطان جہاں بیگم اور سلیمان جہاں بیگم کی ماں بنیں لیکن سلیمان جہاں بیگم کا عالم طفلی میں ہی انتقال ہوگیا۔ 1867ء میں نواب باقی محمد خاں بھی چل بسے اور صرف ایک سال بعد 1868ء میں سکندر بیگم بھی دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ اسی سال نواب شاہجہاں بیگم بھوپال کے مسند اقتدار پر فائز ہوئیں۔

جیل کو اصلاح خانہ بنا دیا

نواب شاہجہاں بیگم ایک ذہین اور دوررس حکمراں ثابت ہوئیں۔ انہوں نے ریاست کے ہر محکمے اور ہر شعبۂ حیات کی اصلاح وترقی کی جانب توجہ دی۔ ریاست

میں قانون اور عدلیہ کے نظام کو مضبوط بنایا۔ جرائم کی بیخ کنی کیلئے سخت قوانین نافذ کئے اور پولیس کے محکمے کو درست کیا۔ نواب صاحبہ نے بھوپال میں ایک ایسی ماڈل جیل بنوائی جو قید خانہ سے زیادہ اصلاح خانہ تھی جہاں جرائم پیشہ اور سزا یافتہ لوگوں کیلئے اس طرح کا ماحول پیدا کیا گیا کہ دوران سزا وہ بہترین انسان بن جائیں اور آزاد ہونے کے بعد صحت مند سماج کا حصہ بنیں۔ انہوں نے حفظان صحت کا بہترین انتظام کرایا۔ بھوپال میں انہوں نے دو جدید ہسپتال کھلوائے جن میں ایک پرنس آف ویلز ہاسپیٹل اور دوسرا زنانہ ہسپتال لیڈی لینڈس ڈاؤن تھا۔ یہ ہسپتال اب حمیدیہ ہسپتال اور سلطانیہ زنانہ ہسپتال کی صورت میں آج بھی موجود ہیں۔ نواب صاحبہ نے سیہور میں جذامی مریضوں کے لئے باقاعدہ شفاخانہ ریاست میں پہلی بار قائم کیا۔

مذہبی اور عصری تعلیمی مراکز قائم کئے

نواب سکندر بیگم کے وقت تک ریاست میں ڈاک کا نظام صرف ریاست اور سرکاری امور تک محدود تھا۔ نواب شاہجہاں بیگم نے پوری ریاست میں ڈاک کا نظام عام لوگوں کیلئے قائم کرایا۔ انہوں نے جگہ جگہ ڈاکخانے قائم کئے۔ ڈاک کے نقل وحمل اور تقسیم کیلئے بڑی تعداد میں تربیت یافتہ کارکن مقرر کئے گئے۔ نواب شاہجہاں بیگم نے دہلی سرکار کی طرز پر ریاست کے ڈاک ٹکٹ تیار کرائے۔ یہ اس وقت ایک غیر معمولی کارنامہ تھا۔ نواب شاہجہاں بیگم بذات خود اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھیں اور اپنی ریاست کی نئی نسل کو بہترین عصری تعلیم سے مرصع کر کے ترقی کی شاہرہ پر آگے بڑھانے کی شدید آرزو رکھتی تھیں۔ نواب صاحبہ نے ریاست میں تعلیم کے فروغ کے لئے غیر معمولی اقدامات کئے۔ بھوپال کی نامور ادیبہ محترمہ رضیہ حامد ''بیگمات بھوپال'' کے مصنف امین زبیری کے حوالے سے لکھتی ہیں: ''نواب شاہجہاں بیگم نے

ریاست بھوپال میں تعلیم کے فروغ کے لئے باقاعدہ محکمہ تعلیمات قائم کیا۔اس محکمے کا نام 'نظارۃ المعارف عمومیہ' تھا۔ انہوں نے کئی مدرسے قائم کئے، اپنے والد نواب جہانگیر محمد خاں کی یادگار کے طور پر مدرسہ جہانگیریہ قائم کیا۔ جہاں دور دور سے طلبہ آتے تھے اوران کو وظائف دیئے جاتے تھے۔ صنعتی تعلیم (انڈسٹریل ٹریننگ) کیلئے نواب شاہجہاں بیگم نے پرنس آف ویلز اسکول قائم کیا جہاں غریب اور نادار طلبہ کیلئے لباس اور کھانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔انہیں تعلیم وتعلم سے خاص شغف تھا۔انہوں نے اپنی والدہ سکندر بیگم کے قائم کردہ مدرسہ سلیمانیہ کو ترقی دی اور (اینگلو اورینٹل سلیمانیہ اسکول کے نام سے) 1892ء میں اس کا الحاق کلکتہ یونیورسٹی سے کیا۔ انہوں نے مدارس میں اردو، عربی اور فارسی کے ساتھ انگریزی تعلیم کا خاص طور پر انتظام کیا۔ مدرسوں کیلئے باقاعدہ نصاب جاری کئے ،مدارس کے اساتذہ کی ملازمت کیلئے سرٹیفکیٹ اور اسناد کو لازمی قرار دیا''۔ (نواب سلطان جہاں بیگم،ص 56) نواب شاہجہاں بیگم نے اقتدار سنبھالتے ہی تعلیمی ترقی کا ایک وسیع منصوبہ بنایا جس کے تحت مدرسہ سلیمانیہ کو انہوں نے عملی طور پر ایک مشرقی دارالعلوم بنادیا۔ مدرسہ سلیمانیہ سے عربی وفارسی کی اعلیٰ سندات منشی فاضل اور مولوی فاضل حاصل کر کے طلبہ صحیح معنی میں مشرقی علوم کے ماہر ہوجاتے تھے۔ بعد میں کالج کی حیثیت سے مدرسہ سلیمانیہ کا الحاق اس وقت کی واحد یونیورسٹی کلکتہ یونیورسٹی سے ہونے کے بعد وہ عصری تعلیم کا بھی اہم تعلیمی ادارہ بن گیا۔ عظیم مجاہد آزادی مولانا برکت اللہ بھوپالی مدرسہ سلیمانیہ کے ہی طالب علم تھے۔

عمارتیں بنوانے کا شوق

نواب شاہجہاں بیگم کو شہنشاہ شاہجہاں کی طرح ہی تعمیر کا شوق تھا۔ بھوپال کی تاریخ وتہذیب کے ماہر جناب محمد احمد سبزداری نے اپنے نہایت فاضلانہ اور تحقیقی

مقالے ''بھوپال کی کہانی ایک پرانے بھوپال کی زبانی'' میں نواب شاہجہاں بیگم کی یادگار تعمیرات میں لکھا ہے: ''یہ عجیب اتفاق ہے کہ شہر بھوپال قلعہ فتح گڑھ سے مشرق اور شمال مشرق رخ پر پھیلا، بیرون بدھ اوارہ پل پختہ، جہانگیر آباد برکھیڑی، مسلخ، ریلوے اسٹیشن ،منگل وارہ وغیرہ آباد ہوئے مگر خود قلعہ اور امالی دروازہ کے شمال کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ جب شاہجہاں بیگم رئیسہ ہوئیں تو وہ شوکت محل میں رہتی تھیں ، پھر انہوں نے شاہجہاں آباد (بھوپال کا مشہور محکمہ) آباد کیا۔ یہ محلّہ ایک باقاعدہ پلاننگ کے تحت بسایا گیا۔ اس میں مختلف محلات مثلاً تاج محل، عالی منزل، بے نظیر گلشن عالم، امیر گنج، قیصر گنج، مغل پورہ اور خواص پورہ کے محلے تعمیر ہوئے۔

1881ء میں نواب شاہجہاں بیگم اپنے تعمیر کردہ تاج محل پیلس میں منتقل ہوئیں۔ اس شاندار محل کی تیاری کا جشن منایا گیا جس میں غرباء کو کھانا کھلایا گیا اور خواص کو طعام کے بعد مرجانی اور مقیشی ہار اور سون چاندی کے ورقوں میں لپٹی ہوئی گلوریاں تقسیم کی گئیں۔ محل میں ایک مکان ساون بھادو کے نام سے بنایا گیا جس کے جشن میں خادموں اور خواصوں کو زعفرانی جوڑے دیئے گئے اور روساء کو رنگ سے بھرا ہوا ایک چاندی کا کٹورا، خاصدان اور ایک پچکاری سونے کی تھی۔ اندرون محل ایک مینا بازار اور اس کے ایک حصے میں پری بازار لگایا جہاں صرف خواتین کی دکانیں تھیں۔ تاج محل کے برابر پہلے سرکاری گنجی خانہ تھا، یہاں عیدگاہ کی پہاڑی کے پانی کو روک کر ایک تالاب بنایا گیا جس کو شاہجہانی یا شیریں تالاب سے موسوم کیا گیا لیکن بعد میں یہ موتیا تالاب کے نام سے مشہور ہوا۔ تاج محل کے بالکل قریب نواب شاہجہاں بیگم نے عظیم الشان مسجد (تاج المساجد) کا منصوبہ بنایا، اگر یہ مسجد ان کے منصوبے کے مطابق تیار ہوجاتی تو دنیا کی نامور مسجد ہوتی۔ یہ رقبے میں دہلی کی جامسجد سے بڑی ہے، اس کا فرش، منارے اور گنبد بلوریں ہوتے جو انہوں نے

زرکثیر صرف کر کے بلجیم سے منگوائے تھے۔لیکن علماء نے فتوی دیا کہ بلوریں فرش پر نماز جائز نہیں اس لئے سرخ پتھر لگائے گئے۔تاج المساجد کے دروازے کے بہت بلند رکھے گئے اور ایک طرف موتیا تالاب مسجد کا حوض معلوم ہوتا ہے۔اس پر پندرہ سولہ لاکھ روپیہ صرف کیا گیا مگر نواب صاحبہ کی زندگی میں اس کی تکمیل نہ ہوسکی اور کوئی 70 سال سے اوپر یہ کسمپرسی کے عالم میں پڑی رہی۔بالآخر سرزمین سے ایک مرد مجاہد محمد عمران ندوی اٹھا جس نے اپنا تن من دھن لگا کر، مصیبتیں، مشقتیں اور ریاضت جھیل کر اپنوں اور بیگانوں سے لاکھ کی رقمیں جمع کر کے شاہجہاں بیگم کے خواب کو شرمندۂ تعمیر کیا۔نواب صاحبہ نے تاج محل کے عقب میں پہاڑی پر عیدگاہ بنوائی جس میں خواتین کے لئے ایک علیحدہ حصہ تھا اور ایک طرف عیدالاضحیٰ پر اونٹ کی قربانی کی جگہ بنوائی''۔(محمد احمد سبزواری، بحوالہ تاریخ الکہ بھوپال از سید مہدی علی سہوانی، تاج الاقبال، اختر اقبال و دیگر مستند تالیفات)

سیکولر روایات قائم کیں

ریاست بھوپال کی شاندار سیکولر روایات قائم رہیں اور وہاں ہندو مسلمان میں کوئی تفریق نہیں کی گئی۔نواب شاہجہاں بیگم کے دور حکومت میں بھی ہندوؤں کو برابر کے مواقع حاصل تھے۔ریاستی امور میں کایستھوں کی خاص عزت افزائی جاری رہی۔سرکاری دفاتر پر انکا غیر معمولی اقتدار تھا۔خزانہ و محکمہ جات ان ہی کی نگرانی میں تھے۔اگرچہ ریاست کی زبان فارسی اور اس کے بعد اردو رہی لیکن ان کے پاس خاطر سے تمام حسابات ''کایستھانہ اصول'' سے مرتب کئے جاتے تھے۔ان کی نگرانی اور سمجھنے میں بعض اوقات دقیق پیش آتی تھیں اور اکثر شکایتیں بھی ہوتی تھیں لیکن علیا حضرت (نواب شاہجہاں بیگم) نے اسی طریقہ کو جاری رکھا۔اس زمانہ میں متعدد ہنود خاندان معزز برسر اقتدار تھے۔اور جنہیں بھوپال ہی کے حکمرانوں نے ترقی کے اعلیٰ

مدارج تک پہنچایا تھا۔نواب شاہجہاں بیگم نے ایک طرف انہیں نوازا تو دوسری تک ریاست کے بہت سے ہندو خاندانوں کو غربت سے نکال کر ان کی مناسب تربیت کی اور رفتہ رفتہ ترقی دے کر اراکین ریاست کی فہرست میں شامل کر دیا۔ایک راجہ خوشوقت رائے نواب سکندر بیگم کے اتالیق تھے لیکن انہیں کے ہم نام دوسرے خوشوقت رائے کو بھی عنایات شاہجہانی نے اعلیٰ مراتب پر پہنچا دیا۔اس وقت صیغۂ مال میں وزیر کے عہدے پر سرفراز کیا گیا۔نواب شاہجہاں بیگم کی ایماء پر ان کے بیٹے کنج منوہر لال کو نوابصدیق حسن خاں صاحب بہادر نے اپنی نگرانی اور تربیت میں لے لیا۔اس زمانہ میں انگریزی تعلیم کا رواج نہیں تھا۔سب سے مقدم فارسی اور اس کے بعد اردو کی تعلیم لازمی سمجھی جاتی تھی۔سنسکرت اور عربی ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی علوم مانے جاتے تھے۔انہی اصولوں کے ساتھ کنج منوہر لال کی تربیت کی گئی۔مذہبی تعلیمات کے بعد فارسی و اردو کی تعلیم نواب صاحب مغفور کی نگرانی میں ان زبانوں کے اہل کمال سے دلائی گئی۔اس کا کامیاب نتیجہ یہ ہوا کہ منشی کنج منوہر لال المتخلص نوش سنسکرت، فارسی اور اردو کے زبردست عالم تسلیم کئے گئے اور اپنی عالمانہ تصانیف کی وجہ سے اس عہد کے مصنفین کی صف اول میں انہیں جگہ دی گئی۔

شاہانہ نوازشات کی وجہ سے اس خاندان میں علم موروثی ہوگیا تھا اور اس کے ہر فرد کو علمی شعبوں میں معزز عہدے عطا کئے گئے تھے۔بھوپال کے صدر بازار ابراہیم پور میں لب شاہراہ ناظم خوشوقت رائے صاحب کا شاندار محل موجود ہے اور اپنیبانی کی شان وعظمت کی یادگار ہے۔ناظم صاحب کے خاندان کے لوگ اس پر قابض ہیں اور صاحب عزت ہیں۔اس عہد کے تربیت یافتہ افراد میں منشی سکھ چین کی تربیت بھی خاص توجہات کے ساتھ ہوئی تھی۔یہ صاحب کبھی ناظم کے عہدے پر فائز ہوئے''۔(مائل نقوی) نواب شاہجہاں بیگم کی تعلیم اردو، فارسی اور عربی میں باقاعدہ ہوئی

تھی۔ مطالعے اور شعر وسخن کا شوق اوائل عمر سے ہی تھا۔ وہ بعد میں قادر الکلام شاعرہ ثابت ہوئیں۔ شاعری میں وہ شیریں اور تاجور تخلص کرتی تھیں۔ ان کے دو دیوان ''تاج الکلام'' اور ''دیوان شیریں'' اور ایک مثنوی ''صدر البیان'' ان کی مطبوعہ یادگار ہیں۔ نواب شاہجہاں بیگم شریں کا یہ شعر بہت مشہور ہوا:

واہ واہ، کیا ہی نیا یہ آپ کا چالا ہوا
دل ہمارا لے لیا اک عمر کا پالا ہوا

قرآن کی اشاعت کا کارنامہ

چونکہ نواب شاہجہاں بیگم ایک بیدار مغز اور عالی ہمت حکمراں ہونے کیساتھ ساتھ بنفش نفیس ایک لائق ادیبہ، شاعرہ اور ایک پاکیزہ سیرت مسلمان تھیں۔ اسلئے ان کی سرپرستی میں اسلامی فقہ، تفاسیر، تاریخ، حکمت وفلسفہ جیسے علوم کی بڑی بڑی کتابیں انکے قائم کردہ مطبع شاہجہانی سے شائع ہوئیں۔ آج کے دور میں سعودی عرب اور بعض اسلامی ممالک کی سرکاروں کی طرف سے قرآن کریم کی طباعت واشاعت اور مفت تقسیم کا راوج ہے، لیکن تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل جب کسی ملک میں قرآنی اشاعت کا یہ طریق موجود نہیں تھا، نواب شاہجہاں بیگم کے مطبع شاہجہانی میں قرآن کریم کے لاکھوں نسخے چھپتے اور ملک بھر میں تقسیم کئے جاتے تھے۔ 1871ء میں نواب شاہجہاں بیگم نے بھوپال سے ایک ہفت روزہ اخبار بھی ''عمدۃ الاخبار'' کے نام سے جاری کرایا جس کے ایڈیٹر حکیم اصغر حسین تھے۔ نواب شاہجہاں بیگم کے 33 سالہ دور حکومت کی تاریخ شاہد ہے کہ اس غیر معمولی خاتون حکمراں نے زندگی کے ہر شعبے پر اپنے لافانی نقوش ثبت کئے، حکومت برطانیہ کی جانب سے جی سی ایس آئی، قیصر ہند اور کراؤن آف انڈیا کے اعزازات سے سرفراز ملک وبیرون ملک مقبول ومحترم خاتون 19 جون 1901ء کو جہانِ فانی سے رخصت ہوگئی۔ ☆☆☆

شہزادی زیب النساء بیگم[۳]

اورنگ زیب عالمگیر کی بیگم ولرس بانو اس عہد کے ایک معروف عالم وفاضل شخص شاہنواز خاں صفولی کی دختر تھی۔ یہ خاتون حسن وجمال میں بے نظیر اور فصاحت وبلاغت، غریب نوازی اور نیکوکاری کے لیے مشہور تھی ولرس بانو اپنی غیر معمولی خوبیوں کی وجہ سے اورنگ زیب کی شریک حیات بنی تھی۔ ہندوستانی تاریخ کی عظیم خاتون شہزادی زیب النساء ولرس بانو بیگم کے بطن سے 1639ء میں پیدا ہوئی۔ زیب النساء اورنگ زیب کی پہلی اولاد تھی۔ اورنگ زیب کے پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں جن میں شہزادہ محمد اکبر، شہزادہ محمد اعظم اور شہزادہ کام بخش دوسری بیگمات سے تھے۔ زیب النساء کے علاوہ زبدۃ النساء، زینت النساء، بدر النساء اور مہر النساء زیب النساء کی چھوٹی بہنیں تھیں، لیکن زیب النساء اپنی خوبصورتی اور غیر معمولی ذہنیت کی وجہ سے اپنی ماں ولرس بانو بیگم اور والدہ اورنگ زیب کی بیحد چہیتی تھی، شہزادی زیب النساء کو مورخین نے عالمگیر کی اولاد میں سب سے زیادہ خوبیوں کی مالک اور خاندانِ تیموریہ کے گلِ سرسبد قرار دیا ہے۔ درحقیقت زیب النساء ایک غیر معمولی خاتون تھی جسے اپنے علم وفضل اور خداداد ذہانت کے باعث خاندانِ تیموریہ کی ایک سے بڑھ کر

۳ فاروق ارگلی کے مضمون سے اقتباسات لئے گئے۔ راشٹریہ سہارا 6 اپریل 2011 بدھ

ایک خوبیوں والی خواتین میں امتیازی حیثیت حاصل ہوئی۔ چونکہ اورنگ زیب عالمگیر زیب النساء سے بیحد محبت کرتا تھا اس لئے اس کی ذہانت وحصول علم کا شوق دیکھ کر اس کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ دی۔

زیب النساء حافظہ قرآن

دستور کے مطابق زیب النساء کو سب سے پہلے قرآن کریم کی تعلیم دلائی گئی، ایک درباری امیر کی والدہ مریم بنت عنایت اللہ کو شہزادی کی اتالیق مقرر کیا گیا جو شہر کی مشہور عالمہ اور حافظ قرآن خاتون تھیں۔ انہوں نے بڑی محبت اور اپنائیت سے شہزادی کو تعلیم دینی شروع کی۔ عربی، فارسی اور فقہ اسلامی کی ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ شہزادی نے صرف 12 سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کر لیا بیٹی کے ختم قرآن کی خوشی میں اورنگ زیب نے شاندار جشن کیا، شہزادی کی اتالیق حافظ مریم کو بہت بڑی رقم نذر کی، مآثر الامراء کے مؤلف کے مطابق شہزادی زیب النساء کو کلام پاک حفظ کر لینے کی سعادت کے صلہ میں تیس ہزار اشرفیاں انعام میں دیں، اس کے ساتھ ہی اورنگ زیب نے اپنی لائق بیٹی کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ایران کے ایک بڑے عالم، دانشور اور شاعر ملا محمد سعید اشرف مازندرانی کا انتخاب کیا، جن سے زیب النساء نے عربی فارسی لسانیات اور ادبیات کے علاوہ فقہ، اصولِ فقہ اور علم حدیث کی تعلیم حاصل کی، ملا محمد سعید اشرف اپنے وقت کے بہترین خطاط بھی تھے اس لیے علوم متداولہ کہ ساتھ ساتھ شہزادی نے فن خطاطی میں بھی کمال حاصل کر لیا، مآثر عالمگیری، کے حوالے سے بزم تیموریہ، میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں کہ شہزادی ہر قسم کے خطوط یعنی نسخ نستعلیق اردو شکستہ میں نہایت خوبی سے تحریر کرتی تھیں، اس نے یہ فن ملا سعید اشرف سے سیکھا تھا۔

شہزادی زیب النساء کو شعر وسخن کا شوق

شہزادی زیب النساء کو شعر وسخن کا شوق بہت چھوٹی عمر سے ہی ہو گیا تھا لیکن وہ اپنے اس شغل کو مخفی رکھنا چاہتی تھی اس لئے تخلص بھی مخفی اختیار کیا، اس کو دیکھتے ہوئے ملا سعید اشرف نے اسکے ذوق شعری کو خوب چمکا دیا۔ شروع میں تو ملا اشرف کو اسکے کلام پر اصلاح دینی پڑی لیکن بہت کم مدت میں وہ ایک فارغ الاصلاح اور قادر الکلام شاعرہ بن گئی، وقت کے ساتھ ساتھ اس کے کلام میں پختگی پیدا ہو گئی لیکن اسکی شاعرانہ خوبیوں کا اس دور میں زیادہ شہرہ نہیں ہوا۔ زیب النساء کو اپنے ذوق شعری کو مخفی رکھنے کی ایک اہم وجہ اس کے والد اورنگ زیب کی سخت مزاجی بھی تھی، جس نے 1659ء میں اپنے بھائیوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد مکمل اقتدار حاصل کیا اور اس کیساتھ ہی اس نے اعلان کر دیا کہ اس کی سلطنت میں غیر اسلامی رسوم واعمال کی کوئی جگہ نہیں ہوگی اور اسلامی قوانین وتعلیمات پر سختی سے عمل کیا جائے گا۔ موسیقی، کھیل تماشے اور لہو ولعب پر عالمگیر نے سخت ترین پابندیاں عائد کر دیں، ظاہر ہے کہ شہزادی کیلئے اپنے شعر وسخن کے شوق کو اس وقت نمایاں نہ ہونے دینا مصلحتاً درست تھا۔

وہ متعصب نہیں ہندو نواز تھے

زیب النساء جلیل القدر شہزادی تھی، اس کے محل میں بہت سی کنیزیں تھیں جو اس کی خدمت پر مامور تھیں۔ وہ اپنی خادماؤں سے بہنوں اور سہیلیوں کی طرح پیش آتی تھی۔ ایک کنیز شہزادی کے بیحد قریب ہو گئی تھی کیونکہ وہ ایک اچھی شاعرہ تھی۔ ایک دن اس کنیز سے چین کا بنا ہوا قیمتی آئینہ ٹوٹ گیا۔ شاعرہ کنیز نے ڈرتے ڈرتے شہزادی سے عرض کیا:

''از قضا آئینۂ چینی شکست'' اس جملے کش شعریت نے زیب النساء کی سخن سنجی کو مہمیز کیا، وہ مسکرائی اور برجستہ جواب دیا: ''خوب شد اسباب خود بینی شکست''

شہنشاہ اورنگ زیب پر مسلم دشمن مورخین نے بہت سے الزامات عائد کئے ہیں، جیسے کہ وہ انتہائی متعصب، تنگ نظر اور کٹر مسلمان ہونے کی وجہ سے ہندوؤں کا جانی دشمن تھا، مندر توڑتا تھا اور ہندوؤں کو جبراً اسلام قبول کرنے پر مجبور کرتا تھا، لیکن ان الزامات کی تردید تو ہندوستان کے بہت سے قدیم مندروں کو عہد عالمگیری میں عطا کی گئی جاگیروں کے فرامین اور دستاویزات سے ہوتی ہے جو آج بھی ان مندروں میں موجود ہیں، اگر اورنگ زیب ہندو دشمن ہوتا تو اس کا سب سے قابل اعتماد سپہ سالار ایک ہندو راجہ جے سنگھ کیسے ہوسکتا تھا، اورنگ زیب راجہ جے سنگھ کے مقابلے میں اپنے مسلمان سرداروں، امراء یہاں تک کہ کسی رشتہ دار پر بھی اعتماد نہیں کرتا تھا۔

راجہ جسونت سنگھ اورنگ زیب کے جان نثاروں میں

راجہ جسونت سنگھ اورنگ زیب کا دشمن تھا لیکن بعد میں وہ اورنگ زیب کے جاں نثاروں میں شامل ہوگیا، اورنگ زیب نے جب کابل پر حملہ کیا تو فوج کی کمان راجہ جسونت سنگھ کے ہی ہاتھ میں تھی، اورنگ زیب کی حکومت میں جودھپور، اودے پور، کوچ بہار اور دوسری بہت سی ہندو ریاستیں اپنے داخلی معاملات میں بالکل آزاد تھیں، لیکن بیجاپور اور گولکنڈہ کی اسلامی حکومتیں بزور طاقت مغلیہ حکومت میں شامل کرلی گئی تھیں۔ متعصب اور کینہ پرور تاریخ داں نے اسے نہایت متعصب مسلمان بادشاہ قرار دیا ہے، لیکن ایسا ہرگز نہیں تھا، اورنگ زیب عالمگیر ایک پابند شرع مسلمان ضرور تھا اور اپنی حکومت کو اسلامی قوانین اور احکامِ شریعت کے مطابق فروغ دینا چاہتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی مذہبی رواداری اور فراخ دلی کی انتہا یہ تھی کہ ایک پابند

شرع مسلمان ہونے کے باوجود اس نے اپنے بیٹے شہزادہ معظم کی شادی بڑی دھوم دھام کے ساتھ راجہ روپ سنگھ کی بیٹی سے کی۔ خود اس کی بیگمات میں اودے پور کی راجکماری بھی تھی جسے تبدیلی مذہب کے لئے اورنگ زیب نے کبھی مجبور نہیں کیا اور نہ اس کے مذہبی معاملوں میں کبھی مداخلت کی۔ اس ہندو رانی کے بطن سے پیدا ہونے والے شہزادہ کام بخش سے اسے سب بیٹوں سے زیادہ محبت تھی، اسلام مخالف مورخین کی اس علمی بدکاری پر دنیا کے ہر صاحب شعور انسان کو حیرت ہے کہ اورنگ زیب پر ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے کا مجرم قرار دیا لیکن ہندوؤں کو مسلمان بنانا تو ایک طرف اس نے اپنی حکومت کی طرف سے تبلیغ دین اور اسلام کی اشاعت کا کوئی شعبہ تک قائم نہیں کیا جس کے ذریعہ وعظ و پند کے ذریعہ لاکھوں ہندوؤں کو اسلام قبول کرنے کی تلقین کی جاسکتی تھی، جس طرح عیسائی حکومتوں نے باقاعدہ مسیحیت کے فروغ کے لیے مشن قائم کیے جو آج بھی جاری ہیں۔ یہ حقائق ان تمام مغربی اور تنگ نظر ہندو مورخین کی افترا پردازی کا دنداں شکن جواب ہیں، اورنگ زیب پر ہندو مندروں کو تباہ کرنے کا الزام بھی صریحاً غلط ہے، دراصل اس نے صرف انہیں مذہبی مقامات پر تاخت کی جو اس کی حکومت کے خلاف سازشوں کے اڈے تھے اور یہ قطعی سیاسی طریق کار تھا۔ (مکمل تاریخ ہند)

شہزادی زینب النساء کی شادی

یہ حقائق درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر آگئے جبکہ یہاں تذکرہ اورنگ زیب کی بیٹی شہزادی زیب النساء کا مقصود ہے، مغربی مورخین نے اورنگ زیب پر ایک الزام یہ بھی عائد کیا کہ زیب النساء کو شادی نہیں کرنے دی گئی کیونکہ مغل سلاطین شہزادیوں کی شادیاں بہت کم کرتے تھے جبکہ یہ سچائی تاریخ کے صفحات سے روشن ہے

کہ زیب النساء کی نسبت خود اورنگ زیب نے اپنے مقتول بھائی داراشکوہ کے فرزند سلیمان شکوہ سے طے کردی تھی لیکن شادی سے پہلے شہزادہ سلیمان شکوہ اچانک بیمار ہوکر دنیا سے رخصت ہوگیا، اس حادثے کا زیب النساء کے دل و دماغ پر ایسا اثر پڑا کہ اس نے کبھی شادی نہ کرنے کا عہد کرلیا اور تمام عمر غیر شادی شدہ رہی۔ بعض معتبر تذکروں کے مطابق زیب النساء بیگم اپنے جیسے ہم مذاق اور قابل شخص کو شریک حیات بنانا چاہتی تھی، والد کی طرف سے اس کو شادی کے لئے مکمل آزادی تھی، بزم تیموریہ'' کے حوالے سے ''مغل شہزادیاں'' کے مؤلف محمود علی لکھتے ہیں: ''زیب النساء کی عمر جب 25 سال کی ہوگئی تو بیگمات نے عالمگیر سے کہا کہ شہزادی سیانی ہوگئی ہے، اس کی شادی کر دیجیے تو عالمگیر نے جواب دیا: ہم اپنی نور چشمی کی طینت وطبیعت سے خوب واقف ہیں، وہ کمزور طبیعت کی لڑکی نہیں ہے، ہمیں اس کی بدراہ ہوں کا خیال بھی نہیں آسکتا۔ ہم اسے شادی کے لئے مجبور نہیں کر سکتے''

زیب النساء بیگم نے شادی نہیں کی

بیگمات نے جب زیب النساء بیگم کو شادی کے لیے مجبور کرنا شروع کیا تو اس نے جواب دیا: ''لوگ مجھ سے نہیں میری خوبصورتی یا شہزادی ہونے سے شادی کرنا چاہتے ہیں، میں ایسے شخص سے شادی کرنا چاہتی ہوں جو محض زیب النساء سے شادی کرنا چاہتا ہے۔'' زیب النساء کی بات سن کر بیگمات لا جواب ہوگئیں۔ شادی نہ کرنے کا عہد کرنے کے بعد شہزادی نے اپنی پوری توجہ علوم وفنون کے مطالعے، شعر و سخن اور علم و دانش کی جانب مرکوز کردی۔ علماء وفضلاء کی وہ نہایت قدر دان تھی۔ شہنشاہ اورنگ زیب نے اس کے علمی ذوق وشوق کو دیکھتے ہوئے بہت بڑا کتب خانہ شاہی محل میں قائم کرادیا، جس میں ہزاروں کتابیں جمع تھیں، مآثر عالمگیری، کے

مطابق شہزادی کے کتب خانے میں کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع تھا جو اس سے قبل کبھی دیکھا نہیں گیا تھا، اس نے اپنے بیت العلوم کے علماء وفضلاء کے استفادہ کے لئے اعلی درجہ کا کتب خانہ قائم کیا، ہنر پرور اور علم شناس شہزادی ہمیشہ کتابوں کو جمع کرنے اور تصنیف وتالیف کو جاری رکھنے میں کوشاں رہتی تھی۔ اس کا کتب خانہ ہر حیثیت سے نادر الوجود تھا۔ علامہ شبلی نعمانی کے بقول زیب النساء کا دربار حقیقت میں ایک اکادمی تھا جہاں ہر فن کے علماء وفضلاء نوکر تھے جو ہمیشہ تصنیف وتالیف میں مصروف رہتے تھے، کتابیں عموماً شہزادی کے نام سے موسوم ہوتی تھیں یعنی ان کتابوں کے نام کا پہلا حصہ ''زیب'' ہوتا تھا۔ مآثر عالمگیری' کے مولف کا بیان ہے کہ جب ملا صفی الدین اردبیلی نے شہزادی کے حکم سے تفسیر کبیر کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا تو اس کا نام زیب التفاسیر رکھا گیا۔ تفسیر کبیر علامہ فخر الدین رازی، کا لافانی کارنامہ ہے جو شہزادی زیب النساء کی سرپرستی اور دلچسپی سے پہلی بار فارسی میں منتقل ہوا، زیب النساء کے اس مرکز علم ودانش سے بہت سی دوسری کتابیں فارسی زبان میں ترجمہ کی گئیں۔

شہزادی غریب پرور تھیں

شہزادی زیب النساء شاہی محل کے قریب واقع باغ میں ہر روز صبح وشام کو سیر کیلئے جایا کرتی تھی۔ عالمگیر کی جانب سے بیٹی کو اس کی اجازت حاصل تھی کیونکہ اس وقت جب شہزادی باغ میں ہوتی تو شہر کی بہت سی ضرورت مند خواتین اسکے حضور میں اپنی عرضداشتیں پیش کرتیں، شہزادی انکے دکھ درد کو سنتی اور فوری انکی امداد کی جاتی تھی۔ شہزادی کو غریبوں محتاجوں، مظلوموں اور یتیموں کی مدد کرنے میں بہت لطف آتا تھا، اس نے سینکڑوں بے سہارا لڑکیوں کے شادیاں کرائیں، شہزادی کی جانب سے غریبوں اور یتیموں کیلئے وظائف مقرر تھے، زیب النساء کی اہل علم کی قدردانی کی اس

قدر شہرت تھی کہ ایران، توران، عرب اور ترکستان وغیرہ ممالک کے علماء وفضلاء ہندوستان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ مولانا آزاد بلگرامی نے اپنی تحقیقی کتاب ید بیضا، میں لکھا ہے'' زیب النساء نے اپنی اہمیت کو اربابِ فضل وکمال کی ترقی کی ترقی میں صرف کردیا۔ شاعروں، منشیوں اور خوشنویسوں کی ایک بڑی جماعت اس کی قدردانی کے سائے میں پرورش پاکر آسودگی سے زندگی بسر کرتی تھی، اپنے عہد کی اس عظیم شاعرہ کے کلام کیساتھ ایک حادثہ وابستہ ہے اور وہ یہ کہ اسکی سالہا سال کی ریاضت ایک بیاض میں درج تھی جو اسکی ارادت فہم نامی ایک کنیز کے ہاتھ سے پھسل کر حوض میں گر کر ضائع ہوگئی، محققین کے مطابق زیب النساء کا جو مجموعہ کلام، دیوانِ مخفی، کے نام سے بازاروں میں دستیاب ہے وہ دراصل ایک شاعر مخفی رشتی کا ہے جو شاہجہاں کے زمانہ میں تلاشِ معاش کیلئے خراسان سے ہندوستان آیا تھا لیکن یہاں اسکی تقدیر نے دھوکا دیا اور وہ مخالفین کی سازش کا شکار ہوکر قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ چونکہ دربارِ شاہی تک اسکی رسائی نہ ہوسکی اس لیے اس کا کلام ہندوستان میں مشہور نہیں ہوسکا، اس کا دیوان غیر ذمہ دار محققوں کے ہاتھ لگ گیا تو دیکھے اور سمجھے بغیر مخفی تخلص کی بنیاد پر شہزادی سے منسوب کردیا، فارسی ادبیات میں درک رکھنے والے اس بات سے آگاہ ہیں کہ اس متنازع دیوانِ مخفی کے علاوہ بھی ایسے بہت سے معیاری اشعار کا تذکرہ ملتا ہے جو شہزادی زیب النساء سے منسوب ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی نے بعض تذکروں کے اسناد پر صرف مندرجہ ذیل رباعی کو زیب النساء کی تخلیق قرار دیا ہے۔

بشکند دستے کہ خم درگردنِ یارے نشد
کور بہ چشمے کہ لذت گیر دیدارے نشد
صد بہار آخر شد و ہر گل بہ فرقے جا گرفت
غنچۂ باغِ دلِ مازیبِ دستارے نشد

شہزادی اپنے چھوٹے بھائی سے بہت محبت کرتی تھی

شہزادی زیب النساء کو اپنے سگے چھوٹے بھائی شہزادہ محمد اکبر سے بہت محبت تھی۔ محمد اکبر بڑا بہادر اور نیک دل شہزادہ تھا لیکن وہ مارواڑ کے راجپوتوں کے بہکاوے میں آکر اپنے باپ سے بغاوت کر بیٹھا تھا، واقعہ یہ تھا کہ مارواڑ کے والی راجہ جسونت سنگھ سے قلبی دوستی رکھتا تھا، اس لئے اس نے اس کے دو یتیم بیٹوں کو دہلی میں رکھ کر ان کی شاہانہ پرورش کا انتظام کردیا، اس پر یہ افواہ پھیلادی گئی کہ بادشاہ نے جسونت سنگھ کے بیٹوں کو مسلمان بنالیا ہے، مارواڑ میں یہ افواہ بغاوت کا بہانہ بن گئی۔ بادشاہ نے شہزادہ محمد اکبر کی قیادت میں شاہی لشکر مارواڑ بھیجا تاکہ باغیوں کی سرکوبی کی جاسکے، باغی راجپوتوں نے زبردست شاہی فوج کا مقابلہ کرنے کے بجائے سادہ لوح شہزادے کو یہ کہہ کر اپنے ساتھ ملالیا کہ اگر دلی پر قبضہ کرنے میں وہ ان کا ساتھ دے تو تمام راجپوت اسے اپنا بادشاہ تسلیم کرلیں گے۔

تخت وتاج کے لالچ میں ناعاقبت اندیش شہزادہ پوری طرح اپنے باپ کا دشمن ہوگیا، راجپوتوں کی بہت بڑی فوج اس کیساتھ تھی، کئی زبردست لڑائیاں ہوئیں لیکن آخر کار شاہی افواج کو باغی راجپوتوں پر فتح حاصل ہوئی، شہزادہ محمد اکبر جان بچا کر پہلے مرہٹہ سردار سنبھاجی کی پناہ میں پہنچا لیکن مرہٹے بھی اورنگ زیب کے حملوں کی تاب نہ لاسکے تو شہزادہ ایران بھاگ گیا وہاں اس نے ہندوستان پر حملہ کرنے کیلئے مدد مانگی جو اسے نہیں مل سکی البتہ شاہ ایان کی مہربانی سے اسے خراسان میں رہ کر زندگی گزرانے کی سہولت مل گئی۔ اورنگ زیب نے اسے کبھی معاف نہیں کیا اور نہ ہی باغی شہزادے نے اپنے جلیل القدر باپ کے آگے سر جھکایا، اس کا انتقال اورنگ زیب کے زمانۂ حیات میں ہی خراسان میں ہوا۔

شہزادی حافظہ قرآن تھیں

شہزادی زیب النساء اپنے بھائی باغی شہزادہ محمد اکبر کے ساتھ خط و کتابت کے جرم میں معتوب ہوئی اور ایک مدت تک اسے قلعہ سلیم گڑھ میں نظر بند رہنا پڑا تھا بعد میں اورنگ زیب نے بیٹی کی سزا معاف کر دی تھی۔ شہزادی زیب النساء حافظۂ قرآن، پابند شریعت اور عبادت گزار خاتون تھی۔ وہ شہزادیوں کی طرح رنگین ریشمی ملبوسات زیورات اور آرائش و زیبائش سے پرہیز کرتی تھی، وہ سفید سوتی ملبوس پسند کرتی تھی لیکن محل کی کنیزوں اور دوسری عورتوں کو بناؤ سنگھار کے لیے کبھی منع نہیں کرتی تھی، اس کا زیادہ تر وقت لکھنے پڑھنے میں ہی گزرتا تھا، بادشاہ اس سے اہم ملکی امور پر مشورہ بھی کرتا تھا۔ اکثر اسفار میں وہ بادشاہ کے ہمراہ بھی جاتی تھی۔

شہزادی کا نام عشق و محبت کی داستان ہیں

شہزادی زیب النساء بیگم کی تمام اعلیٰ خصوصیات سے بڑھ کر اس کا نام عشق و محبت کی ایک داستان کے لئے مشہور ہے جس کے مطابق شہزادی کو لاہور کے نوجوان بہادر اور خوبصورت حاکم عاقل خاں سے محبت ہوگئی تھی، عاقل خاں چھپ چھپ کر اس سے ملنے محل میں آیا کرتا تھا، ایک دن جب دونوں محل کے ایک گوشے میں محوِ راز و نیاز تھے، اس کی خبر بادشاہ اورنگ زیب کو ہوگئی۔ قصے کے مطابق بادشاہ کے خوف سے عاقل خاں ایک بڑی سی دیگ میں چھپ گیا، بادشاہ کے استفسار پر شہزادی نے وہاں کسی غیر مرد کی موجودگی سے انکار کیا، محل کی تلاشی لی گئی وہاں کوئی نہ ملا لیکن بادشاہ کی تیز نظروں نے اصل معاملہ بھانپ لیا، حکم ہوا کہ دیگ کے نیچے آگ روشن کی جائے، عاقل خاں نے ایک عاشق صادق کی طرح یہ شعر پڑھا:

بعد مردن از جفائے تو اگر یاد کنم
از کفن دست بروں آرم و فریاد کنم

اور جل کر خاک ہوگیا۔ یہ قصہ بھی شہزداہ سلیم اور انارکلی کے قصے کی طرح بہت مشہور ہوا، شہرت پسند قلمکاروں نے امتیاز علی تاج کی طرح اس پر افسانے اور ڈرامے لکھے یہاں تک کہ عاقل خاں اور زیب النساء کی داستان عشق کو حقیقی واقعہ سمجھا جانے لگا لیکن تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ قصہ بالکل بے بنیاد اور من گھڑنت معلوم ہوتا ہے، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ شہزادی کا محل گویا کوئی اتنا بڑا باورچی خانہ تھا جہاں ایسی دیگ موجود تھی جس میں آدمی چھپ سکے، پھر یہ کہ عالمگیر جیسے جلیل القدر بادشاہ کو آگ جلانے کا ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی وہ اسے باہر نکلوا کر جلاد کے حوالے کر دیتا اور نہ صرف عاقل خاں بلکہ شاہی عزت و ناموس کو خاک میں ملانے والی اپنی بیٹی کو بھی قتل کر دیتا۔ قصہ گھڑنے والوں نے داستان میں رنگ بھرنے کیلئے عاقل خاں کا مرتے وقت یہ واقعہ تو جوڑ دیا۔ لیکن ان لوگوں نے یہ نہیں سوچا کہ جب اس قصے کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا تو ایک کم فہم بھی سمجھ لے گا کہ دیگ کے اندر اُبلتے ہوئے عاشق کی آواز کس نے سنی تھی؟ اتنی بڑی بے عزتی کے باوجود اورنگ زیب جیسے جلالی شہنشاہ نے بیٹی کو کیسے چھوڑ دیا؟ جس بادشاہ نے اپنے باپ اور بھائیوں پر رحم نہیں کیا، صوفی سرمد کو شریعت کو پابندی نہ کرنے پر قتل کرا دیا، اپنے بیٹے کو تا زندگی معاف کیا نہ اس کا منہ دیکھا، اس بیٹی کو جسے بھائی کو خط لکھنے کے جرم میں نظر بند رہنے کی سزا دی تھی، اسکا غیر مرد سے ناجائز تعلق ثابت ہوجانے کے باوجود وہ کس طرح زندہ رہ گئی؟

شہزادی کا انتقال

شہزادی کا انتقال دہلی میں 1701ء میں بیماری سے ہوا، شہزادی کی وصیت کے مطابق اسے لاہور لے جا کر اس باغ میں دفن کیا گیا جو

شہزادی نے بڑے شوق سے تیار کرایا تھا، کہتے ہیں کہ اپنے مزار کے کتبے کے لئے یہ شعر زیب النساء نے ہی کہا تھا:

برمزارِ ماغریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

علامہ شبلی نعمانی کے مطابق چونکہ عاقل خاں ایک شاعر بھی تھا اس لیے اس کا ذکر خاص طور پر مآثر الامراء میں موجود ہے، اس کے علاوہ عالمگیر نامہ، تذکرۂ سرخوش، خزانۂ عامرہ، یدِ بیضا، سروِ آزاد جیسے معتبر تذکروں میں بھی عاقل خاں حاکم لاہور کے انتقال کا ذکر ہے، جو لاہور میں ۱۱۰۷ھ میں ہوئی ان حقائق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ زیب النساء سے منسوب یہ داستانِ عشق بالکل لغو اور بے بنیاد ہے اور غالباً اورنگ زیب عالمگیر اور اس کے خانوادے کو بدنام کرنے کے لیے مخالفین کی پھیلائی ہوئی افواہوں پر مبنی ہے۔

☆☆☆

شہزادی جہاں آرا بیگم [؎]

سلاطین مغلیہ کے دوسو سالہ دوراقتدار میں کئی خواتین ایسی گزری ہیں جنہوں نے اپنی خصوصیات کے باعث تاریخ ہند میں نمایاں مقام حاصل کیا لیکن خاندان تیموریہ کی معروف خواتین شہزادی جہاں آرا بیگم کا نام نامی سب سے ممتاز قرار دیا جا سکتا ہے۔ شہنشاہ شاہجہاں اور بیگم ممتاز محل کی بیٹی جہاں آرا اپنے عہد کی نہایت دانشمند، مدبر اور صاحب علم خاتون تھی جس کے بارے میں عہد شاہجہانی کے ایک انگریز مورخ کا بیان ہے کہ ''جہاں آرا بیگم ایک ایسی خاتون تھی جس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں کہ اگر اسے ساری دنیا کی حکمراں بنا دیا جاتا تو وہ ایک کامیاب ترین بادشاہ کی طرح حکومت کر سکتی تھی''۔

یہ حقیقت ہے کہ شاہانِ مغلیہ میں شاہجہاں سب سے بلند اقبال شہنشاہ تھا۔ شاہجہاں کو جو شان، شکوہ اور عظمت حاصل ہوئی وہ کسی اور بادشاہ کو حاصل نہیں ہوئی۔ شاہجہاں کے دورِ حکومت کی سنہری تاریخ اور اس کی بنائی ہوئی عجوبۂ روزگار عمارتیں، جامع مسجد، لال قلعہ، تاج محل اور دوسری عمارات آج بھی عظمت شاہجہانی کی گواہی دے رہی ہیں۔ یہ جلیل القدر بادشاہ سیاست، شجاعت اور امور جہانبانی میں بے مثال

؎ جادوناتھ سرکار، بحوالہ ''مغل شہزادیاں'' از محمود علی

ہونے کے ساتھ ساتھ علم وفضل میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔اس کے عہد میں علوم وفنون کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ بادشاہ نے اپنی اولاد کو بھی اس دور کی اعلیٰ تعلیم وتربیت سے آراستہ کیا تھا، خاص طور پر اپنی بیٹیوں جہاں آرا اور روشن آرا کو جو خاندانِ مغلیہ کی خواتین میں نمایاں حیثیت کی حامل ہوئیں۔ ان شہزادیوں کی ماں شاہجہاں کی محبوب بیگم ارجمند بانو یعنی ممتازمحل بھی زیورتعلیم سے آراستہ نہایت عاقلہ اور صاحب بصیرت خاتون تھی۔ جہاں آرا اسے پہلے شاہجہاں اور ممتازمحل کی ایک خوبصورت بیٹی حورالنساء پیدا ہوئی تھی۔حورالنساء کا بہت چھوٹی عمر میں انتقال ہوگیا جس کا شاہجہاں اور ممتازمحل کو بہت صدمہ ہوا۔اپریل 1614ء میں جہاں آرا پیدا ہوئی جو مرحوم بچی سے بھی زیادہ خوبصورت تھی اور جسے پاکر ماں باپ کے صدمے کا ازالہ بڑی حد تک ہوگیا۔شاہجہاں جہاں آرا سے بہت محبت کرتا تھا۔قدرت نے اس خوش قسمت شہزادی کو ذہن رسا اور عقل ودانش کی دولت سے بھی خوب نوازا تھا۔شاہجہاں نے اپنی اس ہونہار بیٹی کی تعلیم وتربیت کے لئے ایک ایسی خاتون کا انتخاب کیا جو اپنے دور کی عظیم عالمہ تھی۔اس کا نام ستی النساء بیگم تھا۔

قرآن کی حافظہ اور قاریہ بھی تھیں

یہ معزز خاتون ملک الشعراء طالب آملی کی بہن اور حکیم رکنا کاشی کے بھائی نصیرائی کاشی کی اہلیہ تھی۔ستی النسا بیگم حافظ قرآن تھی اور تجوید وقرأت ،لسانیات، ادب،علم ،موسیقی اور علم طب وحکمت میں بھی غیر معمولی دسترس رکھتی تھی۔شاہجہاں اور ممتازمحل اسکے علم وفضل کے بیحد قدردان تھے۔ستی النساء بیگم ممتازمحل کی مہردار بھی تھی۔ یہ منصب موجودہ دور کے معتمدترین پرائیوٹ سیکریٹری جیسا تھا۔ممتازمحل کے انتقال کے بعد ستی النساء بیگم شاہی محل کی نگہدار رہی۔شاہجہاں کے دل میں اس لائق

خاتون کی کس قدر عزت تھی اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے کہ ستی النساء بیگم کو اپنے بھائی طالب آملی کی دختر سے بہت لگاؤ تھا۔اچانک اس بچی کا انتقال ہوگیا،ستی النساء بیگم کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ وہ بھی دنیا سے رخصت ہوگئی۔شاہجہاں کو اس کی وفات کا بیحد ملال ہوا،اس نے تاج محل کے نواح میں اس کا مقبرہ تعمیر کرایا۔

شہزادی جہاں آرا بیگم نے ستی النساء بیگم سے عربی، فارسی، تجوید وقرأت، ادبیات اور مروجہ علوم کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔صرف 26 سال کی عمر میں شہزادی جہاں آرا نے اپنی مشہور عام کتاب 'مونس الارواح' لکھی جس میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور ان کے اکابر خلفاء مثلاً خواجہ حمیدالدین ناگوری، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت خواجہ فرید گنج شکرؒ، حضرت خواجہ معین الدین نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت خواجہ نصیرالدین روشن چراغ دہلویؒ کے حالات بیحد عقیدت مندانہ اسلوب میں تحریر کئے ہیں۔اس گرانقدر کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شہزادی روشن آرا بیگم ایک دین دار اور صوفی مزاج خاتون تھی۔کتاب کی تالیف میں شہزادی نے احتیاط اور لحاظ کو پوری طرح ملحوظ رکھا۔دیباچے میں جہاں آنے لکھا ہے۔

خواجہ اجمیری کے لئے عقیدت مندانہ اشعار

''ان مقدس بزرگوں کے حالات،ان کے درباروں کے مقربین کی کتابوں اور رسائل سے بہ احتیاط تمام جمع کئے ہیں۔کئی سال کی کاوش سے تحریر کردہ اس کتاب سے یہ ناچیز مولفہ یہ امید رکھتی ہے کہ قارئین اس سے فیض حاصل کریں گے، جو میری کاوش کا صلہ ہوگا۔ جہاں آرا قادرالکلام شاعرہ بھی تھیں۔اس کے بہت سے اشعار تذکروں میں ملتے ہیں ایک مثنوی بھی اس کے نام سے منسوب ہے۔'مونس الارواح' میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ذکر کا آغاز اس نے ان خوبصورت مدحیہ اشعار سے کیا ہے:

آں شہنشاہ جہان معرفت
ذات او بیروں ز ادراک وصفت
خسروِ ملک فنا بے تخت وتاج
از خود بحرو از غیر خود بے احتیاج
غرق بحرِ عشق ازصدق وصفا
از خودی بیگانہ، باحق آشنا
آں معین دین وملت بے نظیر
فارغ از دنیا بہ ملکِ دیں امیر

شہزادی خواجہ اجمیری کے دربار میں

شہزادی جہاں آرا بیگم جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار مبارک کی زیارت کیلئے اجمیر شریف حاضر ہوئی تو اس نے حضرت غریب نوازؒ سے اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار ایک تحریر میں کیا جو 'مونس الارواح' کے ضمیمہ میں شامل ہے۔ جہاں آرا کی اس عظیم کتاب کا قلمی نسخہ کتب خانہ دارالمصنفین میں موجود ہے۔ جسے شہزادی نے دربارِ شاہجہانی کے مشہور خوش نویس عاقل خان سے لکھوایا تھا۔ یہ پوری کتاب طلائی نقش ونگار سے مزین ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے یہ نادر نسخہ خاصی بڑی رقم دے کر حاصل کیا تھا۔ علامہ اس کتاب کو بیحد عزیز رکھتے تھے۔ 1911ء میں یہ نسخہ فن خطاطی کے شاندار نمونے کے طور پر پیرس کی نمائش میں بھیجا گیا تھا۔ 'مونس الارواح' کا اردو ترجمہ عرصہ ہوا شائع ہو چکا تھا۔ 1931ء میں ایک انگریز مصنفہ اینڈریو بٹرسن نے "Moghal Princess Jahan Ara" کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی تھی، جس کے پیش لفظ میں اس نے لکھا ہے:

''میں جس وقت آگرہ کے قلعہ کو دیکھنے میں مصروف تھی، وہاں ثمن برج کے ایک شکستہ پتھر کے نیچے سے کچھ مسودے ملے جنہیں پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ جہاں آرا کی خودنوشتہ تحریریں ہیں جن کو اس نے شاہجہاں کے محبوس ہونے کے بعد قلم بند کیا تھا۔ شہزادی جہاں آرا شاہجہاں کے ساتھ قید تھی۔ اور اس قید کے زمانہ میں اس نے اپنی گزشتہ زندگی کے واقعات لکھنے شروع کئے اور ان کاغذات کو ثمن برج کے ایک پتھر کے نیچے چھپا دیا کہ جب برج کا پتھر خراب ہو جائے گا تو یہ تحریر لوگوں کے ہاتھ آئے گی جس سے اس کے اصل خیالات، جذبات اور حالات روشن ہوں گے''۔

آتشزدگی کا ناگہانی حادثہ

اپنی عزیز از جان بیگم ممتاز محل کے انتقال کے بعد شاہجہاں کو ایک اور جگر خراش سانحے سے گزرنا پڑا جب شہزادی جہاں آرا بیگم آتشزدگی کے ایک ناگہانی حادثے میں شدید طور پر زخمی ہوگئی۔ یہ 1643ء کا واقعہ ہے جب جہاں آرا اپنی سالگرہ کی شب کو بادشاہ کو سلام کر کے واپس آ رہی تھی تو راہداری میں رکھے ہوئے ایک شمعدان سے شہزادی کے ریشمی لباس میں آگ لگ گئی جو خوشبوؤں میں بسا ہوا تھا اس لئے بارود کی طرح جل اٹھا۔ آگ اس زور سے بھڑکی کہ شہزادی کو بچانے کی کوشش میں دو کنیزیں جل کر مر گئیں لیکن وہ شہزادی کو جلنے سے نہیں بچا سکیں۔ آگ سے شہزادی کی پشت پسلیاں اور بازو بری طرح جلس گئے۔ اس حادثہ سے پورے محل میں تہلکہ برپا ہوگیا۔ سالگرہ کی بزم نشاط یکا یک غمکدہ میں بدل گئی۔ بادشاہ نے اس روز دربار بھی نہیں کیا بلکہ اپنا سارا وقت خیرات کرنے، دعائیں مانگنے اور قیدیوں کو رہا کرنے میں صرف کیا۔ دو لاکھ کے قریب روپیہ تین دن کے اندر غرباء میں تقسیم کیا گیا۔ اس کے علاوہ روزانہ ایک ہزار روپیہ شاہزادی کے تکیہ کے نیچے رکھا جاتا تھا جو صبح کو غریبوں

میں تقسیم کرادیا جاتا تھا۔ بڑی بہن کے جلنے کی اطلاع سن کر اورنگ زیب برہان پورے اور مراد بخش ملتان سے دوڑے ہوئے آئے۔ دارالشکوہ اور شاہ شجاع پہلے ہی سے آگرہ میں موجود تھے۔ علاج معالجہ تقریباً نو ماہ تک جاری رہا۔ اطباء نے جان توڑ کر کوشش کی مگر کوئی خاص فائدہ نہ ہوا، لیکن فائدہ ہوا تو ایک عطائی کے مرہم سے۔ یہ مرہم عاف نامی غلام نے تیار کیا تھا۔ جو نہایت ہی کارگر ثابت ہوا۔ خدا خدا کر کے جہاں آرا کو صحت ہوئی۔ جب تک جہاں آرا بیمار رہی شاہجہاں مغرب سے لے کر تہجد کے وقت تک برابر نماز پڑھتا رہتا تھا۔ اور رو رو کر شاہزادی کی صحت کے لئے دعائیں مانگتا تھا۔ آخر اس کی دعاء قبول ہوئی اور شاہزادی تندرست ہوگئی۔ شہزادی کے تندرست ہونے پر غسل صحت کا ایسا شاندار جشن منایا گیا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں منایا گیا تھا۔ شہزادی کو سونے میں تلوایا گیا اور یہ سونا غرباء میں تقسیم کر دیا گیا۔ بادشاہ نے شہزادی کو 150 موتی، جواہرات کے زیورات اور سونے چاندی کے برتن عطا کئے۔ سورت کی بندرگاہ جس کی آمدنی پانچ لاکھ روپیہ سالانہ تھی، پاندان کے خرچ کے لئے جہاں آرا کو دی گئی۔

شعرا میں کو بے مثال طریقہ سے نوازا گیا

شہزادوں اور امرائے سلطنت کو خلعتیں عطا ہوئیں۔ اطباء کو سب سے زیادہ انعام ملے۔ حکیم محمد داؤد کو منصب دو ہزاری، ایک ہاتھی، ایک گھوڑا، سونے کی پانچ تولہ وزنی مہر اور ہزار ہا روپیہ ملا۔ حکیم مومنا شیرازی اور حکیم مسیح الزماں کو بھی خوب نوازا گیا۔ عارف غلام جس کی دوا زخموں کو مندمل کرنے میں تیر بہدف ثابت ہوئی تھی۔ اسے سونے میں تولا گیا۔ گھوڑے، ہاتھی اور ہزاروں روپیہ اسے دیا گیا۔ اسکے علاوہ کئی لاکھ روپیہ مدینہ منورہ روانہ کیا گیا۔ شہزادی کے جلنے کے سلسلہ میں ایک

واقعہ یہ بھی مشہور ہے کہ جب شہزادی کو دیسی اطباء کے علاج سے فائدہ نہ ہوا تو شاہجہاں نے بارٹن نامی ایک انگریز ڈاکٹر کو سورت سے بلوایا تھا جسکے علاج سے شہزادی کو بہت فائدہ پہنچا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شاہزادی کے صحت یاب ہونے کے بعد جب شاہجہاں نے بارٹن کو انعام واکرام دینا چاہا تو اس نے ذاتی فائدہ کے لئے انعام لینے سے انکار کر دیا اور بادشاہ سے التجا کی کہ اگر بادشاہ اس پر نوازش ہی کرنا چاہتا ہے تو یہ مہربانی کرے کہ اس کے ابنائے وطن کو ہندوستان میں تجارت کرنے کا فرمان عطا کر دیا جائے۔ بادشاہ نے یہ عرضداشت قبول کر لی اور اس طرح انگریزوں کو ہندوستان میں آزادی کے ساتھ تجارت کرنے کا نہ صرف پروانہ مل گیا بلکہ ان کو خاص مراعات بھی عطا کر دی گئی۔

شہزادی کو اپنے والد سے بے حد انسیت تھی

شہزادی جہاں آرا اپنے والد سے بیحد انسیت رکھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب شہزادہ محی الدین اورنگ زیب نے اپنے بھائی دارالشکوہ کی ولی عہدی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور دوسرے بھائیوں مراد اور شجاع سے آمادۂ جنگ ہوگیا اس کی چھوٹی بہن روشن آرا اورنگ زیب کے ساتھ ہوگئی۔ لیکن جہاں آرا اپنے والد کی محبت میں مسلسل کوشاں رہی کہ بھائیوں میں صلح ہوجائے اور پھر وہ وقت آگیا جب شاہجہاں کے اقبال کا ستارہ غروب ہوگیا۔ اورنگ زیب بادشاہ کو آگرہ کے قلعے میں نظر بند کر کے بھائیوں کو ختم کرنے میں مصروف ہوگیا۔ اگرچہ اورنگ زیب نے باپ کو خط لکھ کر یقین دلایا تھا کہ آگرہ کے قلعے میں شاہانہ زندگی گزارنے کے لئے جس ساز وسامان کی ضرورت ہوگی فراہم کیا جائے گا۔ اورنگ زیب نے شاہجہاں کی خدمت

اور آرام کے لئے افضل خان کو مہتمم اور بادشاہ کی صحت کا نگراں مقرر کیا اور بادشاہ کے لئے آرام و آسائش کا جملہ سامان بھی فراہم کر دیا۔ نظر بندی کے عالم میں شہزادی جہاں آرا نے اپنے والد کے ساتھ رہنا پسند کیا۔ شہزادی نے آخر وقت تک کوشش کی کہ اورنگ زیب بھائیوں کے ساتھ بہتر سلوک پر راضی ہو جائے لیکن بہن کا بیحد احترام کرنے کے باوجود اورنگ زیب صلح پر راضی نہ ہوا۔ اس سلسلے میں جہاں آرا اور اورنگ زیب کے درمیان مراسلت بھی ہوئی جو تاریخ کی کتابوں میں درج ہے۔ جہاں آرا کے خط سے اس کے اعلیٰ سیاسی اور سماجی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ مراسلت جہاں آرا اور اورنگ زیب کے کردار، ذہانت، اخلاق، سیاسی بصیرت، انتظامی صلاحیتوں، رعایا اور غربا پروری، مصلحت بینی، بزرگوں کا احترام، مذہبی جذبات، بزرگان دین اور صلحائے عقیدت کا روشن اظہار ہیں۔ جہاں آرا نے اپنے بھائیوں کی عداوت دور کرنے اور مغل سلطنت کو مستحکم بنانے کی حتی الامکان کوشش کی، لیکن اسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی پھر بھی اس کے لکھے ہوئے خطوط سے اس دور کی سیاسی، سماجی، مذہبی، اقتصادی اور اخلاقی زندگی کی صحیح تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

جہاں آراء کے بڑے صدمات

جہاں آرا کو اپنے عزیز بھائیوں داراشکوہ، شجاع اور مراد کے خونیں انجم کے جانکاہ صدمات برداشت کرنے پڑے۔ یہ ایسے صدمات تھے جنہوں نے شہزادی کو دنیا سے بے زار کر دیا۔ اس نے عبادت الٰہی اور اپنے بوڑھے باپ کی خدمت کو زندگی کا مقصد بنالیا۔ تخت و تاج سے محروم ہونے کے بعد سات سال تک شاہجہاں آگرہ کے قلعے میں قید رہا۔ اس میں شک نہیں کہ اورنگ زیب نے اس کے آرام اور راحت کا شاہانہ انتظام کر دیا تھا۔ اور شاہجہاں کو اس سات سال کے دوران ذرہ برابر

بھی مادی یا جسمانی تکلیف نہیں پہنچی اور یہ بھی درست ہے کہ اورنگ زیب نے اس کے درجہ اور مرتبہ کا پورا خیال رکھا۔

لیکن جو روحانی تکلیف شاہجہاں کو پہنچی تھی اس کی تلافی شاہانہ سامان اور آرام و آسائش کے لوازمات سے نہیں ہو سکتی تھی۔ شاہجہاں کو تخت و تاج سے زیادہ اولاد کا غم تھا۔ خدا نے اسے چار بیٹے دیئے تھے۔ لیکن آگرہ کے قلعہ میں نظر بند ہونے کے بعد مرتے دم تک ان چار بیٹوں میں سے وہ کسی ایک کی بھی شکل نہ دیکھ سکا۔ اورنگ زیب سے صرف چند میل کے فاصلہ پر دہلی میں شاہجہاں کی زندگی میں سات سال تک فرمانروائی کرتا رہا۔ اس کو اس طویل مدت میں کبھی اتنی توفیق نہ ہوئی کہ وہ باپ کو اپنی صورت دکھاتا۔ اس کی چھوٹی بیٹی روشن آرا بیگم اورنگ زیب کی سب سے بڑی حامی تھی وہ بھی باپ سے منحرف ہو گئی تھی۔

والد کی خدمت میں جہاں آراء بیگم

اس نظر بندی اور تنہائی کے عالم میں اگر کسی نے شاہجہاں کا سب سے زیادہ ساتھ دیا تو وہ اسکی پیاری بیٹی جہاں آرا تھی۔ جہاں آرا اگر چاہتی تو وہ اورنگ زیب کا ساتھ دے کر بڑے سے بڑا اعزاز اور بڑے سے بڑا فائدہ اٹھا سکتی تھی۔ لیکن اس نے باپ کی خاطر آرام، عیش اور حکومت تک کو ٹھکرا دیا۔ شاہجہاں کیساتھ اس بیٹی کو اس قدر محبت تھی کہ وہ باپ کیساتھ خود بھی آگرہ کے قلعہ میں قید ہو گئی۔ اور اپنی زندگی کو باپ کی اطاعت اور خدمت کیلئے وقف کر دیا۔ یہاں تک کہ اس نے اس فریضہ کی انجام دہی کی دھن میں شادی تک نہ کی بلکہ ایک ایسی درویشانہ زندگی گزاری جس کی مثال بادشاہوں کی تاریخ میں تو شاید مشکل ہی سے ملے گی۔

شاہ جہاں عبادت میں مصروف

جہاں آرا کا کام یہ تھا کہ وہ ہر وقت خود خوش رہتی اور باپ کو بھی اپنے ساتھ بشاش رکھنے کی کوشش کرتی۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر خدا نے شاہجہاں کو اس مصیبت کے وقت کے لئے جہاں آرا جیسی اطاعت گزار اور وفا شعار بیٹی نہ دی ہوتی تو اس کا چند روز بھی اس غم اور الم میں زندہ رہنا ناممکن تھا۔ اس سات سال کی مدت میں شاہجہاں کا مشغلہ یہ تھا کہ وہ اپنا بیشتر وقت عبادت و ریاضت میں گزارتا تھا۔ قرآن شریف کی تلاوت میں مصروف رہتا تھا۔ فقہ اور احادیث کی کتاب کا مطالعہ کرتا تھا۔ بزرگان دین کے حالات و واقعات پڑھ کر اپنے جی کو بہلاتا تھا یا اپنی پیاری بیٹی کے پاس بیٹھ کر دنیا کی بے ثباتی پر تبصرہ کیا کرتا تھا۔ غرضیکہ اس بادشاہ کی زندگی کے آخری ایام نہایت ہی دردناک اور عبرت انگیز تھے۔

شاہ جہاں کا انتقال

بادشاہ 1666ء میں پیشاب بند ہونے کے مرض میں مبتلا ہوا۔ اس مرتبہ اسے پیچش کی بھی شکایت ہوگئی۔ وہ اس بیماری میں تقریباً دو ہفتے مبتلا رہا۔ دو ہفتہ کے بعد جب حالت زیادہ نازک ہوئی اور بادشاہ کو اپنی زندگی کی کوئی امید باقی نہیں رہی تو اپنے سامنے اپنی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا اور وصیت کی کہ مجھ کو میری پیاری بیگم ممتاز محل کی برابر دفن کیا جائے۔ 26 رجب 1076ھ (1666ء) کو شاہجہاں کا انتقال ہوگیا۔ بادشاہ کو وصیت کے مطابق بلکہ ممتاز محل کے مقبرہ تاج محل میں دفن کیا گیا۔

1666ء میں شاہجہاں کے انتقال کے بعد شہزادی جہاں آرا آگرہ کے قلعہ سے باہر آئی اور دہلی آکر علی مراد خان کی سابقہ حویلی میں رہنے لگی۔ اورنگ زیب عالمگیر

اس کا بیحد احترام کرتا تھا اور ہمہ وقت کوشش کرتا رہتا تھا کہ بہن کے دل پر لگے ہوئے زخم مندمل ہوجائیں۔ شہزادی نے اپنی باقیماندہ زندگی لکھنے پڑھنے، داراشکوہ کے بچوں کی دیکھ بھال کرنے، غریبوں اور ضرورت مندوں کی مدد کرنے میں گزاری۔ جب تک شہزادی زندہ رہی اورنگ زیب اہم امور میں اس سے مشورے لیتا رہا۔ شہزادی کی رائے ہمیشہ صائب ہوتی تھی۔ شہزادی جہاں آرا کو اپنے والد کی طرح عمارتیں تعمیر کرانے کا بیحد شوق تھا۔ آگرہ کی شاندار جامع مسجد جہاں آرا کی ہی تعمیر کردہ ہے۔ جہاں آرا نے اس عظیم الشان مسجد کے ساتھ ایک دینی مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ جو بہت دنوں تک کامیابی سے جاری رہا۔

بزرگان دین سے شہزادی کی عقیدت کی انتہا یہ ہے کہ 1681ء میں اپنی موت سے پہلے اس نے وصیت کی تھی کہ اس کی نجی رقم تین کروڑ روپے درگاہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خدام کو دے دی جائے۔ انتقال کے بعد اسے شاہجہاں آبادی کی حدود سے باہر واقع محبوب الٰہی کے مزار کے قریب بے چھت کے مقبرے میں دفن کیا جائے۔ اس کی قبر کو اوپر سے خام رکھ کر اس پر سبزہ لگایا جائے۔ یہ وصیت پوری کی گئی۔ شہزادی کو حضرت محبوب الٰہی کے مزار پر انورائ کے قریب دفن کیا گیا، لیکن شہنشاہ اورنگ زیب نے بہن کی چھوڑی ہوئی دولت کا تھوڑا حصہ ہی درگاہ والوں کو عطا کیا اور باقی رقم دیگر کار ہائے خیر میں صرف کردی۔ اپنی قبر کے کتبے کیلئے کہا گیا شہزادی کا یہ شعر اس کی پرہیزگاری، نیکی، انکساری اور اعلیٰ ذوق شعری کی شہادت دے رہا ہے:

بغیر سبزہ نہ پوشد کے مزار مرا
کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

شہزادی جہاں آراء کی سیاسی طاقت

شہزادی جہاں آرا اپنے والد کے عہد حکومت کی ابتدا میں اپنی والدہ ممتاز محل کے انتقال 1631 کے بعد ملک کی سب سے بڑی خاتون اور شاہان مغلیہ میں سب سے جلیل القدر شہنشاہ کے تخت وتاج کی طاقت بن گئی اور 27 برس تک اسی اعلیٰ منصب پر فائز رہی۔ چوبیس برس کی عمر تک اس کی زندگی سرتاپا مسرت اور شان وشوکت میں گزری اور کوئی واقعہ ایسا نہیں ہوا جو اس کی عزت ووقار کے منافی ہو۔ اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں وہ تیمار دار کے لقب سے مشہور تھی۔ مصیبت زدوں کی مصیبتوں کو ہلکا کرنے، شاہی خاندان کے تنازعات کا خوش اسلوبی سے فیصلہ کرانے، یتیموں کی پرورش کرنے اور اپنی شرافت اور سلیم الطبعی کے ذریعہ خاطیوں اور مجروموں کو شاہی عتاب سے بچانے میں وہ اپنی قوتیں صرف کرتی تھی۔ مائیں عام طور پر سب سے بڑی بیٹی کی ساتھ بچہ کی بجائے بہن اور دوست کی طرح پیش آتی ہیں۔ اس کی پیاری ماں ممتاز محل کا انتقال اس وقت ہوا تھا جب کہ اس کی عمر 17 سال کی تھی۔ گیارہ سال بعد وہ اتفاقیہ طور پر بری طرح جل گئی اور چار مہینے تک تو وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہی۔ اس نے شادی نہیں کی اور ماں نے سعادت بھی جو عورت کی زندگی کی بلندترین خواہش کی تکمیل ہوا کرتی ہے۔ اسے نصیب نہیں ہوئی۔

☆☆☆

امۃ الحبیب حمیدہ بانو بیگم[۵]

ایشیائی تاریخ کا فاتح اعظم امیر تیمور چنگیز خاں کی طرح ظالم اور اقتدار پسند تھا، جس نے اسلامی سلطنتوں کو برباد کرکے رکھ دیا۔ مغل خاندان غلامان کے دورِ حکومت سے لے کر فیروز شاہ تغلق کے عہد تک ہندوستان پر مسلسل حملے اور لوٹ مار کرتے رہے تھے۔ سنہ 1336ء میں تاتاری ترکوں کے سردار ترغی خان کا بیٹا تیمور پیدا ہوا جو نہایت ذہین، بہادر، نڈر اور باہمت نوجوان ثابت ہوا۔ اپنی بہادری اور غیر معمولی ذہانت سے 36 برس کی عمر میں وہ چغتائی ترکوں کا سربراہ بن گیا اور اپنی بے نظیر جنگی قابلیت کی بنا پر چند برسوں میں ہی اس نے سمرقند میں اپنی مضبوط حکومت قائم کرلی۔ تیمور نے اپنے 36 سالہ دورِ حکومت میں پورے ایشیا کو روند کر رکھ دیا۔ اس کی فتوحات میں خوارزم، ترکستان، خراسان، مصر، شام، روم اور روس کے بیشتر علاقے شام تھے۔ ہندوستان بھی اس کی زد سے محفوظ نہیں رہا۔ 1398ء میں اس کی طوفانی فوجوں نے دہلی پر قبضہ کرلیا اور بے قصور انسانوں کا خون بہایا اور بے اندازہ دولت لوٹ کر پورے شمالی ہندوستان کو تاخت وتاراج کرکے 1399ء میں اپنے وطن واپس چلا گیا۔ اور صرف تین سال بعد اس نے دنیا کی سب سے بڑی اور مضبوط مملکت

۵ تلخیص از ''اسلام کی بیٹیاں'' محمد اسحاق بھٹی

سلطنت عثمانیہ ترکیہ کے حکمراں سلطان بایزید یلدرم پر حملہ کر کے نہ صرف عثمانی اقتدار کچل ڈالا بلکہ لاکھوں مسلمانوں کو موت کی نیند سلا دیا۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے شہر تہس نہس کر دئے۔ تیمور کے وحشیانہ حملوں نے چنگیز خاں کی تاریخ کو ایک بار پھر زندہ کر دیا جس نے بلاد شام اور عراق میں آگ وخون کا اتنا خوفناک طوفان برپا کیا تھا جس کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ امیر تیمور (تیمور لنگ) اگر چہ مسلمان تھا لیکن اس نے عثمانی سلطنت کو تباہ کر کے اسلامی تاریخ کا سب سے بڑا جرم یہ کیا کہ یورپ اسلامی برِ اعظم بنتے بنتے رہ گیا اور مٹتے ہوئے صلیبی اقتدار کو تقویت واستحکام حاصل ہو گیا۔ یہ اسی دور کا واقعہ ہے جب سلطان بایزید یلدرم کی فوج کا ایرانی النسل اور مذہباً آتش پرست سپہ سالار سلطان یزدانی سلطنت کا نہایت وفادار اور حکمراں کا بیحد قریبی شخص مانا جاتا تھا، سلطان کی فوج میں ملازمت کے بعد اپنی بہادری اور جنگی قابلیت کی بدولت ترقی کے زینے چڑھتا رہا۔ سلطان بایزید یلدرم کی حکومت میں بہت سے غیر مسلم اپنی لیاقتوں اور صلاحیتوں کی وجہ سے ذمہ دار عہدوں پر فائز تھے۔ ان پر کسی طرح کا مذہبی دباؤ نہیں تھا۔ سلطان یزدانی ایک فوجی ہوتے ہوئے بھی نہایت دانشمند اور صاحب علم انسان تھا۔

امۃ الحبیب مسلمان ہو گئیں

اسلامی تاریخ اور طرز حیات کا بغور مطالعہ ومشاہدہ کرنے کے بعد اسلام کی حقانیت اس پر روشن ہو گئی اور برضا ورغبت دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ یزدانی کی اہلیہ بھی شوہر کا ساتھ دیتے ہوئے خوشی خوشی مسلمان ہو گئی، لیکن ان دونوں کو اس وقت بیحد حیرت ہوئی جب انکی دس گیارہ برس کی خوبصورت بیٹی امۃ الحبیب نے والدین کی تقلید میں مسلمان ہونا پسند نہیں کیا۔ اس نے کہا کہ وہ اس کے بارے میں سوچ سمجھ

کر ہی قدم اٹھائے گی۔ والدین نے اس پر کوئی سختی نہیں کی اور تبدیلی مذہب کو اس کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ امۃ الحبیب دو سال تک اس مسئلے پر غور وخوض کرتی رہی۔ بالآخر اس پر والدین کا اثر پڑا اور اس نے اسلامی تعلیمات کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد ایک دن اسلام کی دولت سے مالا مال ہو گئی۔ اس وقت وہ تیرہ برس کی تھی۔

امۃ الحبیب کی تعلیم وتربیت

امۃ الحبیب کو اس کے ماں باپ نے بہترین تعلیم دلائی۔ چونکہ یزدانی اولاد نرینہ سے محروم تھا اس لئے وہ اپنی بیٹی کو مردانہ لباس پہنا کر خوش ہوتا تھا۔ اس نے لڑکوں کی طرح اس کی تربیت کی اور باپ کی بہادری کا امۃ الحبیب پر گہرا اثر تھا۔ اسے شہسواری اور فنون جنگ سے دلچسپی تھی۔ یزدانی نے اسے فن سپہ گری کے اصول وآئین سکھائے یہاں تک کہ اس میں ایک بہترین فوجی افسر کی خصوصیات پیدا ہو گئیں۔ یزدانی کا شمار چونکہ امرائے سلطنت میں ہوتا تھا اس لئے امۃ الحبیب بھی معاشرے کے اونچے طبقے کی مقبول شخصیت بن گئی تھی۔ اس نے حکومت کے فوجی تربیتی اسکول مدرسہ سلطانیہ حربیہ میں سپہ گری کی عملی تربیت بھی حاصل کی، ساتھ ہی کتابی ودرسی تعلیم میں بھی اپنا ہم سبق طالبات میں سب سے آگے تھی۔ وہ ہر لحاظ سے ایک مثالی دوشیزہ تھی۔ بڑے بڑے گھرانوں کے نوجوان اس سے شادی کے خواشمند تھے۔ لیکن امۃ الحبیب نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ فی الحال شادی کا ارادہ نہیں رکھتی۔ یزدانی نے بھی بیٹی پر کسی طرح کا زور ڈالنا مناسب نہیں سمجھا۔ جس وقت امۃ الحبیب 19 سال کی تھی اس کا باپ بایزید یلدرم فوج کے سیاہ وسپید کا مالک بن چکا تھا۔ بیٹے جیسی باہمت اور باصلاحیت بیٹی کی خواہش پر اس نے اسے فوج میں بھرتی کرا دیا۔ فوجی امور میں اپنی ذہانت کی وجہ سے باپ کی دست راست بن گئی۔ سلطان بایزید

یلدرم مردانہ فوجی وردی میں ملبوس یزدانی کی اس تیز طرار بیٹی کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ کچھ اہم مواقع پر اس نے اپنی جن کی مہارت کا عملی ثبوت اس طرح پیش کیا کہ سلطان یلدرم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا اور اسکی فوجی اور عسکری صلاحیتوں کو تسلیم کرتے ہوئے اس نے بہت سے معرکوں میں اپنی تلوار کے جوہر دکھائے اور اپنی بے پناہ شجاعت کا مظاہرہ کر کے اپنے باپ کی طرح شہرت حاصل کی۔

امۃ الحبیب جنگ میں شریک

20 جولائی 1402ء کو انگورہ کے مقام پر تیمور نے بایزید یلدرم پر حملہ کیا۔ دونوں فوجوں میں زبردست جنگ ہوئی۔ بایزید کے فوجیوں کی تعداد اس وقت ایک لاکھ تھی جب کہ تیمور تیمور کی فوج پانچ لاکھ سے زائد تھی۔ اس خوفناک لڑائی میں امۃ الحبیب بھی شامل تھی۔ اس نے اس فیصلہ کن جنگ میں غیر معمولی بہادری دکھائی لیکن تاتاریوں کی ٹڈی دل فوج نے بالآخر فتح حاصل کر لی۔ یہ اسلامی تاریخ کی نہایت بدبختانہ جنگ تھی جس میں دونوں طرف مسلمان تھے اور ہزاروں کی تعداد میں انکا خون بہا۔ اپنے عہد کے سب سے جابر اور ظالم فاتح تیمور نے ہزاروں عثمانی فوجیوں کے ساتھ سلطان بایزید یلدرم کو بھی قیدی بنالیا تھا۔ اسلامی تاریخ کا یہ بھی ایک زبردست المیہ ہے کہ تیمور نے اس جلیل القدر مسلم حکمراں کو ایک پنجرے میں بند کر کے اپنی بربریت اور درندگی کا مظاہرہ کیا جس نے صلیبی دشمنان اسلام کو ہر محاذ پر شکست دے کر اسلام کو سربلند کرنے کی کوشش کی تھی۔

تیمور کی فوج کے ہاتھوں زندہ گرفتار ہونے والوں میں امۃ الحبیب بھی تھی۔ جس وقت تیمور جنگی قیدیوں کا معائنہ کر رہا تھا، اس نے دیکھا کہ قیدیوں کے ہجوم میں ایک دراز قامت، تنومند اور خوبصورت نوجوان بڑی

بے نیازی سے کھڑا ہے، جیسے اسے اپنے انجام کی کوئی فکر نہ ہو۔ تیمور نے اپنے دستور کے مطابق ان سب فوجیوں کے قتل کا حکم صادر کر دیا۔ اسی وقت مردانہ فوجی وردی میں ملبوس امۃ الحبیب نے بلند آواز میں کہا۔

امۃ الحبیب کا مردانہ لہجے میں بادشاہ کو خطاب

''اے بادشاہ! تو فاتح ہے، تجھے مفتوحین کے قتل کا اختیار ہے، کیا ایک بہادر بادشاہ ایک مفتوح لیکن بہادر سپاہی کو کچھ کہنے کی اجازت نہیں دے سکتا؟''

تیمور اس نوجوان کی ہمت و جرأت سے متاثر ہوا، اس نے کہا: ''تم جو کہنا چاہتے ہو کہہ سکتے ہو''۔

امۃ الحبیب نے مردانہ لہجے میں کہا: ''اے عظیم فاتح! مجھے امید ہے کہ میری پوری بات سنے بغیر مجھے قتل کرنے کا حکم نہیں دے گا''۔

تیمور نے کہا: ''تو اپنی پوری بات کہہ سکتا ہے''۔

امۃ الحبیب نے بے باکانہ اور جرأت مندانہ لہجے میں کہنا شروع کیا:

''اے امیر! تو نے بایزید پر حملہ کر کے ہزارہا بندگان خدا کو خاک و خون میں تڑپایا، تیری بے رحم تلوار نے بے شمار بے گناہوں کے سر تن سے جدا کئے۔ لاتعداد بچوں کو یتیم اور عورتوں کو بیوہ بنایا۔ تو خود کو مسلمان کہتا ہے۔ تو بتا کہ کیا ایک مسلمان کے لئے اہل اسلام کا اس بے رحمی سے خون بہانا کس طرح جائز ہے؟ کیا تجھے اپنی موت یاد نہیں کیا تجھے اس حقیقت کا علم نہیں کہ تجھے بالآخر اللہ کے سامنے اپنے اعمال کے لئے جواب دہ ہونا ہے۔ اے امیر! بتا کہ جب اللہ تجھ سے مظلوموں کے بارے میں باز پرس کرے گا تو تو کیا جواب دے گا، اور بتا کہ کیا اس انسان کو بہادر اور فاتح کہا جا سکتا ہے جو بے بس قیدیوں پر تلوار اٹھائے، کیا تیرے نزدیک یہی شجاعت ہے

کہ قیدیوں کو پابہ زنجیر کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ اگر یہ بہادری ہے تو بزدلی کس کو کہتے ہیں''۔

امۃ الحبیب تیمور کی بیگم بن گئیں

تیمور حیرانی سے سن رہا تھا۔ امۃ الحبیب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے سر سے آہنی خود اتار دیا اور کہا: ''اے امیر! میں ایک عورت ہوں تو اس سے اندازہ کر سکتا ہے کہ جس اسلامی مملکت کی عورتیں ایسی باہمت ہوں اس کے مرد کتنے شجاع ہوں گے۔ اے امیر! تو نے اسلامی فتوحات کی راہ میں جو رکاوٹیں پیدا کی ہیں اس کی سزا تجھے بھگتنی ہوگی۔ میں اپنی بات ختم کر چکی، اب تجھے اختیار ہے''۔

تیمور نے اس کے خاموش ہوتے ہی کہا: ''اے بہادر خاتون! تو نے سچ کہا، تیمور بہادر ہے اور بہادروں کو پسند کرتا ہے۔ تیری اس عالی ہمتی کے اعتراف میں تیری اور اس جگہ موجود تمام قیدیوں کی جان بخشی کی جاتی ہے''۔

تیمور امۃ الحبیب سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اس کے ساتھ شادی کی تجویز پیش کر دی۔ یہ تجویز منظور ہوئی اور امۃ الحبیب تیمور کی بیگم بن گئی۔ تیمور نے شادی کے بعد امۃ الحبیب کو حمیدہ بانو بیگم کا لقب دیا۔ حمیدہ بانو بیگم سے پہلے تیمور کی تین بیویاں اور تھیں۔ یہ اس کی چوتھی بیوی تھی۔ مگر تیمور کا زیادہ پیار اسی سے تھا۔ اس کی ایک وجہ اس کی بے مثال بہادری اور جرأت تھی۔ دوسری وجہ اس کا حسن و جمال تھا۔ تیسری وجہ اس کی اخلاقی پاکیزگی، شائستگی، بیدار مغزی، روشن دماغی اور فہم و فراست تھی۔ ان اوصاف نے نہ صرف تیمور کو بلکہ اس کی بیگمات اور دوسرے لوگوں کو بھی حمیدہ بانو کا فریفتہ اور مداح بنا دیا تھا۔ تیمور تمام معاملات میں اس سے مشورہ لیتا اور اس کی ہدایات پر عمل کرتا تھا۔ یہ میدان جنگ میں مسلح ہو کر بڑے بڑے خطرناک

مقامات پر اس کے ساتھ رہتی اور دشمن کے مقابلے میں بہادری و شجاعت کے جوہر دکھاتی۔ تیمور کا انتقال انزار نامی شہر میں ہوا تھا جو سمرقند میں ہے۔ تیمور نے 36 برس حکومت کی اور وہ 1405ء میں 71 برس کی عمر میں اس کا انتقال ہوا۔

تیمور اور حمیدہ بانو بیگم کا انتقال

حمیدہ بانو بیگم کے بطن سے تیمور کے سات بچے پیدا ہوئے لیکن ان میں سے زندہ کوئی نہ رہا اور وہ سب شیر خواری کی حالت میں مر گئے۔ تیمور کی وفات کے بعد وہ بالکل تنہا ہو گئی۔ چند مہینے پہلے وہ دنیا کے عظیم بادشاہ کی ملکہ تھی اور تمام کاروبارِ حکومت اس کے اشاروں پر چلتا تھا۔ لیکن اب اس کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ اس وحشت انگیز تنہائی میں اس نے کتابوں کو اپنا رفیق بنایا۔ وہ اس دور کے علم و فن کی تمام اصناف میں ماہر تھی اور اس عہد کا کوئی شخص اس باب میں اس کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا، لیکن حکومت و سلطنت کی مصروفیات نے اس کی توجہ دوسری طرف مبذول کرا دی تھی۔ تیمور کی وفات کے بعد اس نے مطالعہ اور تصنیف و تالیف کو اپنی دلچسپیوں کا مرکز بنا لیا تھا۔ متعدد با اثر لوگوں نے جو میران شاہ کی حکومت سے مطمئن نہ تھے اس کو پیغام بھیجے کہ آپ حکم دیں تو ہم میرانشاہ کے خلاف بغاوت کر کے اور اسے قتل کر کے تیمور کی وصیت کے مطابق آپ کو سربراہِ سلطنت بنا دیں گے۔ ملک کی اہم شخصیتیں میرانشاہ کو پسند نہیں کرتیں اور وہ اس سے بیزار ہیں۔ آپ کا ادنی اشارہ ہمارے لئے کافی ہے اور آپ کی بادشاہت کے لئے میدان صاف ہے۔ مگر حمیدہ بانو بیگم نے جواب دیا:

''میں حکومت و سلطنت سے زیادہ پرورش لوح و قلم کو بہتر جانتی ہوں۔ آپ لوگ اگر دین اور دنیا کی کامیابی کے متمنی ہیں تو اس شر و فساد کو دل سے نکال دیں اور وفاداری اور دیانت کے ساتھ اپنے موجودہ حکمراں کی اطاعت کریں''۔

امۃ الحبیب عرف حمیدہ بانو بیگم یقیناً ایک غیر معمولی خاتون تھی۔ وہ اس قدر عالی ہمت تھی کہ اگر چاہتی تو ان ہزار ہا ہمنواؤں اور حامیوں کی مدد سے میر انشاہ کی حکومت کا تختہ پلٹ سکتی تھی جو اس سے ناراض تھے لیکن اس کے علمی ذوق وشوق نے اسے جنگ وجدل اور خونریزی سے برگشتہ کر دیا۔ جس زمانہ میں صرف چند روز بیمار رہ کر راہی عدم ہوئی اس کے پاس کوئی سرمایہ نہیں تھا۔ اس نے اپنا سارا اندوختہ مختلف علوم وفنون کی بہترین کتابوں پر صرف کر دیا۔ اس نے قسطنطنیہ میں وفات پائی۔

☆☆☆

اعزاز النساء بیگم زوجہ سلطان شاہ جہاں[6]

1857ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں نے اسے زمین بوس کر دیا تھا فرقہ پرستوں نے مسجد کو پانڈوؤں کے زمانے کا مندر قرار دینے کی مہم شروع کر دی۔

حال ہی میں دہلی میٹرو ریل کارپوریشن نے جامع مسجد کے نزدیک واقع سبھاش پارک میں زیر زمین اسٹیشن تعمیر کرنے کا کام شروع کیا تو وہاں کھدائی کے دوران مسجد کی ایک طویل وعریض دیوار برآمد ہوئی۔ دیوار کے علاوہ بھی بہت سے آثار قدیمہ دریافت ہوئے ہیں۔ جب مقامی مسلمانوں کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو وہ جوق در جوق اکبر آبادی مسجد کے آثار دیکھنے کے لئے وہاں پہنچے۔ مسلمانوں کے جذبہ ایمانی نے جوش مارا اور دریافت شدہ دیوار کے اوپر ایک بڑی دیوار اور مسجد کے منبر ومحراب بھی تعمیر کئے جانے لگے۔ وہاں باضابطہ نماز جمعہ بھی ادا کی گئی اور نماز تراویح کے اہتمام کا اعلان بھی ہوا لیکن اچانک سیکولر حکومت نے ہائی کورٹ کے حکم کے بعد مسجد سمیت پورے علاقے کو سیل کر دیا اور وہاں مسلمانوں کو عبادت کرنے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ دہلی ہائی کورٹ نے تاریخی اکبر آبادی مسجد کی تعمیر نو کے کام پر پابندی عائد کر کے اس کی اراضی محکمہ آثار قدیمہ کے سپرد کر دی ہے۔

[6] رابعہ عظمت، راشٹریہ سہارا، 26/اگست-2012ء

مسلمانوں کے جوش وجذبے سے کھیلنے کے لئے ہندوفرقہ پرست اور فسطائی طاقتیں بھی میدان میں کود پڑی ہیں۔اورانہوں نے مسجد کے مقام پر پوجا اور ہنومان چالیسا کرنے کا اعلان بھی کرڈالا۔صرف یہی نہیں بلکہ ہندوفرقہ پرست تنظیموں نے برآمد کردہ مسجد کی قدیم دیوار کو بھی پانڈوؤں کے زمانے کا مندر قرار دینے کی ناپاک مہم شروع کردی ہے جب کہ مسجد اکبرآبادی کی ایک مستند تاریخ موجود ہے۔سب سے معتبر حوالہ سرسید احمد خاں کی شہرہ آفاق تصنیف ''آثارالصنادید'' میں پایا جاتا ہے۔

دہلی کی تاریخ عمارتوں پر لکھی گئی اس کتاب میں اکبرآبادی مسجد کا تذکرہ اور نقشہ بھی موجود ہے۔مایہ ناز تصنیف آثارالصنادید کے مطابق اس کے تین برج اور سات دروازے تھے۔مسجد کی عمارت 63 گز لمبی اور 17 گز چوری تھی جس کے آگے ایک چبوترہ 63 گز لمبا اور 57 گز چوڑا تھا۔اوراس مسجد کا صحن 154 گز لمبا اور 104 گز چوڑا تھا اوراس کے گرد طالب علموں کے رہنے کے لئے حجرے بھی بنے ہوئے تھے۔اس تاریخی مسجد میں حضرت شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالقادر درس قرآن دیا کرتے تھے اور تاریخ کی مستند کتابوں کے مطابق یہ مسجد مجاہدین آزادی کا اہم مرکز تھی۔

اسی مسجد سے پہلی بار جہاد کا فتوی جاری ہوا

اسی عبادت گاہ سے پہلی بار انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کا فتویٰ صادر کیا گیا تھا اور یہیں سے مجاہدین آزادی کو تیار کر کے انگریزی جبر اور تسلط کے خلاف جنگ کرنے کے لئے دستوں کی شکل میں روانہ کیا جاتا تھا لیکن 1857ء کی جنگ آزادی میں برصغیر کے مسلمانوں کو ناکامی ہوئی تو دہلی کے تخت پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا اور شہر میں مسلمانوں کے قتل عام کے بعد دوسرا بڑا گھناؤنا جرم،مسجد اکبری آبادی کو باغیوں کا

مرکز قرار دے کر اسے زمین بوس کرنا تھا۔گویا برطانوی سامراج سے نجات کی لڑائی میں یہ پہلی اوراہم مسجد تھی جس نے اپنی شہادت پیش کی تھی۔بعدازاں اس مسجد کے ساتھ ساتھ اردگرد کی جو ساری عمارتیں مسمار کردی گئی تھیں ان میں بیشتر گھر شاہ ولی اللہ کے اہل خاندان کے تھے۔جس میں شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کے مکان اور ان کے مدرسے بھی شامل تھے۔مسجد کی جگہ پر بعد میں ایڈورڈ پارک بنادیا گیا۔حالات جب کچھ سازگار تھے تو مسلمان یہاں آکر نماز ادا کیا کرتے تھے۔مولانا محمد علی جوہر کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ باقاعدہ نماز فجر کی ادائیگی اکبرآبادی مسجد کے آثار پر ہی کرتے تھے اوراس کی آبادکاری کیلئے اللہ کے حضور رو رو کر دعا مانگتے تھے۔

شاہجہاں آباد کے فیض بازار میں یہ مسجد واقع ہے اور بادشاہ شاہ جہاں کی دوسری بیوی نواب اعزازالنساء بیگم عرف اکبرآبادی بیگم نے 1650ء میں اسے تعمیر کروایا تھا اوراسی وقت شہنشاہ ہندوستان نے دہلی کی جامع مسجد بھی تعمیر کروائی تھی اور اسی دوران بادشاہ کی تیسری بیوی فتح پوری بیگم نے دہلی کے چاندنی چوک میں تیسری خوبصورت مسجد 'مسجد فتح پوری' بنوائی۔تاریخی حوالوں سے کہا جاتا ہے کہ اکبرآبادی بیگم نے شاہ جہاں سے گزارش کی تھی کہ وہ اس سال ان کے ذریعہ بنوائی گئی مسجد میں ہی نماز عید ادا کریں اور شاہ جہاں نے اپنی اہلیہ کی یہ خواہش پوری بھی کی تھی۔

بیگم اکبرآبادی کو بھی خوبصورت عمارتوں اور باغات کا بہت شوق تھا لہٰذا انہوں نے آگرہ سے دہلی منتقل ہونے کے بعد دہلی کا مشہور شالیمار باغ اپنی نگرانی میں بنوایا۔یہ وہی عالیشان باغ ہے جہاں اورنگ زیب کی تاجپوشی ہوئی تھی۔بادشاہ شاہجہاں کی دوسری بیگمات کی تعمیر کروائی گئی فتح پوری مسجد، مینارمحل مسجد اور سرہندی مسجد تو زمانے کے حوادث سے محفوظ رہیں لیکن اکبرآبادی مسجد انگریزوں کے ہاتھوں نہ بچ سکی اور اسے شہید ہونا پڑا۔اس مسجد میں پچی کاری اور خطاطی کے ایسے نمونے پیش کئے گئے

تھے کہ اس کی دوسری مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔ مسجد کی لوح پر قرآنی آیات کی خطاطی سنگ موسیٰ کی پچی کاری سے اس قدر شاندار تھی کہ مسجد اکبرآبادی کو جس وقت شہید کیا جارہا تھا تو سرسید نے ان قرآنی آیات کی لوح کو قیمت دے کر خرید لیا اور جسے لاکر علی گڑھ میں اپنے مدرسۃ العلوم کی جامع مسجد کے ماتھے کا جھومر بنایا تھا۔

اکبرآبادی مسجد کو شہید کردیا گیا

مسلم دور اقتدار کی عظیم الشان تاریخی عمارتوں اور مسجدوں جامع مسجد، فتح پوری مسجد، قلعہ معلیٰ اور جامع مسجد کے وسط میں واقع اکبرآبادی مسجد کو تباہ کردیا لیکن کسی مصلحت کی خاطر فتح پوری مسجد کو تو ایک مالدار ہندو لالہ کو کرایہ پر دے دیا اور جامع مسجد شاہ جہانی کو اصطبل میں تبدیل کرکے وہاں انگریزی افسروں کے گھوڑے باندھ دئے گئے تھے۔ باقی رہی مسجد اکبرآبادی کو مسمار کرکے اس کی بے حرمتی کرتے ہوئے وہاں لیٹرین بنوادیں اور اسیتباہ کرنے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ یہ باغیوں کا مرکز تھا۔ یہاں پر حکومت کے خلاف جہاد کرنے پر اکسایا جاتا ہے۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اکبرآبادی مسجد جہاں سے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ جاری ہوا تھا۔ جنگ آزادی کی اس اہم تاریخی مسجد کو پورا پورا احترام دیتے ہوئے موجودہ کانگریسی حکومت اس کے آثار پر ہی از سرنو تعمیر میں کھلے دل سے شریک ہوتی اور ہر قسم کی معاونت بہم پہنچائی جاتی لیکن اس کے برعکس اسے فرقہ پرستوں کے حوالے کردیا گیا ہے۔ جنہوں نے مسجد کے آثار کی دریافت پر ہی ہنگامہ آرائی مچائی ہوئی ہے اور ادھر سیکولر حکومت نے بھی چپ سادھ کر اسے متنازعہ بنانے کی کھلی اجازت دے دی ہے۔ اور اسے ہندو فرقہ پرستی کی بھینٹ چڑھانے کی تیاری کی جارہی ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ پٹیل اور نہرو جیسے ہندوستانی

لیڈروں کو سومنات مندر تو یاد رہا لیکن اکبرآبادی مسجد کبھی یاد نہیں آئی تو اس سے اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ جب نہرو اور پٹیل کو مسجد کی شہادت سے کوئی سروکار نہیں رہا تھا تو منموہن سنگھ، سونیا گاندھی سے کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ وہ مذکورہ مسجد کے ساتھ انصاف کرپائیں گے۔

فرقہ پرستوں کے سامنے حکومت نے گھٹنے ٹیک دیئے

حالانکہ کھدائی میں نکلنے والے آثار کو دیکھ کر خود محکمہ آثار قدیمہ نے بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ یہ تمام آثار اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ جس عمارت کی یہ باقیات برآمد ہوئی ہیں وہ مغلہ دور کی ہے اور اسی عہد میں بنائی گئی ہے جس دور میں جامع مسجد دہلی اور لال قلعہ تعمیر ہوا تھا۔ میٹرو ریلوے نے بھی حقیقت کو قبول کرلیا تھا۔ قریب تھا کہ مسجد کی دوبارہ تعمیر شروع ہوتی۔ ہندو فرقہ پرستوں کی شدید ہنگامہ آرائی کے آگے سیکولر حکومت نے گھٹنے ٹیک دئے اور دہلی میونسپل کارپوریشن نے ویشو ہندو پریشد کی دھمکیوں سے خوفزدہ ہوکر اس کی تعمیر پر پابندی عائد کردی۔ اور اب یہ معاملہ عدالت میں پہنچ گیا ہے۔ حکومت دہلی جس کا رویہ مثبت نظر آرہا تھا۔ اب اس کا کہنا کہ محکمہ آثار قدیمہ کی مرضی کے بغیر اکبرآبادی مسجد کی تعمیر نو سے امن وامان کی صورتحال متاثر ہوسکتی ہے۔ اس لئے بغیر کلیئرنس کے یہاں کسی قسم کا کوئی تعمیراتی کام جاری نہیں کیا جاسکتا۔ عدالت کے حکم کے مطابق یہاں اس وقت تک کوئی پیش رفت نہیں ہوسکتی جب تک آثار قدیمہ کی اس سلسلے میں کوئی رپورٹ نہیں آجاتی جب کہ عدالت میں محکمہ آثار قدیمہ کا یہ کہنا ہے کہ ابھی ہم تحقیقات کررہے ہیں اور بوجہ بارش مزید تحقیق وجانچ روک دی گئی ہے۔ تاہم ہائی کورٹ کی مکمل بینچ نے محکمہ سے کہا ہے کہ وہ فی الحال اپنی جانچ جاری رکھیں اور جلد از جلد دریافت کریں کہ یہاں پر 17ویں صدی کی اکبر

آبادی مسجد تھی یا نہیں اور اسی لئے آثار قدیمہ کا شعبہ متعلقہ اراضی کو اپنی تحویل میں لے سکتا ہے حالانکہ کھدائی کے دوران برآمد شدہ دیوار، صحن، وضوخانے کیساتھ متعدد وتاریخی نوعیت کی اشیاء بھی نکلی تھی۔ تاریخی کتابوں میں اس کے حوالے سے تاریخی مواد موجود ہے لیکن صرف ہندو فرقہ پرست تنظیموں کو خوش کرنے کیلئے اسے متنازعہ بنایا جارہا ہے۔ جب کہ تاریخی مسجد کے ملنے والے آثار کو زمین سے نکال کر اسکے منبر درست کئے گئے، صحن آراستہ کیا گیا، دیواروں کے نقوش بھی ابھرے گئے اور یہاں جمعہ کی اذان کے بعد امام نے خطبہ مسنونہ پڑھا۔ مقامی مسلمانوں میں جوجذبہ دیکھی گئی تھی کہ وہ نماز کے وقت سے قبل ہی فیض بازار سے لے کر لال قلعہ سے متصل سڑک تک اپنے مصلے بچھا چکے تھے اور دہلی ٹریفک پولس کی دہلی گیٹ سے لال قلعہ جانے والی سڑک کو پوری طرح بند کرنا پڑا۔ مجبوراً حفاظت کا بھی بندوبست کیا گیا۔ یہاں پر فوری طور پر عارضی شیڈ لگانے کے کام کا بھی آغاز ہوگیا تھا لیکن ادھر آثار قدیمہ کی جانب سے میخ نکالنے کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا ہے۔ ہندو انتہا پسندوں کا کہنا ہے کہ اگر اسی طرح کھودکھود کر مسجدیں نکالتے رہے تو پھر مسلمان پوری دہلی کھود کر رکھ دیں گے۔ اسلئے اس قسم کے معاملات کو منظور نہیں کیا جاسکتا ہے۔ تاہم مسجد اکبرآبادی کے جائے وقوع کے متعلق مولوی بشیرالدین احمد دہلوی کی تحقیق آخری فیصلہ ہے کہ مسجد ایڈورڈ پارک موجودہ سبھاش چندر پارک میں واقع تھی یہاں ابھی تک زیرزمین مسجد کے آثار موجود ہیں۔ چندگز زمین کھودنے کے بعد آثار نظر آنے لگتے ہیں۔

اکابرین کے تاثرات مسجد اکبرآبادی کیلئے

مولوی بشیرالدین احمد دہلوی مزید لکھتے ہیں کہ ''محل وقوع اس کا موجودہ ایڈورڈ پارک ہے جس وقت اس کے لئے زمین ہموار کی جانے لگی تو مسجد کا چبوترہ اور

بنیادیں جوں کی توں مثل گنج نہاں کے زمین میں مدفون ہوئی تھیں۔ ویسے ہی ڈھک دی گئیں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خانہ خدا اور بے نظیر عمارت نظروں سے پوشیدہ ہوگئی''۔ دہلی کے مشہور بزرگ مولوی حفیظ الرحمٰن مرحوم فرماتے ہیں کہ ''ایام طفولیت میں راقم الحروف نے سنا تھا کہ ٹھنڈی سڑک کے کنارے ایڈورڈ پارک میں وہ مسجد موجود تھی جس میں حضرت شاہ عبدالقادر نے علوم اسلامیہ کا درس دیا تھا۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد انگریزوں نے اس شہر یعنی شاہجہاں آباد پر ایسا غصہ اتارا کہ قلعہ کے اطراف کی آبادی اور محلات دور دور تک ملیامیٹ کردئے گئے یہ مسجد بھی ڈھادی گئی۔ امام جامع مسجد شمس العلماء مولانا سید احمد نے چیف کمشنر سے درخواست کی تھی کہ کم از کم اس جگہ کا احاطہ کردیا جائے تاکہ جانوروں کی آمدورفت سے بے حرمتی نہ ہو۔ چنانچہ احاطہ طے کردیا گیا''۔

اکبرآبادی مسجد کے نزدیک کشمیری کٹرہ تھا جس میں زیادہ کشمیری لوگ مقیم تھے۔ گویا اکبرآبادی مسجد کا فرضی نام مسجد کشمیری کٹرہ ہوگیا تھا۔ مرزا غالب بھی مسجد کشمیری کٹرہ کی تباہی پر آہ وفغاں کرتے نظر آتے ہیں''۔

مکاتب غالب.....

مشہور شاعر جوش ملیح آبادی آزادی وطن سے قبل لال قلعہ سے رکشا سے گزر رہے تھے مسٹر ایڈورڈ کا مجسمہ دیکھ کر انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں آزادی ملتے ہی تم کو اسی طرح مسمار کردیں گے اور ڈھادیں گے جس طرح تم لوگوں نے اکبرآبادی مسجد کو زمین بوس کردیا ہے۔ جوش ملیح آبادی صاحب کی پیشین گوئی پوری ہوئی اور انگریزوں کے جانے کے بعد ہی ایڈورڈ کا مجسمہ نکال پھینکا گیا اور اس جگہ سبھاش چندر بوس کا مجسمہ نصب ہوا۔ اسی مجسمہ سے مشرق میں مسجد اکبرآبادی واقع تھی۔

لاثانی تاریخی مسجد کے متعلق سرسید احمد خاں لکھتے ہیں:

''یہ مسجد دلکش، دلربا، فرحت بخش اور روح افزا، سر سے پاؤں تک سنگ سرخ کی تھی۔ اس کے گرد مکانات اور طالب علموں کے رہنے کیلئے حجرے بنے ہوئے تھے۔اس مسجد کو ضلع غربی سے ملحق کرسی دے کر بنایا گیا''۔

مسجد اکبر آبادی وہی تاریخی مسجد ہے جس میں شاہ عبدالقادر محدث دہلوی سالہا سال مقیم رہے اور اسی دوران آپ نے ''موضح القرآن'' جیسی شہرآفاق تفسیر تحریر فرمائی اور قرآن کریم کے علمی نکات کا دریا بہایا۔آپ نے نہ صرف اکبرآبادی مسجد میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ قائم رکھا بلکہ درس وتدریس کا مشغلہ بھی جاری رکھا۔

مولانا امداد صابری لکھتے ہیں: ''اس مسجد میں جہاں عبادت الٰہی ہوتی تھی وہاں درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رہتا، چنانچہ اس مسجد پر کتبہ لگا ہوا تھا۔اس میں ''طلبہ علم رسانند'' بھی تحریر تھا۔اس کے ایک کمرے میں شاہ عبدالعزیز کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر نے پوری زندگی گزاری۔ وہ اس میں درس بھی دیتے تھے''۔

☆☆☆

آخری تاجدار بہادر شاہ ظفرؒ

ملک پر کوئی قوم حملہ آور ہوتی ہے تو اسے اپنا وطن نہیں بناتی بلکہ لوٹ کھسوٹ کر چلی جاتی ہے یا اپنے زرخرید کو تخت پر بیٹھا کر خراج وصولتی رہتی ہے۔ انگریزوں نے ہندوستان کو جم کر لوٹا۔سونے کی چڑیا کہلانے والے ہندوستان میں دراصل ہر طرف سونا ہی سونا تھا، جسے دیکھ کر انگریز اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے اور تجارت کے بہانے آدھمکے، لیکن انہوں نے بھی اس ملک کو اپنا وطن نہیں بنایا لیکن مسلمانوں نے ہندوستان اپنی آمد سے ہی اس ملک کو اپنا وطن عزیز سمجھا۔اس کی ترقی، فلاح بہبود اور رعایا کی خوش حالی کے لئے نئے قوانین وضع کئے۔ رعایا کو ظلم و جبر اور استحصال سے بچانے کے لئے نئی پالیسی مرتب کی، اس طرح کا معاشرہ تشکیل دینے کی کوشش کی جس میں کسی کے ساتھ امتیاز اور بھید بھاؤ نہ ہو، جس میں کسی حد تک وہ کامیاب بھی رہے۔ مسلم شہنشاہ نہ صرف کثیر ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ دیتے تھے بلکہ بہ نفس نفیس شریک بھی ہوتے تھے۔ مغلوں کے یہاں ہولی اور دیوالی کی روایت پائی جاتی تھی۔ اس دور میں جو بھی ممکن ہوسکتا تھا تمام سہولتیں فراہم کی جاتی تھیں لیکن اس کے باوجود آج وہ اس طرح یاد نہیں کئے جاتے جس کے وہ حقدار ہیں۔ مغل شہنشاہوں نے نہ

ؒ عابد انور۔ سہارا، ۲۷ر نومبر 2011ء

صرف یہاں کی تعمیر وترقی میں زبردست رول ادا کیا اور گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دیا بلکہ ہندوستان کو فخر کی علامت بھی دی جسے دیکھنے کے لئے دنیا بھر کے سیاح ہندوستان آتے ہیں۔اس سے نہ صرف ہندوستان کو بیش بہا زرمبادلہ ملتا ہے بلکہ ہندوستان کی معاشی ترقی میں بھی نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔

بہادر شاہ ظفر ہندوستان سے محبت کرتے تھے

ہندوستان کے خزانہ میں جتنا روپیہ تھا، انگلستان میں اس کا ایک تہائی بھی نہیں تھا۔افسوس کہ اس کو بنانے والے کا وجود اب عدم کے درجے میں ہے۔آخری شہنشاہ بہادر شاہ ظفر تو آخری سانس تک ہندوستان کیلئے بے چین تھے۔یہاں کی رعایا کے بارے میں ہی سوچتے رہتے تھے۔ہندوستان کی نئی نسل انکے بارے میں کم جانتی ہے سرسری معلومات تو سبھی کو ہے،لیکن ان کے کارناموں سے ناواقف ہیں۔بیشتر تو وہ ہیں جو ان شہنشاہوں کے بارے میں انگریزوں کے پھیلائے ہوئے مفروضات پر ایقان رکھتے ہیں۔انگریزوں نے شانہ بشانہ چلنے والی دوقوموں میں اس قدر زہر بھر دیا کہ ان کے چلے جانے کے 65 سال بعد بھی اب تک یہ آپس میں دست بہ گریباں ہیں۔ایک دوسرے کے بارے میں مثبت سوچ رکھنے کے بجائے منفی سوچ پر زیادہ عمل کرتے ہیں۔جس کی وجہ سے ہندوستان کی ترقی کی رفتار دھیمی پڑ جاتی ہے۔آج اگر متحدہ ہندوستان ہے تو اس کا سہرا مغلیہ سلطنت کے سر جاتا ہے۔

مغل حکمراں خصوصاً محی الدین اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے عہد میں جتنا بڑا متحدہ ہندوستان دیا، وہ اگر قائم رہتا تو ہندوستان آج دنیا کا سب سے طاقتور اور دولت مند ملک ہوتا اور پوری دنیا کی قیادت کررہا ہوتا۔پوری دنیا اسکے سامنے سر جھکاتی لیکن مغلیہ حکمراں انگریزوں کو رعایت دیتے وقت اس کے مکروفریب کو نہ

سمجھ سکے، جس کی وجہ نہ صرف مغلوں کو اپنی حکومت کھونی پڑی بلکہ حقیقی معنوں میں صفحہ ہستی سے بھی مٹ جانا پڑا۔

انگریز حکومت کے مظالم

ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ دوم کی پیدائش دہلی میں 24 اکتوبر 1775ء کو ہوئی تھی۔اپنے والد اکبر شاہ دوم کی موت کے بعد 28 ستمبر 1837ء کو دلی کے بادشاہ بنائے گئے۔بہادر شاہ ظفر خاندان مغلیہ کے آخری بادشاہ تھے بلکہ وہ اردو کے ایک بہترین ومایہ ناز شاعر بھی تھے۔ان کے دل ودماغ میں ہندوستان، ہندوستانی عوام اور یہاں کی گنگا جمنی تہذیب بسی ہوئی تھی۔ان کا سلسلہ نسب گیارہویں پشت میں شہنشاہ بابر سے ملتا ہے۔ان کی ماں لال بائی ہندو راجپوت خاندان سے تھیں۔1857 میں جب ہندوستان کی آزادی کی چنگاری بھڑکی تو تمام باغی فوجیوں 'راجہ پرجا' نے انہیں ہندوستان کا بادشاہ تصور کیا اور ان کی قیادت میں انگریزوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔انگریزوں کے خلاف ہندوستانی فوجیوں کی بغاوت کو دیکھ کر بہادر شاہ ظفر کا غصہ بھی پھوٹ پڑا اور انہوں نے انگریزوں کو ہندوستان سے کھدیڑنے کا اعلان کردیا۔ہندوستانیوں نے دلی اور ملک کے دیگر حصوں میں انگریزوں سے سخت مقابلہ کرکے شکست دی۔لیکن یہ ابتدائی کامیابی تھی، چونکہ یہ جنگ آزادی منظّم نہیں تھی۔اس لئے انگریزوں کو تمام جگہ وقفے وقفے سے مجاہدین آزادی سے نمٹنے کا موقع ملا۔اس کے علاوہ انگریزوں کو ٹیلی گراف سروس سے بھی کافی فائدہ پہنچا۔انہوں نے تار پیغام کے ذریعہ تمام مقامات پر انگریزوں کو خبردار کردیا تھا۔جس کی وجہ سے ملک بھر میں پھیلی آزادی کی تحریک ناکام ہوگئی تھی۔دہلی کی فتح کے بعد انگریز فوجوں نے شہری آبادی سے خوف ناک انتقام لیا۔لوگوں کو

بے دریغ قتل کیا گیا۔سینکڑوں کو پھانسی دی گئی۔ ہزاروں نفوس گولیوں سے بھون ڈالا گیا۔ان میں مجرم بھی تھے اور بے گناہ بھی۔مسلمان بھی تلوار کے گھاٹ اتادیئے گئے اور ہندو بھی۔ جنرل نکلسن نے انگریز فوجوں کی مدد سے تقریباً چار مہینے تک دہلی کا محاصرہ کئے رکھا۔14 ستمبر کو کشمیری دروازہ توڑ دیا گیا۔ جنرل نکلسن اس لڑائی میں مارا گیا،مگر انگریز اور سکھ فوجوں نے دہلی پر قبضہ کر کے بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے رنگون بھیج دیا۔انگریزی فوج کے سکھ سپاہیوں نے قتل وغارت میں فرقہ وارانہ رنگ بھر دیا۔ مسلمان چن چن کر قتل کئے گئے۔ بہت سے مقتدر اور متمول مسلمانوں کی جائیدادیں تباہ ہوگئیں۔وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہوگئے۔ان ہولناک مظالم کا اعادہ ان مقامات پر بھی کیا گیا جہاں پہلے مرحلے میں آزادی کی جنگ کی آگ بھڑکی تھی۔

بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں کو شہید کر دیا

ابتدائی نتائج ہندستان کے حق میں تھے لیکن بعد میں انگریزوں کے مکروفریب کی وجہ سے اس آزادی کا رخ بدل گیا اور انگریز بغاوت کو دبانے میں کامیاب ہوگئے۔ بہادر شاہ ظفر نے ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لی،لیکن اپنوں کی غداری کی وجہ سے میجر ہڈسن نے انہیں ان کے بیٹے مرزا مغل،خضر سلطان اور پوتے ابوبکر کے ساتھ پکڑ لیا۔انگریزوں نے ظلم کی تمام حدیں پار کر دیں۔ جب بہادر شاہ ظفر کو بھوک لگی تو انگریزوں نے ان کے سامنے تھالی میں سجا کر ان کے بیٹیوں کے سر رکھ دیئے۔ انہوں نے انگریزوں کو جواب دیا کہ 'ہندوستان کے بیٹے ملک کیلئے سر قربان کر کے اپنے باپ کے پاس اسی انداز میں آیا کرتے ہیں'۔آزادی کیلئے ہوئی بغاوت کو مکمل طور پر ختم کرنے کے مقصد سے انگریزوں نے آخری مغل بادشاہ کو ملک سے جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا۔کہا جاتا ہے کہ کیپٹن ہڈسن نے بہادر شاہ ظفر کو صدمہ پہنچانے کی

غرض سے ان کی اولاد کو قتل کیا تھا لیکن بوڑھے باپ نے بیٹوں کی لاشیں دیکھیں تو وہ اور جوش میں آ گئے اور مندرجہ بالا جملہ ادا کیا۔

بہادر شاہ ظفر کی آخری آرام گاہ

بہادر شاہ ظفر کو ہر وقت ہندوستان کی فکر رہی۔ان کی آخری خواہش تھی کہ وہ اپنی زندگی کی آخری سانس ہندوستان میں ہی لیں اور وہیں انہیں دفن کیا جائے لیکن ایسا نہیں ہو پایا۔ ملک سے انگریزوں کو بھگانے کا خواب لئے سات نومبر 1862 کو 87 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔انہیں رنگون میں شویڈاگون پیگوڈا کے نزدیک دفن کیا گیا۔ ان کے دفن کی جگہ کو اب بہادر شاہ ظفر درگاہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔لوگوں کے دل میں ان کے لئے کتنا احترام تھا،اس کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہندوستان سمیت کئی جگہ سڑکوں کا نام ان کے نام پر رکھا گیا ہے۔ پاکستان کے لاہور شہر میں بھی ان کے نام پر ایک سڑک کا نام رکھا گیا ہے۔ بنگلہ دیش کے اولڈ ڈھاکہ شہر میں واقع وکٹوریہ پارک کا نام بدل کر بہادر شاہ ظفر پارک کر دیا گیا ہے۔ ہندوستان میں ایک روڈ کا نام بہادر شاہ ظفر مارگ ہے۔اس کے علاوہ کوئی بھی چیز ان کے نام منسوب نہیں کی گئی ہے اور نہ ہی کسی ادارے کا نام اس مجاہد آزادی کے نام پر رکھا گیا ہے۔

بہادر شاہ ظفر کی اولاد کے ساتھ ناانصافی

اس درمیان ہوئی ثقافتی اور سیاسی تبدیلیوں نے ہندوستانی سماج کا چہرہ پوری طرح بدل دیا اور ان تبدیلیوں کے درمیان بہادر شاہ ظفر کے وارثوں کی زندگی بھی مشکلات سے بھری رہی۔ برطانوی حکومت کے دوران ان کا سب کچھ لٹ گیا اور

آزاد ہندوستان میں آج کے یہ مغل حیدر آباد میں کرائے کے مکان میں رہ رہے ہیں۔ جب کہ انگریزوں کا ساتھ دینے والے رجواڑے ،نواب، حکمراں عالیشان محلوں میں رہ رہے ہیں ۔مغلوں کو تمام جائداد سے بے دخل کر دیا گیا جب کہ انگریزوں کا ساتھ دینے والوں کا قبضہ اپنی جائداد پر برقرار ہے۔

شاہ کی اولاد کی کسمپرسی

بیگم لیلیٰ ام ہانی اوران کے بڑے بیٹے ضیاء الدین طوسی کا کہنا ہے: ''حکومت عجائب ،مقبرہ اور جانوروں کی ختم ہونے والی نسلوں کی فکر تو کرتی ہے لیکن زندہ جاوید مغل بادشاہ کے وارثوں کی اسے کوئی فکر نہیں ہے''۔ بہادر شاہ ظفر کے 22 بیٹوں میں سے ایک کے پوتے مرزا عزیز کی پیدائش حیدر آباد میں ہوئی اور لیلیٰ ام ہانی انہی مرزا عزیز کی بیٹی ہیں۔انہیں اپنے بزرگوں پر ناز ہے لیکن انہیں دکھ صرف اس بات کا ہے کہ انہیں اپنی شناخت خود لوگوں کو بتانی پڑتی ہے۔اسی طرح کلکتہ میں بہادر شاہ ظفر کی اولاد آج چائے فروخت کر کے اپنی گزر اوقات کر رہی ہیں اور وہ کولکاتا کے ایک جھگی بستی میں رہتی ہیں۔ان کے پڑ پوتے کی بہو سلطانہ بیگم کو محض چار سو روپے پنشن ملتی ہے۔سلطانہ بیگم ان دنوں کو یاد کرتی ہیں جب انکا نکاح مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے پڑ پوتے مرزا بدر بخت سے 1965 میں ہوا تھا۔ مرزا بدر بخت بہادر شاہ ظفر کے چھوٹے بیٹے جمشید بخت کے بیٹے تھے اوران کی ماں کا نام نادرہ زمانی بیگم تھا۔سلطانہ بیگم کا جب نکاح ہوا تھا تو انکی عمر صرف 13 برس کی تھی اور بدر تقریباً 45 سال کے تھے۔ سلطانہ بیگم کے مطابق آج واقعی انکی شاہی مغل ورثات ماضی کی بات ہو چکی ہے۔ آخری مغل بادشاہ کے وارثین کا کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزارنا جہاں حکومت کی عدم توجہی کو ظاہر کرتا ہے، وہیں مسلمان صنعت کاروں، تاجروں اور صاحب ثروت

کے لئے بھی غیرت کی بات ہے کہ ان میں سے کسی کو توفیق نہیں ہوئی کہ وہ ان خاندانوں کو اس بدتر زندگی سے نکالنے میں مدد کریں۔

شاہ ظفر کی ہندوستان سے محبت

بہادر شاہ ظفر ہندوستان، ہندوستانی عوام اور خاص طور پر دہلی والوں کے لئے کس قدر بے چین رہتے تھے،اس کا اندازہ اس خط سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے اپنی بیٹی کلثوم زمانی کو رنگون سے لکھا تھا۔

عزیزی بیٹی! تم نے اپنے قیدی باپ کو خط بھیجا۔خط کیا تھا، میری جان، آنسو نامہ تھا۔ جواں بخت (بیٹے) نے پڑھ کر سنایا۔ایک دفعہ سنا، جی نہ بھرا، پھر کہا، بیٹا... پھر سنانا... پھر سنا... وہ بھی رویا.... میری آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ کہا ،بابا ایک دفعہ اور پڑھو، کیا لکھوں بیٹی کہ مجھ پر تمہارے خط کا کیا اثر پڑا۔تین دفعہ سننے کے بعد بھی دل کو قرار نہیں آیا۔ سچ کہتی ہو میری جان ، دلی والے مجھ کو روتے ہوں گے ۔تو کیا یہ نہیں جانتے کہ میں بھی ان کو روتا ہوں۔ میں تو زندہ بیٹھا ہوں۔ وہ تو بغیر آئی موت مر گئے۔ کتنوں کے باپ، کتنوں کے بیٹے، کتنوں کے بھائی پھانسیوں پر چڑھ گئے، کتنے بچے یتیم ہو گئے، کتنی عورتیں بیوہ ہو گئیں گھر لٹ گئے اور ان پر گدھوں کے ہل چل گئے، دہلی میں جب میرا مقدمہ ہو رہا تھا، اسی زمانے میں تباہی اور بربادی کے قصے سنے تھے۔ میرے یہاں آجانے کے بعد خبر نہیں اور کیا کیا آفت شہر والوں پر برپا ہوئی ہو۔ یہ سب میرے اعمال کا نتیجہ تھا۔ سپاہیوں نے بھی غضب کیا تھا۔ بھلا عورتوں اور بچوں کو مارنا کس مذہب میں آتا ہے۔اب روئے یا ہنسے کوئی فائدہ نہیں۔ اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے دل میں ہندوستان کے لئے کتنی تڑپ تھی اور شہر والوں کے لئے کس قدر فکر مند تھے۔جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے دوران بھی ان کا دل ہندوستان کے لئے ہی دھڑکتا تھا۔

سور کی چربی کے کارتوس

یوں تو ہندوستان کی جنگ آزادی کا آغاز 1857 میں بنگال میں ڈمڈم اور بارک پورے کے مقامات پر ہوا تھا، جہاں دیسی سپاہیوں نے ان کارتوسوں کے استعمال سے انکار کر دیا جن میں ان کے خیال کے مطابق سور اور گائے کی چربی لگی ہوئی تھی۔ انگریزی حکومت نے ان سپاہیوں کو غیر مسلح کر کے فوجی ملازمت سے برخاست کر دیا۔ لکھنو میں بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ برخاست شدہ سپاہی ملک میں پھیل گئے اور فوجوں کو انگریزوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنے لگے۔ 9 مئی 1857 کو میرٹھ میں ایک رجمنٹ کے سپاہیوں کو دس سال قید با مشقت کی سزا دی گئی۔ جس طریقے سے یہ حکم سنایا گیا وہ بھی تہذیب سے گرا ہوا تھا۔ دیسی سپاہیوں نے انگریز افسروں کو ہلاک کر کے ان قیدیوں کو آزاد کرا لیا اور میرٹھ سے دہلی کی طرف کوچ کرنے لگے۔ میرٹھ کے سپاہیوں کی دہلی میں آمد سے دہلی کی فوجیں بھی بغاوت پر آمادہ ہو گئیں۔ دہلی کے مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا گیا اور متفقہ طور پر بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اس اعلان کے بعد بغاوت کی آگ دور دور تک پھیل گئی۔ یہ ہندوستانیوں کی انگریز کے خلاف پہلی آزادی کی مسلح جنگ تھی۔ انگریزوں نے اس جنگ کو غدر کا نام دیا۔ عموماً اس کے دو سبب بیان کئے جاتے ہیں۔ اولاً یہ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے تمام صوبے اور کئی ریاستیں یکے بعد دیگرے اپنی حکومت میں شامل کر لی تھیں۔ جس کی وجہ سے ہندوستانیوں کے دل میں کمپنی کے متعلق شکوک وشبہات پیدا ہو گئے۔ دوم یہ کہ ان دنوں جو کارتوس فوجیوں کو دیئے جاتے تھے۔ وہ عام خیال کے مطابق سور اور گائے کی چربی سے آلودہ تھے۔ اور انہیں بندقوں میں ڈالنے سے بیشتر دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا۔ ہندو اور مسلمان فوجی سپاہیوں نے اسے مذہب کے منافی

سمجھا اور ان میں کھلبلی مچ گئی۔ جن سپاہیوں نے ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا ان کی فوجی وردیاں اتار کر انہیں بیڑیاں پہنا دی گئیں۔ ان قیدیوں میں بہت سے ایسے تھے جنہوں نے انگریزوں کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں دی تھیں۔ اس وقت بہادر شاہ ظفر نے فوجیوں کا حوصلہ بڑھانے کیلئے یہ شعر کہا تھا:

غازیوں میں بو رہے گی جب تلک ایمان کی
تخت لندن تک چلے گی تیغ ہندوستان کی

ہائے افسوس صد افسوس

ہندوستان میں بیشتر مجاہدین آزادی کی یادگاریں تعمیر کی گئی ہیں لیکن ہندوستان کی آزادی کی داغ بیل رکھنے اور تمام قوموں میں قوم پرستی اور وطن سے محبت کا صور پھونکنے والا شہنشاہ آج اپنے آبا و اجداد کے بنائے ہوئے قلعوں، باغات اور دیگر قابل دید عمارت میں اپنی موجودگی کے حق سے بھی محروم ہے۔ آج ہندوستان کو آزاد ہوئے 64 سال سے زائد ہو گئے لیکن حکومت نے اس سلسلے میں آج تک کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ ملک کیلئے ان کی قربانی یونہی رائیگاں چلی گئی۔ اگر وہ چاہتے تو انگریزوں سے سمجھوتہ کر کے ہمیشہ ہمیش کے لئے اپنی شہنشاہیت بچا سکتے تھے۔ اور دیگر راجاؤں کی طرح اپنی جائیداد پر قابض رہ سکتے تھے۔

جس طرح آج تک یہاں کے انگریزوں کے وفادار سابق رجواڑوں کے محلات اور قلعے ہیں، غیر منقولہ جائدادیں ہیں جس کی بنیاد پر وہ آج بھی عیش کی زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن وہ ان تمام چیزوں کو ٹھوکر مار کر میدان جنگ میں نکل پڑے اور فوجیوں کی قیادت کی اور بالآخر وہ اپنی جائداد سے محروم ہوئے بلکہ اپنے دو بیٹوں اور پوتوں کی قربانی بھی دی۔

☆☆☆

شیر میسور اور عظیم مجاہد آزادی ٹیپو سلطان رحؒ [۸]

ہندوستان نے آزادی کے لئے لڑنے اور مرنے والوں کی ایک بڑی تعداد کو جنم دیا لیکن ان میں کوئی بھی ایسا شیر نہ تھا جو ٹیپو شہید کی عظمت کا حامل ہو۔ وہ واقعی شیر تھے اور شیروں سے آپ کو بہت چاہت تھی۔ وہ اپنا لباس بھی شیر کی کھال جیسا بنواتے تھے۔ اور بہت سے شیریوں کو پال رکھا تھا۔ ایک بار شیر کے ساتھ لڑائی کرتے ہوئے اس کا بری طرح سے خاتمہ کر دیا اور وہ شیر میسور بن گئے۔

فضل ربانی اور ٹیپو مستان ولی کی دعاؤں کا اثر تھا کہ نواب حیدر علی کے گھر آج سے تقریباً تین سو سال پہلے سر زمین ہند دکن کی ریاست میسور میں جو آج کرناٹک کے نام سے معروف ہے۔ میسور کے فتح ہلی گاؤں میں سن 1749ء کو ایک آفتاب حریت طلوع ہوا جس کا نام حیدر علی نے ولی ٹیپو سلطان کی یاد میں ٹیپو سلطان رکھا۔ آپ کی پیدائش سے گھر کا ماحول ہی بدل گیا۔ محل میں خوشیاں منائی جانے لگیں۔ یتیموں اور بیواؤں کو مالا مال کیا گیا ہر ایک کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں چھائی ہوئی تھی۔ ہر جگہ خوشی کا ماحول تھا۔ ٹیپو سلطان کی پرورش اعلیٰ معیار پر ہونے لگی۔ ابتدائی تعلیم دینی علماء اور مولویوں کی نگرانی میں ہوئی۔ بعد ازاں دس گیارہ سال کی عمر میں جن کی

۸ منیر احمد ٹمکور، سالار، 4/مئی–2010ء

تعلیم غازی خاں جو جواب حیدر علی کے دربار میں مشہور سپہ سالار تھا۔ ان کی زیر نگرانی میں ہوئی۔ ٹیپو سلطان بچپن ہی سے ذہین، بہادر اور رحم دل تھے۔ سلطان نو عمر ہی میں تیغ کے جوہر دکھانے لگے۔ پہلی مرتبہ آپ نے پالیکا کے خلاف لڑائی میں جو جرأت دکھائی جسے دیکھ کر تجربہ کار جنرل بھی عش عش کر اٹھے۔ حیدر علی نے اس معرکہ سے خوش ہو کر انہیں دو سو سواروں کا کمانڈر مقرر کیا اور اسطرح آپ کی جنگ کا آغاز ہوا۔

ٹیپو سلطان نے پہلی بار جنگ میں حصہ لیا

سلطان نے اپنے والد کے ہمراہ پہلی مرتبہ جنگ میں حصہ لیا تھا۔ اس وقت آپ کی عمر 16 یا 17 سال تھی یہ جنگ ایک چھوٹی سی سلطنت بالما کے خلاف تھی۔ اس جنگ میں ٹیپو سلطان بھی جنگ کا تجربہ حاصل کرنے کیلئے شامل تھے۔ حیدر علی نے ٹیپو سلطان کو غازی خان کے سپرد کر کے کچھ سپاہیوں کو لے کر بالما پر حملہ کیا۔ بہت وقت گذر جانے کے بعد جب حیدر علی کی کوئی خیر و عافیت معلوم نہیں ہوئی تو غازی خاں کو تشویش ہوئی کہ حیدر علی کسی پریشانی میں تو نہیں آ گئے۔ اور وہ بھی ٹیپو سلطان کو تاکید کر کے کچھ سپاہیوں کو لے کر میدان جنگ کی طرف چل پڑے۔ اس کے بعد غازی خاں نے بھی کوئی پیغام نہیں بھیجا تو ٹیپو سلطان باقی سپاہیوں کو لے کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ راستہ میں کچھ خیمے دکھائی پڑے۔ پتہ لگانے پر معلوم ہوا کہ ان خیموں میں بالما کے راجہ کی بیوی اور بچے محفوظ ہیں۔ ٹیپو سلطان ان سے بڑی رحم دلی سے پیش آئے اور خود ان کی حفاظت کرنے لگے۔ یہ خبر جب بالما کے راجہ کو معلوم ہوئی کے سلطان نے خیمے پر قبضہ کر لیا ہے تو اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ کچھ دیر بعد حیدر علی کا سپاہی مقبول خاں آیا اور ٹیپو کو فتح کی مبارکباد پیش کر کے ان خیموں سے بالما کے عورتوں کو کھینچ کر باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ سلطان نے بہت روکا

لیکن یہ درندہ نہ مانا تو ٹیپو کو جلال آ گیا اور انہوں نے تلوار نکالی اور مقبول خاں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مقبول خاں اپنی فوج کا ایک اہم رکن تھا پھر بھی عورتوں کی بے حرمتی کرنے کی وجہ سے سلطان نے اسے موت کی نیند سلا دیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مخالفین اور دشمنوں کے خاندان کی عورتوں کو بھی کتنی عزت کرتے تھے۔

ٹیپو سلطان کے دور حکومت کی سب سے نمایاں بات یہ تھی کہ سلطنت خداداد میں ہندو مسلم میں کبھی کوئی تفرقہ نہ ہوا۔ سلطان کی ہندو رعایا ان کے گن گاتی تھی، ہندوؤں کو ہر طرح کی آزادی حاصل تھی اور ان کے حقوق کا پورا تحفظ کیا جاتا تھا۔ ٹیپو سلطان برصغیر کے حکمرانوں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ متقی اور پرہیزگار تھے۔ ان کیلئے عالم اسلام کیلئے بے پناہ درد تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ تمام مسلم ملکوں کے ساتھ اچھے برادرانہ تعلقات قائم کرے۔ وہ عالم اسلام کے اتحاد کے قائل تھے۔ سلطنت خداداد میسور کو ایک مثالی ریاست بنانے کے لئے کئی منصوبے تیار کئے اور بہت سے منصوبوں پر عمل بھی شروع کیا۔

ٹیپو سلطان کی دہشت اور رعب

عہد سلطنت خداداد (1799-1761ء) اپنے انتشار جنگ وجدال اور نامساعد حالات کے باوجود مختلف جدید علوم وفنون کی ترویج واشاعت اور تہذیب وتمدن کی نشوونما کے اعتبار سے حیرت انگیز طور پر انتہائی روشن اور تابناک رہا ہے۔ یہ 39 سال پر مشتمل ہے۔ مختصر دور حکومت (نواب حیدر علی خاں 21 سال اور حضرت ٹیپو سلطان کے 17 سال) جو جدید سائنسی اور تکنیکی علوم وفنون سے مالا مال تھا۔ یہ وہ دور تھا جب انگریزوں کے خونی پنجے ہندوستان کی دولت پر کالے بادل کی طرح چھا رہے تھے۔ وہ اس سونے کی چڑیا کو یورپ کے قبضے میں لے کر غلام دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ

جانتے تھے کہ سلطان کی حیات میں مکمل ہندوستان کا قبضہ ناممکن ہے۔ کیونکہ ٹیپو وہ شیر تھے جس کی دھاڑیں سن کر انگریزوں کے کلیجے کانپ جاتے اور انگریز مائیں اپنے بچوں کو یہ کہہ کر سلایا کرتی تھی کہ سو جا بیٹا ورنہ ٹیپو آ جائے گا۔

ٹیپو آزادی کے عاشق تھے ان کے دل میں آزادی کی تڑپ تھی۔ ان کی شیر کی طرح چمکدار آنکھیں دیکھ رہی تھی کے انگریز ہندوستانی حکومتوں کو تباہ و برباد کر کے اپنا سکہ بٹھانا چاہتے ہیں۔ وہ خود آزاد تھے اور ہندوستانیوں کو آزاد دیکھنا پسند کرتے تھے۔ وہ ان فرنگیوں کو بھگانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ انگریز بہت چالاک تھے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لئے اس شیر کو بے بس وہ بیدم کرنے کی جدوجہد میں لگے رہے۔ نظام اور مرہٹوں کو اپنی گندے سازشوں میں مبتلا کر کے سلطان سے الگ کر دیا مگر ٹیپو سلطان نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ (ملی اتحاد، جولائی ۲۰۱۲ء)

دریائے کاویری کا تاریخی بند

کاشت کاروں کی حالت بہتر بنانے اور زراعت کو ترقی دینے کے لئے شیر میسور کا بے مثال کارنامہ:

میسور کے سلطان ٹیپو کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے برصغیر میں حریت کی اولین شمع روشن کی تھی۔ اسے دوام بخشنے کے لئے انہوں نے اپنی جان کی بازی لگانے سے بھی گریز نہ کیا۔ 206 برس گزر جانے کے باوجود اس شہید وطن کے لہو کی مہک سے فضا معمور اور معطر ہے۔ انہوں نے انگریز کی غلامی پر موت کو ترجیح دی اور اپنے مقولے ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے'' پر لفظ بہ لفظ عمل کر کے حمیت وغیرت، جواں مردی اور شجاعت کا ایک نیا باب رقم کیا۔ ان کی تربت پر حاضری دینے والے لوگ شہید کے جاہ وجلال کی گواہی آج بھی دیتے ہیں۔

ٹیپو سلطان کا دور حکمرانی نسبتاً مختصر یعنی سولہ سال چند ماہ رہا لیکن اس قلیل مدت میں کئی کارہائے نمایاں سرانجام دیئے گئے۔ ملکی، سیاسی، معاشی، زراعتی، فوجی، اسلحہ سازی، معاشرتی، ثقافتی اور عام انسانی زندگی میں رعایا کی فلاح و بہبود اور ملکی ترقی کے لئے انہوں نے جو اصلاحات نافذ کیں اور جو قاعدے بنائے، ان کا مفصل و مکمل بیان یہاں ممکن نہیں، بس یہ جان لیجئے کہ مختلف شعبہ جات حیات میں رفاہی، اصلاحی و فلاحی کاموں کی تعداد ستر سے زائد بنتی ہے۔

اسلحہ سازی کے میدان میں کارنامے

اسلحہ سازی کے میدان میں روایتی ہتھیاروں کی تیاری کے علاوہ دنیا میں پہلی بار راکٹ سازی کی صنعت قائم کی۔ اس لئے انہیں راکٹ سازی کا موجد قرار دیا جاتا ہے۔ سلطان ٹیپو نے محسوس کیا کہ نہ صرف تجارت بلکہ مملکت کی حفاظت کے لئے بحری طاقت کا ہونا ضروری ہے۔ اسی لئے انہوں نے ایک سو جنگی جہاز تیار کروائے۔ کاشتکاروں کی حالت بہتر بنانے اور ملک میں زراعت کو ترقی دینے کے لئے ان کا سب سے بڑا کارنامہ دریائے کاویری پر محی پشتے کی تعمیر ہے۔ اس لئے آج کے غیر مسلم مورخین بجا طور پر سلطان کو ''بند بنانے والا ٹیپو (Tipu The Dam Builder) کہتے ہیں۔ اس کارنامے کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ دریائے کاویری کے دامن میں قابل زراعت زمین کی وسعت 11500 مربع میل ہے۔ زمانہ قدیم میں دریا سے نالے کاٹ کر ان کے پانی کے ذریعے جو زمین کاشت کی جاتی تھی، اس کا رقبہ کل 180 میل تھا۔ بقیہ خشک زمین کی آبپاشی کے لئے حکومت میسور عرصے سے تجاویز سوچ رہی تھی۔ آخر 1911ء میں موجودہ بند کی تعمیر کا آغاز کیا گیا جو اب ''کرشنا راج ساگرا'' کہلاتا ہے۔ بوقت تعمیر تین مقاصد زیر نظر تھے:

۱- گرمی کے دنوں میں قلت آب کی وجہ سے برقی طاقت حاصل کرنے میں جو مشکلات درپیش ہوتی ہیں، ان کا سدباب۔ ۲- برقی طاقت جو کم و بیش ہوتی رہتی ہے اسے ایک حالت پر لانا۔ ۳- خشک زمین کا وسیع رقبہ نہروں کے ذریعہ قابل کاشت بنانا۔ یہ مشہور بند شہر سری رنگا پٹنم سے نو میل دور جانب مغرب واقع ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً پچاس مربع میل پر پھیلا ہوا ہے۔ بند 124 قدم اونچا ہے۔ اس میں 44827 ملین مکعب فٹ پانی ذخیرہ کیا جا سکتا ہے۔ جس کا ایک چوتھائی حصہ برقی روشنی پیدا کرنے کے لئے اور تین چوتھائی برائے آب پاشی رکھا جاتا ہے۔

جب موجودہ بند بنانے کے سلسلے میں کھدائی کا کام ہو رہا تھا تو ایک قدیم کتبہ ملا جس پر یہ فارسی تحریر واضح انداز میں رقم ہے:

یا فتاح

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم 20 ذی الحجہ 12ھ (پورا سن ہجری پڑھا نہیں جا سکا۔) بروز دوشنبہ علی الصباح قبل طلوع آفتاب، اچھی لگن اور نیک ساعت میں اللہ کے فضل اور اس کے حبیب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل زمیں و زماں کے خلیفہ سلطان جہاں، حضرت ٹیپو ظل اللہ (خداوند تعالیٰ ان کی سلطنت اور خلافت کو برقرار رکھے) نے کاویری ندی پر دارالسلطنت کے قریب ''محی'' نام سے پشتے کا سنگ بنیاد رکھا۔ شروع کرنا ہمارا کام اور تکمیل تک پہنچانا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جس مبارک ساعت یہ بنیاد رکھی گئی اس دن سورج، چاند، شکر (زہرہ) اور برہسپت (مشتری) چاروں کا ایک ہی برج (راس) میں مبارک قیام تھا۔ اللہ کے فضل سے یہ پشتہ تا قیامت قائم و برقرار رہے۔ اس پشتے کی تیاری میں سرکار خداداد نے جو لاکھوں روپے خرچ کئے وہ صرف اللہ ہی کی راہ میں صرف کئے گئے ہیں۔ قدیم یا جدید کاشت کے علاوہ جو کوئی

بھی اس تالاب سے آبپاشی کرے گا، وہ اس پیداوار یا رقم کا جو رعایا قانوناً سرکار میں جمع کرواتی ہے، صرف 3/4 حصہ سرکار خداداد کو دے۔ باقی ماندہ ایک چوتھائی خدا کی راہ میں معاف ہے اور جو کوئی اس پشتے (یعنی بند) سے نئی زمین میں کھیتی باڑی کرے گا۔ وہ زمین اس کی اولاد اور وارثوں کے قبضے میں نسلاً بعد نسل اس وقت تک رہے گی جب تک زمین و آسمان قائم ہیں۔ اگر کوئی شخص اس میں رکاوٹ ڈالے یا اس کار خیر میں مداخلت کرے تو وہ کمینہ خصلت اور ملعون شیطان صرف کسانوں ہی کا نہیں بلکہ تمام انسانی نسل کا دشمن سمجھا جائے گا''۔ (کتبہ سید جعفر: ترجمہ از فارسی) جب یہ کتبہ دریافت ہوا، میسور پر ہندو خاندان کی حکومت تھی تاہم اس وقت کے راجہ نے حکم دیا کہ اس کتبے کو بند کر کے مرکزی دروازے پر نمایاں انداز میں لگایا جائے۔ اس کے حکم کی تعمیل ہوئی۔

ٹیپو سلطان کی ذہانت

اس بند کی تعمیر اور اس کتبے کو دیکھتے ہوئے فطری طور پر خیال آتا ہے کہ سلطان ٹیپو کس قدر عالی دماغ تھا اور اس زمانے کے فن کار انجینئری میں کس قدر ماہر تھے۔ حکومت میسور نے جب دریائے کاویری پر بند بنانا چاہا تو اس مقصد کے لئے میسور کے انجینئروں کے علاوہ بیرون ملک سے بھی انجینئر طلب کئے گئے۔ وہ سالہا سال دریائے کاویری کا سروے کرتے رہے اور پھر اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ بند موضع بلگولا کے قریب تعمیر کیا جائے جو سرنگا پٹنم سے نو میل دور جانب مغرب واقع ہے۔

یہ کسی کے علم میں نہیں تھا کہ سلطان ٹیپو کا تعمیری ذہن اور اس کی عالی دماغی ڈیڑھ سو سال پہلے ہی اس جگہ کا انتخاب کر چکی تھی۔ یہ حسن اتفاق نہیں تھا، بلکہ قدرت چاہتی تھی کہ جس سلطان کا نام مغربی مورخین نے حد درجہ بدنام کر رکھا ہے وہ ایک بار پھر دنیا میں روشن ہو جائے۔ چنانچہ جب کھدائی ہوئی تو یہ دیکھ کر انجینئروں کی حیرت

کی انتہا نہ رہی کہ وہاں فارسی زبان میں تحریر کردہ ایک کتبہ زمیں میں گڑا ہوا ملا۔ درج بالا کتبے کی عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ سلطان ٹیپو کے دل میں رعایا پروری کا کس قدر صادق جذبہ موجود تھا۔

کیا آج دنیا کی کوئی حکومت اس سے بڑھ کر رعایا پروری، فراخدلی اور فیاضی کی مثال پیش کر سکتی ہے؟ متذکرہ بالا بند کی تعمیر کا آغاز سلطان نے کیا اور سنگ بنیاد بھی رکھا، مگر ان کی سلطنت کے سقوط کے باعث وہ تعمیر نہ ہو سکا۔ تاہم علامہ اقبالؒ نے بجا فرمایا تھا کہ شہید کی روح آج بھی میسور میں کارفرما ہے۔ بند کی تعمیر کا خیال حکومت میسور کو آیا لیکن جگہ وہی منتخب ہوئی جو سلطان نے تجویز کی تھی۔ چونکہ اس کی تعمیر مہاراجہ میسور، شری کرشنا کے عہد میں ہوئی اس لئے بند کرشنا راج ساگرا کہلاتا ہے۔ اگر تاحیثیت سے دیکھا جائے تو یہ قرین انصاف کہ میسور کے محسن سلطان کے نام پر اس کا نام ''سلطان ٹیپو بند'' رکھا جاتا۔ ایک انداز کے مطابق اس بند سے آج ڈیڑھ لاکھ زمین سیراب ہو رہی ہے۔

بند کے سنگ بنیاد کے کتبے پر خط لکھ کر عبارت کا بغور مطالعہ کرنے پر یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ آج سے دو سو برس قبل کی تعمیر کے وقت ٹیپو سلطان کو غالباً کچھ لوگوں کی مخالفت کا سامنا تھا۔ تبھی تو اول انہوں نے بند سے بنجر زمین کو آباد کرنے والوں کو لگان کا چوتھا حصہ معاف کر دیا، نیز انہیں اس زمین کے موروثی مالکانہ حقوق بھی عطا کر دیئے۔ اس کار خیر میں رکاوٹ یا مداخلت کرنے والوں کو بڑے سخت الفاظ میں تنبیہ کی اور ان کی کسانوں ہی کا نہیں بلکہ تمام نسل انسانی کا دشمن قرار دیا۔ سلطان ٹیپو کا یہ انداز فکر و عمل موجودہ حالات میں بندوں کی تعمیر کے سلسلے میں راہیں متعین کرنے میں ہمارا مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ (خالد مسعود قریشی، ہدیٰ اسلامی ڈائجسٹ، ستمبر-2012ء)

حضرت ٹیپو سلطان شہید رحمۃ اللہ کا پیغام

اٹھارویں صدی عیسوی عالم اسلام کیلئے عموماً اور مسلمانان ہند کیلئے خصوصاً زوال پذیر ثابت ہوئی۔ آفتاب کی طرح چمکتا اسلام کا ستارہ غروب ہوتے نظر آیا۔ ایک طرف مغربی عیاروں کے ہاتھ دولت عثمانیہ اگر نرغہ میں آ گئی تو دوسری طرف مغلیہ شہنشاہیت کا چراغ ٹمٹانے لگا۔ اورنگ زیب کا اٹھنا ہی تھا کہ طوائف الملوکی ہر طرف پھیل گئی۔ ایک عظیم الشان شہنشاہیت تتر بتر ہونے لگی۔ صوبے خود مختاریت کا ڈنکا بجانے لگا۔ مرہٹے آسمان عروج کا خواب دیکھنے لگے۔ سات سمندر پار سے آئے فرنگی فرعونی چال چلنے لگے۔ سازشوں کی وباء پھیلنے لگی۔ بغاوتوں کی آگ بھڑکنے لگی۔ ایسے نازک وقت پر میسور جیسی چھوٹی ریاست سے امید کی ایک لہر ابھری۔ ایک بہادر ذی ہوش، اولوالعزم و دوراندیش صاحب کمال کرناٹک کی خاک سے ابھرتا ہے۔ ہزار ہا دشوار گزار گھاٹیوں سے گذر کر ایک مضبوط ریاست قائم کرتا ہے، جس کا نام حیدر علی خان ہے۔ جہاں حیدر علی خاں بہادر کو کئی ایک بڑے بڑے کارنامے نصیب ہوئے۔ وہاں قدرت کی طرف سے ایک نادر الوجود فرزند بھی عطا ہوا جس کا نام فتح محمد ٹیپو سلطان ہے۔ یہ ایک عظیم فوق الادراک ہستی تھی جس نے تاریخ ہند پر وہ نقوش چھوڑے جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ اس کا ایک ہلکا سا نقشہ یہاں مطلوب ہے۔ عظمت کا تاج صرف ان کے سر ہی نہیں جو فتح و نصرت کے شادیانے بجاتے ہیں بلکہ انکے سر بھی جو اپنا سر دوسروں کی زندگی کیلئے کٹا دیتے ہیں، جو حق کیلئے اپنی جان دے دیتے ہیں، جو اقدار عالیہ کیلئے قربان ہو جاتے ہیں، چاہے وہ سقراط ہو، عیسیٰؑ ہو، امام حسینؓ ہو یا حلاج منصور ہو، حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ بھی اسی صف میں نمایاں ہیں۔ وہ اقدار عالیہ کیا تھے جس کیلئے ٹیپو نے اپنی جان دیدی؟ پہلا حریت آزادی۔

عشق و آزادی بہار زیست کا سامان ہے
عشق میری جان، آزادی میرا ایمان ہے
عشق پر کردوں فدا میں اپنی ساری زندگی
لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

کونسی چڑیا ہے جو پنجرہ پسند کرے گی؟ کونسا شیر ہے جو دام و قید میں خوش رہے گا؟ کونسی مچھلی ہے جو جال میں نہ تڑپے گی؟ اگر یہ حال حیوانات کا ہو تو اشرف المخلوقات، قدرت کا شاہکار، حضرت انسان جو فہم و ذکاء میں ذوق خدائی رکھتا ہے، کیا وہ غلامی کو پسند کرے گا؟ ایک بھیڑیا دوسرے بھیڑیے کو غلام نہیں بناتا، ایک ریچھ دوسرے ریچھ کو غلام نہیں بناتا۔ واہ رے حضرت انسان تو اپنی ہی جنس پر یہ ظلم کیوں ڈھاتا ہے؟ یہ مکر، یہ فریب، یہ دغا، یہ ظلم، یہ ستم، کیوں؟ کیوں؟ شہید کے ذہن میں یہ بات آئی اور کہا:

شیر اچھا ہے جسے مہلت ایک روزہ ملی
یا وہ گیدڑ جسے بخشا گیا صد سالہ خلود؟

انہوں نے سارے زمانے پر یہ راز فاش کر دیا کہ آزادی کا ایک لمحہ غلامی کی صد سالہ زندگی سے بہتر ہے- موت کو پسند کرو، غلامی کو نہیں- جان دے دو، عزت، غیرت، حریت کا سودا نہ کرو- مر جاؤ، زندگی پابہ زنجیر قبول نہ کرو- ایک بار مر جاؤ، ذلت کی بار بار موت سے باز آؤ- شاید آج افغانستان کے مجاہدین کو ٹیپو کا یہ سبق از بر یاد ہے۔

چناں بہ زی کہ مرگ تست، مرگ دوام
خدا زکردۂ خود شرمسار گردد

ایسی زندگی، ایسی زندگی بسر کرو کہ اگر تمہیں موت آئے تو تمہیں حیات جاوید نصیب ہو، اور خدائے تعالیٰ نے جو تمہیں پیدا کیا ہے وہ خود شرمندہ ہو جائے کہ میں نے کیسے بندے کو مخلوق سے محروم کر دیا ٹیپو کی عظمت اس بات میں ہے:

آخری ہچکی نے دی اللہ اکبر کی صدا
نزع کی حالت میں بھی تو نے باطل سے جنگ
تو نے کی تجدید پیمان شہید کربلا
تو نے بتلایا حفاظت جان کی ہے عذر لنگ
وہ تو یوں کہئے کہ اپنے ہی پرائے ہو گئے
مٹ گیا تھا ورنہ سطح ہند سے نقش فرنگ

شہیدؒ کا دوسرا پیغام

شہید کا دوسرا پیغام یہ ہے کہ صرف مرد مجاہد ہی نہیں بلکہ قوت تخلیق و ذوق جمال کا پیکر بھی بن- یاد رکھ قدرت کی طرف سے تجھے کیا کیا انعامات بخشے گئے ہیں- ذہن کی آب و تاب روشنی، قلب سلیم میں ضمیر پاک کی تجلی، روح میں لطافت، فکر و سوچ میں ندرت و جدت، ان سب کو کام میں لا کر تعمیر حیات و تسخیر کائنات کے امر پر اتر آ- شہید نے صرف یہ سبق ہی نہیں دیا بلکہ ان کا نمونہ بھی پیش کر دیا کس نے راکٹ کی ابتداء کی؟ کس نے دریائے کاویری پر بند باندھ کر لاکھوں ایکڑ کی آب پاشی کا منصوبہ سوچا تھا؟ کس نے بحری بیڑہ وجود میں لایا تھا؟ کس نے کوآپریٹیو بینک کا آغاز کیا تھا؟ کس نے تجارت کی منڈیاں کرہ ارض کے مختلف مقامات میں کھولی تھیں؟ کس نے لوہے کے کارخانے، شکر کے کارخانے، ریشم کی صنعت، موتی نکالنے کی حکمت، زراعت کو فروغ، تجارت کو ترقی، اور صنعت کو عروج میں لا کر اپنی

ریاست کو بہشت کا نمونہ بنایا تھا؟ کس نے شہروں کے نام، وزن کے باٹ، پیمانے کے آلے، مہینوں و سالوں کے نام اور ہندسے لکھنے کا طریقہ بدل دیا؟ کس نے نئی تقویم جاری کی؟ کس نے مولودی قائم کی؟ کس نے امراض کے نئے نسخے سوچے؟ کس نے فرانس کے نپولین، ترکی کے سلطان، ایران کے شہزادے اور افغانستان کے زمان شاہ سے رابطہ استوار کیا تھا؟ کس نے سب سے پہلے اردو کا اخبار جاری کیا؟ سلطان کے ایجادات اختراعات، انکشافات، شجاعت، صداقت، عدالت کی تشریح کیلئے ایک دفتر بھی کافی نہیں- ایسی ہستی برصغیر ہند میں کہیں نہیں دیکھی گئی تھی۔ شہید کا تیسرا پیغام صرف حب وطن ہی نہیں، حب اسلام بھی ہے- یہ جلیل القدر انسان قدرت کی طرف سے ملت اسلامیہ کی کتاب زندگی کے اوراق پریشاں کی شیرازہ بندی کا عزم لے کر آیا تھا- یہ اسی مقصد کیلئے زندہ رہا اور اسی مقصد کیلئے اپنی جان دے دی- اس نے بتایا کہ حب وطن و حب اسلام دونوں ایک مومن کے سینہ میں بہ یک وقت جمع ہو سکتے ہیں- ایک مسلمان پکا مسلمان ہو کر بھی پکا محبّ وطن ہو سکتا ہے- اس نے وطن کی خاطر لخت جگر بچوں کو یرغمال کے طور پر عیار فرعونوں کے ہاتھ ہی نہیں دیا بلکہ ملک و ملت کی خاطر اپنی جان عزیز بھی قربان کر کے، خاک وطن پر اپنا مقدس خون بہا کر اسکے ذروں کو منور بھی کر دیا-

اس کے اٹھتے ہی مسلمانوں کا گھر بیٹھ گیا
تھا قیامت کا قیام اور قیامت کا قیود

سائنسی دنیا کو ٹیپو سلطان کی دین

ٹیپو سلطان وہ حکمراں ہیں جنہوں نے انتہائی کم عمری میں شہادت پائی صرف 49 سال کی عمر میں 19 سال حکومت کی- اپنے دور حکومت میں جنوبی ہند کی تمام

حکومتوں کو شکست دی۔ تمام راجاؤں، جاگیداروں کو مکمل طور سے میدان جنگ میں ہرایا۔ علاوہ اس کے اپنے دور کی ہندوستان کی تمام بڑی طاقتوں یعنی نظام اور مرہٹوں کو بھی عبرتناک طور سے شکست دی۔ سب سے اہم ترین بات 1757ء کی پلاسی کی جنگ میں نواب سراج الدولہ کی پچاس ہزار کی فوج کو انگریزوں نے صرف تین ہزار سپاہیوں کی مدد سے تباہ کر دیا تھا اور بنگال پر قبضہ کے بعد دھیرے دھیرے ایک ایک کر کے ہندوستان کے صوبے نکلتے جا رہے تھے۔ اور ملک میں اپنی پوزیشن بہت ہی مضبوط بنا چکے تھے۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام عالم اسلام کو نہایت آہستگی سے نکلتے جا رہے تھے۔ سب طرف یہ مشہور تھا کہ انگریزوں کو شکست دینا ناممکن ہے ایسی ایک عالمی قوت کو ٹیپو سلطان نے میسور کی اولین جنگوں میں ایسی شکست دی کہ انگریز اپنے ہی 1782ء میں انہیں ٹیپو سلطان کی شرائط پر منگلور صلح قبول کرنی پڑی۔ زخم چاٹنے پر مجبور ہو گئے۔ جنوبی ہند سے تقریباً ان کا خاتمہ ہو گیا اور جنوبی ہند پر ٹیپو سلطان کی حاکمیت قائم ہو گئی۔ ان کی فتح کے نشان دریائے کرشنا سے لے کر مدراس، منگلور اور کیرلا کے آخری کناروں تک لہرانے لگے۔ آخر کار انگریزوں نے مراہٹوں، حیدرآباد کے نظام اور ٹراونکور کے مہاراجہ کی متحدہ افواج کے ساتھ ٹیپو سلطان کے علاقوں پر حملہ کیا۔ اس کے باوجود انہیں اپنی کامیابی کا یقین نہیں تھا۔ جس طرح بنگال پر قبضہ کے لئے میر جعفر جیسے غدار کو خریدا تھا تو یہاں بھی ٹیپو سلطان کے اہم ترین وزیر میر جعفر کے ساتھ دوسرے بے شمار غداروں کو خرید لیا۔ اگر چہ غدار نہ ہوتے تو شاید ساری متحدہ افواج بھی ٹیپو سلطان کو شکست دینے میں ناکام ہو جاتیں۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ انگریزوں نے ٹیپو سلطان پر حملوں کی شدت پیدا کرنے میں بہت جلدی کی۔ انہیں دم لینے نہیں دیا۔ دھوکہ بازی، غداری، مقامی طاقتوں کی خریداری، انہیں لالچ کے ذریعہ اپنے ساتھ ملا لینے کے علاوہ پروپیگنڈہ بھی شدت کے ساتھ دنیا بھر میں

جاری رہا۔ ہندوستان کے کسی بھی حکمران کو شکست دینے میں انگریزوں کو اس قدر مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا جس قدر کہ ٹیپو سلطان کے ساتھ جنگوں میں انہیں پیش آئیں۔ وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے انگریز ٹیپو سلطان کا خاتمہ جلد از جلد چاہتے تھے۔ ہمارے مضامین کے سلسلے کا خصوصی موضوع یہی ہے۔

بہترین ہتھیاروں کی تیاری

ٹیپو سلطان کئی میدانوں میں اپنے عہد کے تمام سلاطین سے آگے تھے۔ یقیناً انگریزوں کو بھی انہوں نے کافی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ میدان جنگ میں جیت اسی کی ہوتی ہے جس کے ہتھیار اعلیٰ درجہ کے ہوں جس کی فوج بہترین اور تربیت یافتہ ہو، جوش اور جذبہ سے بھرپور ہو، انہوں نے اس میدان میں ریسرچ کی جانب خصوصی توجہ دی ان کا مقصد ایسے ہتھیار تیار کرنا تھا جو کہ سب سے بہتر و اعلیٰ ہوں اس میں وہ بہت کامیاب و کامران رہے۔

راکٹوں کے موجد

ٹیپو سلطان کو Solid fue Rocket Technology یا میزائل کے فوجی استعمال کے اولین معمار اور موجد مانا جاتا ہے۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے ایک نئی فوجی حکمت تیار کی۔ وہ تھی راکٹ برگیڈ کے ذریعہ فوجوں پر حملہ کرنا۔ ٹیپو سلطان نے فوجی حکمت عملی اور اصولوں کے بارے میں فتوح المجاہدین تحریر کی۔ اس کے مطابق ہر ایک فوجی برگیڈر میں 200 راکٹ بردار فوجی تعینات کئے گئے۔ برگیڈ کو ''کوشون'' نام دیا۔ میسوری افواج میں ایسے سولہ تا چوبیس ''کوشون'' ہر وقت تیار رہا کرتے تھے وہ مقامات جہاں پر راکٹ اور آگ اگلنے والے میزائل تیار ہوتے تھے انہیں ''تارا

منڈل پیٹ'' کہا جاتا تھا۔حقیقت یہ ہے کہ ٹیپوسلطان کی شہادت کے بعد اس راکٹ ٹکنالوجی کو انگریز چرا کر یوروپ لے گئے ویسے ساری دنیا راکٹ ٹکنالوجی کا موجد ٹیپوسلطان کو ہی مانتی ہے۔لوہے سے تیار شدہ راکٹ آرٹلری کے ذریعہ 1792 میں سری رنگا پٹنم کی جنگ میں ٹیپوسلطان انگریز افواج کو شکست دینے میں کامیاب رہے۔فتح المجاہدین فوجوں کے لئے رہنما اصولوں کی کتاب ہے، جسے ٹیپوسلطان نے لکھا۔میسور کی تیسری جنگ کو جو کہ میسور اور انگریز افواج کے درمیان ہوئی تھی اس جنگ کو دنیا کی جنگوں کی تاریخ میں جدید تکنالوجی کی ایجادات اور ان کے استعمال کی ابتداء مانا جاتا ہے۔

فوجیوں کی خصوصی ٹریننگ

ٹیپوسلطان نے ''فتح المجاہدین'' کی اس فوجی رہنما احکامات والی کتاب کو فوج کے تمام افسروں کے درمیان تقسیم کیا۔راکٹوں کے چلانے والوں کو خصوصی تربیت دی گئی۔ راکٹ کے قطر (Diameter) کے مطابق اس کو ایک خصوصی Curve کے حساب سے داغا جانا ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ صحیح نشانے پر مار کر سکے۔کئی یک راکٹ لانچر پہیوں پر لدے ہوتے ان سے بیک وقت پانچ تا دس راکٹ فائر کئے جاسکتے تھے۔اس کو Multiple Rocket Lancher کہا جاتا ہے۔ یہ دیکھنے میں موسیقی کے ایک آلے کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ٹیپوسلطان نے فتح المجاہدین میں اس راکٹ کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے جس کے ذریعہ ایک ساتھ 10 راکٹ دشمنوں کی افواج پر فائر کئے جاتے تھے۔نشانہ سادھنے والے بمبونما سلاخوں کے سرے پر یہ راکٹ لگائے جاتے کچھ راکٹوں میں بلیڈ جیسی دھار وار اشیاء بارود کے ساتھ بھری ہوتیں۔ کچھ راکٹ ایسے بھی ہوتے جو ہوا میں ہی وار کرتے ۔ حالانکہ انگریز افواج پر

ٹیپوسلطان راکٹوں سے حملہ کرتے لیکن 1792ء کی جنگ میں خصوصی طور پر راکٹوں کا اعلیٰ اور بہتر پیمانے پر استعمال کیا تھا جس کی وجہ سے انگریز یہ جنگ بری طرح ہار گئے تھے۔ ٹیپو کی راکٹ آرٹلری نے جب بہ یک وقت 200 ترقی یافتہ راکٹوں سے انگریزوں پر حملہ کیا تو یہ پہلے کی بہ نسبت کافی ترقی یافتہ اور مہلک راکٹوں کی برسات کی انگریز افواج تاب نہ لاسکیں۔ وہ ٹوٹ کر بکھر گئیں اور بھاگ کھڑی ہوئیں اپنے پیچھے لاشوں اور شکست کی کہانیاں چھوڑ کر۔

راکٹوں کی تیاری میں جدید تکنالوجی

2008 میں Encyclopedia Brittanica انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں اسیفن آیو اور جان یف گل مارٹن لکھتے ہیں ''میسور کے شہزادے ٹیپوسلطان اور حیدر علی نے جنگی استعمال کے راکٹ استعمال کئے ۔ ان میں جدید تکنالوجی کا استعمال کیا۔ Metal Cylinder یعنی دھات سے بنی نالی کا استعمال بارودی پاؤڈر ڈالنے کے لئے استعمال کیا حالانکہ حالات کے ذریعہ نرم لوہے سے تیار کردہ یہ ہتھیار بنیادی قسم کا تھا لیکن اس کالے پاؤڈر کے ڈالنے اور اس کے پھٹ کر ابھرنے کی وجہ سے یہ تباہ کن بن گیا تھا۔ یہ راکٹ ایک سے دو کلومیٹر دوری تک مار کرتا تھا حالانکہ ایک دو راکٹ نشانہ خطا بھی کر جاتے۔لیکن جب بڑی تعداد میں ایک ساتھ راکٹ فائر کئے جاتے تو دشمنوں کی صف میں ویرانیاں پھیلا دیتے۔ یہ ہتھیار خصوصیت کے ساتھ گھوڑ سوار فوج کے خلاف کافی کارگر تھے۔ یہ سگا کر ہوا باز مین میں داغ جاتے۔ حیدر علی کے بیٹے ٹیپوسلطان نے ان میں کئی اعلیٰ درجہ کی تبدیلیاں کیں اور انہیں زیادہ بہتر اور تباہ کن بنایا۔ٹیپو کی فوج میں ہر 5000 سپاہیوں کے ساتھ 120 راکٹ بردار فوجی ہوتے۔ٹیپو کی شہادت کے بعد راکٹ تکنالوجی یہاں سے یوروپ پہنچی، انگلینڈ کی Royal

Woolwithch Arsenal Reserach and Devolopment نے 1801ء میں راکٹ بنانے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کی تکنالوجی میسور سے ہی کی گئی تھی۔ ویسے ٹیپوسلطان نے مختلف سائز کے راکٹ بنوائے تھے۔ لیکن عام سائز ہوا کرتا تھا۔ نرم لوہے کو کوٹ کوٹ کر ایک آٹھ آنچ طبی نالی تیار کی جاتی جس کا قطر یعنی موٹائی تین انچ سے لے کر ڈیڑھ انچ ہوا کرتی۔ اس کو ایک طرف سے بند کر دیا جاتا۔ پھر چار فیٹ لمبے بمبو سے باندھ دیا جاتا۔ لوہے کی نالی ایک (Combustion Chamber) یعنی فائرنگ کے لئے بنیادی عمل کا کام دیتی اس میں بارود نما اشیاء بھری ہوتیں تقریباً ایک پاؤنڈ تک دھماکہ خیز مادہ بھرا ہوتا۔ اور کم از کم ایک ہزار تا دو ہزار گز کی دوری تک مار کرتا۔ جب کہ یوروپ کے تیار کردہ ہتھیارات میں یہ خاصیت نہ تھی نہ ہی یہ دور تک مار کر سکتے تھے۔ ٹیپوسلطان کے تیار کردہ راکٹ دشمن کی فوجوں میں تباہیاں مچا دیتے۔ میدان جنگ سے بھاگنے والے انگریز: ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا میں یہ مشہور ہو چلا تھا کہ انگریز افواج کو شکست نہیں دی جا سکتی لیکن 1780ء میسوری افواج نے گنور کی جنگ میں انگریز وں کے خلاف راکٹوں کا استعمال کیا۔ جب ان پر راکٹوں کی بوچھاڑ ہونے لگی تو ناقابل شکست کہلانے والی انگریز افواج ٹوٹ کر بکھر گئیں اور بھاگ کھڑی ہوئیں۔ جنگوں میں مختلف اوقات میں راکٹوں کے استعمال اور انگریزوں کی شکست نے ٹیپوسلطان کو ایک افسانوی کردار بنا دیا تھا۔ میسور کی چوتھی جنگ میں بھی مختلف مقامات پر ٹیپو کی افواج نے انگریزوں کے خلاف ان کا استعمال کیا۔ دیوان پورنیا نے سلطان پیٹ باغ کی جنگ میں کرنل آرتھر ویلزلے کی افواج کو شکست دی۔ اس کے بارے میں مشہور مورخ ''فارسٹ'' لکھتا ہے۔ ''اس مقام پر سلطان پیٹ کے قریب ایک بڑا باغ تھا جس میں سلطان کی راکٹ بردار فوج چھپی ہوئی تھی اس کا سامنا سری رنگ پٹن پر حملے سے پہلے انگریزوں کو ہوا تھا جس کا سالار

کرنل ویلز لے تھا۔ 5/اپریل 1799ء کی رات تھی اس کا سامنا راکٹوں اور مسکیٹوں یعنی جدید بندوقوں کی مسلسل فائرنگ سے ہوا۔ فائرنگ اس قدر شدید تھی کہ انگریز افواج حملہ کرنا بھول گئیں۔''

نیلی روشنیوں میں سرسراتے سانپ نما راکٹ

22/اپریل 1799ء کو انگریزوں پر راکٹوں کے شدید حملوں کے بارے میں فارسٹ لکھتا ہے کہ انگریز افواج کے سروں پر راکٹ والوں کی برسات سے زیادہ شدت سے برس رہے تھے۔ فضاؤں میں نیلی روشنی ابھرتی اس کے ساتھ ہی راکٹوں کی برسات شروع ہو جاتی جو کہ دشمن کی افواج کی درمیان اور پچھلی صفوں میں انتشار پیدا کر دی۔ یہ راکٹ بیس تا تیس فیٹ اونچے بمبوں کے سرے پر بندھے ہوئے جو کہ آسمان سے ابھر کو فوج کے سروں پر راکٹوں کی برسات کر کے انہیں خاک وخون سے نہلا دیا جاتا۔ ان کے ساتھ زمینی راکٹ کی بھی فائرنگ ہوتی جو کہ زمین پر سانپ کی طرح گھستے چلے جاتے جس میں صفوں میں بھگدڑ مچ جاتی۔

آخر کار 2/مئی 1799 کو انگریزوں نے اپنے زرخرید غداروں کے ذریعہ راکٹوں اور ہتھیارات کے گوداموں میں آگ لگوادی۔ گودام پھٹ پڑے آسمان پر سیاہ بادلوں کے مرغولے ابھرنے لگے۔ ان کے درمیان ابھرنے والی روشنی بجلی کی طرح فضاؤں میں بکھر رہی تھی۔ اس طرح ٹیپوسلطان کے دربار میں پلنے والے ان آستینوں کے سانپ جیسے غداروں کے ذریعہ 4/مئی 1799 کو انگریز مرہٹے اور نظام کی ملی جلی فوج سری رنگ پٹن میں داخل ہوگئی۔ ملک کی آزادی کے متوالے ٹیپو نے دشمنوں سے لڑتے لڑتے شہادت کا پیالہ پی لیا اور بہادری کی ایک انوکھی داستان آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑ دی۔

ٹیپو سلطان کے زمانہ کے راکٹ لندن میں

راکٹوں کی جنگ کے موجد ٹیپو سلطان: 30 نومبر 1919ء کو صدر عبد الکلام نے اپنے ٹیپو سلطان شہید میموریل یادگار کلیدی خطبہ میں کہا کہ ٹیپو سلطان راکٹوں کی جنگ کے موجد ہیں۔ سری رنگ پٹنم سے حاصل کئے ہوئے دو راکٹ آج بھی لندن کے رائل آرٹلری میوزیم میں موجود ہیں۔ ٹیپو سلطان شہیدؒ نے اکثر جنگوں میں جیت حاصل کی۔ انہوں نے ہند کی تمام طاقتوں کو کامل شکست دی، جن میں مرہٹے اور نظام بھی شامل ہیں اور ایک ایسے حکمران ہیں جنہوں نے انگریز افواج کو بھی شکست دی۔'' یہ خفیہ الا مین کمیونٹی لیڈر شپ ایوارڈ کے اجلاس میں دیا تھا جس کی گونج دنیا بھر کے اخبارات اور ٹی وی چینلوں میں ہوئی۔ ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد یہاں سے چرائی گئی راکٹ تکنالوجی کو انگریزوں نے اپنایا۔ 1801ء میں اس کے لئے خصوصی ریسرچ سینٹر لندن میں قائم کیا۔ 1805ء میں Solid Fuel Technology راکٹ کا پہلا تجربہ کیا اور اس میدان میں ترقی کرتے گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹیپو سلطان اپنے دور سے آگے بہت آگے کی سوچ رکھنے والے حکمران تھے۔ اس زمانے میں دنیا بھر میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں ان پر نظر رکھتے تھے۔ ان کی فوج اس زمانے کی بہترین تربیت یافتہ فوج تھی اور اعلیٰ درجہ کے ہتھیارات سے لیس تھی۔ انگریزوں نے جب بھی اکیلے ان کا سامنا کیا تو شکست کھاتے گئے۔ اسی لئے انہوں نے نظام، مرہٹے، ٹراونکور کے راجہ اور دوسرے حکمران کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس کے باوجود ٹیپو سلطان کو شکست دینے کے لئے دھوکہ بازی سے کام لیا۔ سازشوں کے جال بچھائے، غداروں کو خریدا، اصل بات تو یہ ہے کہ ٹیپو سلطان کو جہاں سیدھے جنگوں میں ہرایا نہ جاسکا وہیں میر صادق جیسے غداروں کے ذریعہ راکٹوں اور

ہتھیارات کے ذخیروں میں آگ لگانے کے ذریعہ اور دوسرے دھوکہ دہی کے طریقوں سے انگریز انہیں شکست دینے میں کامیاب ہوئے۔ سترہویں صدی کا یہ بڑا المیہ ہے کہ مسلمانوں میں میر صادق اور میر جعفر جیسے غدار پیدا ہوئے جنہوں نے قوم کو چند سکوں کے عوض، دھوکہ دیا اس کو اغیار کے ہاتھ رہن رکھ دیا۔ جس کا خمیازہ آج تک قوم بھگت رہی ہے۔ اسپین میں بوعادل کی غدارانہ سازشوں کے بعد اس دھوکہ اور فریب کے ہتھیارات کو انگریزوں نے ہندوستان میں بھی آزمایا۔ غداروں، وطن فروشوں اور ملت فروشوں کی وجہ سے سراج الدولہ کو بنگال میں میر جعفر کے ذریعہ اور میر صادق وغیرہ کے ذریعہ کرناٹک میں ٹیپو سلطان کو شکست دی۔ قیامت تک ان غداروں پر ذلت برستی رہے گی۔

☆☆☆

بطلِ حُرّیت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ [9]

گذشتہ صدی میں حضرت حاجی امداد اللہ فاروقی مہاجر مکیؒ کی ذات ستودہ صفات اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھی۔ آپ کی زندگی کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ پارس کے پتھر کی سی خاصیت رکھتے تھے۔ جسے ان کی خدمت نصیب ہوگئی وہی کندن بن گیا، آج تک عرب وعجم میں ان کا روحانی فیض جاری ہے، انشاء اللہ قیامت تک جاری رہے گا۔ برصغیر میں شاید ہی کوئی ایسا عالم دین ہوجو حاجی صاحبؒ سے عقیدت وارادت کا رشتہ استوار نہ رکھتا ہو۔ برصغیر میں آپ کا روحانی فیضان مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا عبدالرحیم رائے پوریؒ، مولانا محمود حسن محدث دیوبندیؒ، اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ جیسی باکمال شخصیتوں کے بے مثال کارناموں کی شکل میں آج بھی جاری وساری ہے۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروق امروہوی مرحوم ''مرقومات امدادیہ'' میں لکھتے ہیں: ''۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ناکام ہوجانے سے ہندوستان میں امت مسلمہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا، طاقت اور حکومت کے چھن جانے سے اقتصادی نظام کی باگ ڈور مکمل طور پر غیر ملکی حکمرانوں کے ہاتھ میں چلی گئی تھی۔ اس لئے معاشی زبوں حالی اقتصادی پسماندگی اور دنیوی

بے سروسامانی ان کا مقدر بن چکی تھی۔ فرنگی سیاست نے ایک نیا جال بچھا دیا تھا، نئی تہذیب کا سیل بے اماں امڈا چلا آرہا تھا جس میں وہ اخلاقی، روحانی اور معاشرتی اقدار جنہیں اسلامی فکر نے ایک ہزار سال تک سنوارا تھا، خس وخاشاک کی طرح بہنے لگی تھیں، تعلیم کا طریقہ معیار اور نصاب سب کچھ بدل رہا تھا، اسی زمانہ میں ایک فقیر بوریہ نشین، تہبند پوش جو ضلع مظفر نگر کے تھانہ بھون کا رہنے والا تھا اور جس نے محض دینی غیرت وحمیت اور للّٰہیت کے بل پر ۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کے خلاف شاملی میں جہاد کرکے مسلمانوں کو ایک نیا حوصلہ وعزم دیا، جس کے کچھ ساتھیوں نے جام شہادت نوش کیا تھا اور بعض رفقاء انگریز کی قید میں پہنچ چکے تھے اور خود دار وگیر سے بچ کر صحن کعبہ میں بیٹھا ہوا حکمت وروحانیت کا درس دے رہا تھا اور ہندوستان کی سرزمین سے ہزاروں میل دور رہ کر بھی یہاں کے حالات وکوائف سے باخبر رہتا تھا، جو مسلمانوں کی بے کسی اور بے بسی اور درماندگی پر کڑھتا تھا۔ حب الٰہی اور عشق محمدیؐ کی زندہ تصویر قناعت، صبر ورضا اور تسلیم وتوکل کی منہ بولتی ہوئی تفسیر تھا۔

دینی تعلیم کا قلعہ تعمیر کرنے پر آمادہ کیا

اس نے اپنے ہم وطن مسلمانوں کے دینی، اخلاقی اور روحانی سرمایہ کی حفاظت تن تنہا ایک عظیم انقلابی تحریک اور ایک فعال انجمن کی طرح کی۔ اس فقیر بے نوا نے ''دارالعلوم دیوبند'' جیسا دینی تعلیم کا قلعہ تعمیر کرنے کے لئے اپنے مخلص مریدوں کو آمادہ کیا، جہاں سے دین کی تعلیم وتبلیغ اور حفاظت وصیانت کا کام برصغیر ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیائے اسلام میں پھیل گیا۔ مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کی تحریک دعوت وتبلیغ بھی دراصل حاجی صاحب ہی کے مشن کا ایک حصہ ہے۔ حاجی صاحبؒ نے بیت الحرام کے صحن میں بیٹھے سینکڑوں خلفاء صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ

جزیرۃ العرب ترکی اور شمالی افریقہ میں دور دور تک پہنچادیئے۔ خانقاہوں میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی، روحانی تربیت اور ارشاد و ہدایت کے سوتے جو خشک ہو چکے تھے ایک بار پھر پوری قوت سے پھوٹ نکلے اور پیاسی دھرتی کو سیراب کرنے لگے۔ غرض دینی فکر کے بقاء وعقائد کے تحفظ و زندقہ کی یورش سے حفاظت اور اسلامی تصوف کے روحانی ورثے کو عام وموثر بنانے میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا کارنامہ بے مثال ہے۔ اور ان کا فیض ہمیشہ جاری رہے گا۔ فخر مشائخ منبع فیوض وحکم مخزن حقائق، مجمع دقائق حضرت مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی ولادت باسعادت ۲۲ رصفر ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸ راپریل ۱۸۱۸ء میں اپنی ننہال قصبہ نانوتہ میں ہوئی۔ وطن تھانہ بھون تھا، نسبتاً فاروقی تھے، والد ماجد کا نام حافظ محمد امین عمری تھا۔

آپ کا تاریخی نام امداد حسین

آپ کا تاریخی نام ظفر محمد تھا۔ والد نے امداد حسین رکھا اور حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ نے امداد اللہ نام رکھا اور اسی نام سے مشہور ومعروف ہوئے۔ والدہ ماجدہ کا نام بی بی حسینی تا اور وہ نانوتہ کے شیخ علی محمد صدیقی کی صاحبزادی تھیں۔ علوم ظاہری کی تحصیل مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادیؒ، مولانا ابوالحسن حسن کاندھلویؒ، مولانا عبدالرزاق جھنجھانویؒ، مولانا احمد علی محمد سہارنپوریؒ، مولانا عبدالرحیم نانوتویؒ، مولانا رحمت علی تھانویؒ سے کی۔ عمر کے سولہویں سال میں استاذ العلماء مولانا مملوک العلی صدیقی نانوتویؒ کی معیت میں دہلی کا سفر اختیار کیا اور اسی دوران میر پنجہ کش سے خوش نویسی سیکھی۔ آپ کے قلب منور میں خدا طلبی کا ذوق وشوق موجزن ہوا تو مولانا سید نصیر الدین نقشبندی دہلویؒ سے بیعت ہو کر منازل سلوک چند دنوں میں طے کر کے خرقہ خلافت سے مشرف ہوئے۔ بعدہٗ میاں جی نور محمد جھنجھانویؒ سے سلسلہ

چشتیہ صابریہ میں بیعت ہوئے اور ان سے بھی خلافت واجازت حاصل ہوئی اور رشد وہدایت کا سلسلہ جاری کیا۔ آپ کے فیوض سے ہندوستان ہی نہیں بلکہ سارا عالم فیضیاب ہوا۔ آپ کے خلفاء میں ہندوستان کی مشہور ومعروف شخصیتیں شامل ہیں ان میں سے چند یہ ہیں: قطب الاقطاب مولانا رشید احمد محدث گنگوہیؒ، قاسم العلوم والمعارف مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، سید العلماء مولانا سید احمد حسن محدث امروہیؒ، مولانا حافظ عبدالرحمٰن صدیقی مفسر امروہیؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا عبدالرحیم رائے پوریؒ تھے۔

میدان کارزار کے امیر المجاہدین

آپ ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں شاملی وتھانہ بھون کے محاذ پر امیر المجاہدین تھے۔ آپ کی امارت وقیادت میں اکابر دیوبند نے میدان کارزار میں حصہ لیا اور حافظ محمد ضامن فاروقیؒ نے جام شہادت نوش کی۔ جنگ میں ناکام ہونے کے بعد مکہ مکرمہ ہجرت فرما گئے۔ اور ہواں چودہ سال مقیم رہے، یہ پوری مدت سالکین کی تربیت باطنی وافادہ میں گزری۔ آپ جماعت حقہ کے پیشوا تھے۔ سالکان راہ طریقت ومضطربان قلوب کی اصلاح باطنی وتربیت کے لئے ارشد مرشد، جہاد اکبر، حاشیہ مثنوی مولانا روم، 'رسالہ دردغمناک'، ''غذائے روح''، ضیاء القلوب'، فیصلہ ہفت مسئلہ'، 'مثنوی تحفۃ العشاق، کلیات امدادیہ'، 'گلزار معرفت'، وحدۃ الوجود'، نہایت بلند پایہ تصانیف ہیں۔ یہ سب کتابیں سلوک ومعرفت میں ہیں۔ گنجینۂ سلوک ومعروفت پیکر شرافت وانسانیت، مکارم اخلاق، ملک کے غم گسار ۱۲ رجمادی الثانی ۱۳۱۷ھ موافق ۱۸ راکتوبر ۱۸۹۹ء کو ارض 'مکہ مکرمہ' میں اپنے رب اعلیٰ سے جا ملے اور جنت المعلیٰ میں ابدی آرام گاہ بنی خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

☆☆☆

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ[1]

اور سرسید احمد خاںؒ

17/اکتوبر کو سرسید ڈے منایا جاتا ہے یہ روایت سالہا سال سے چلی آرہی ہے، پوری دنیا میں جہاں جہاں علیگیرین حضرات ہیں، اس دن کا بڑا اہتمام کرتے ہیں سرسید کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی جاتی ہے، ان کو یاد کیا جاتا ہے، بلاشبہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے عہد زوال کے ایک عظیم انسان تھے، جنہوں نے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی اور ایک زوال آمادہ قوم کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگادی، اپنوں اور غیروں نے ہزار مخالفتیں کیں لیکن کوئی بھی مخالفت ان کے پائے ثبات کو جنبش نہ دے سکی، بلاشبہ علی گڑھ کے فیض یافتگان کا حق ہے بلکہ یہ ان کا فرض ہے کہ اس عظیم معمار کی یادوں سے اپنے دل کے نہاں خانے روشن رکھیں اور اس کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے رہیں، اسی دور خزاں کی ایک اور عظیم شخصیت جس نے 1857ء کی جنگ سے برباد اور مایوس قوم کے لئے بے آب وگیاہ سرزمین ہند میں علم کے نخلستان لگائے وہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا

[1] مولانا ندیم الواجدی، راشٹریہ سہارا، 17/اکتوبر 2011ء

محمد قاسم نانوتویؒ کی ہے، جس وقت سرسیدؒ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہے تھے ٹھیک اسی وقت مغربی یوپی کے ایک چھوٹے سے قصبے نانوتہ میں یہ شخصیت عالم وجود میں دم رکھ رہی تھی، سرسید کی تاریخ پیدائش 17/اکتوبر 1817ء میں اس بزم ہست وبود کو رونق بخشی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں کا تعلق مغربی یوپی کے مردم خیز علاقے سے ہے اور اس سے بھی زیادہ عجیب اتفاق یہ ہے کہ دونوں کی تعلیم کا سرچشمہ ایک ہی ہے، دونوں نے حضرت شاہ عبدلعزیز دہلویؒ کے مدرسے سے فیض اٹھایا جو مسلمانوں کے علمی دور عروج کی آخری یادگار کے طور پر دہلی میں باقی رہ گیا تھا، اور تشنگان علوم اسی کی طرف رجوع کرتے تھے۔

سرسید احمد کی تعلیم وتربیت

سرسید کی تعلیم قدیم طرز کے اسلامی منہج پر ہوئی۔ انہوں نے وہی کتابیں پڑھیں جو عام طور پر مدارس عربیہ میں پڑھائی جاتی رہی ہیں۔ ان کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ سرسید نے جن بزرگوں سے فیض حاصل کیا ان میں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے پوتے شاہ مخصوص اللہ، شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے جانشین شاہ محمد اسحاق دہلویؒ اور استاذ الکل حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے نام لئے جاتے ہیں۔ (موج کوثر شیخ محمد اکرام ص:۸۰ بہ حوالہ تراجم علمائے حدیث ہند، ص:120-113) آخر الذکر ان بے مثال علماء میں سے ہیں جن کے سامنے انیسویں صدی کے اکثر مشاہیر نے زانوئے تلمذ طے کیا ہے، جیسے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پوریؒ، منشی ذکاء اللہ صاحبؒ، ڈپٹی نذیر احمد دہلویؒ، مولانا یعقوب علی نانوتویؒ، مولانا محمد احسن نانوتویؒ، مولانا محمد مظہر صاحبؒ بانی مظاہر علوم سہارن پور، اسی فہرست میں یہ دو نام بھی شامل ہیں سرسید احمد خاں اور مولانا محمد قاسم

نانوتویؒ، اگرچہ دورِ حاضر کے بعض محققین نے اس بات سے انکار کیا ہے کہ سرسید احمد خاں نے مولانا مملوک علی نانوتویؒ سے تعلیم حاصل کی ہے، تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن ہیں ہے کہ سرسید کے ذہن وفکر پر ابتداً مدرسہ شاہ ولی اللہ کی گہری چھاپ رہی ہے، یہ بات الگ ہے کہ بعد میں بعض مخصوص حالات ورجحانات کی بناپر یہ اثر زائل ہوگیا، ان کی ننھیال کو حضرت شاہ عبدالعزیز اور انکے خاندان سے عقیدت مندانہ تعلق تھا، انکا نام احمد بھی حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا رکھا ہوا ہے، بسم اللہ بھی حضرت شاہ صاحب نے کرائی، سرسید اپنے والد کے ساتھ بہ کثرت حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضری دیا کرتے تھے، خود لکھتے ہیں: ''میں ہر روز آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا آپ اپنی شفقت اور محبت سے مجھے اپنے پاس مصلےٰ پر بٹھالیتے اور نہایت شفقت فرماتے، میں نے اپنے دادا کو تو نہیں دیکھا آپ ہی کو دادا حضرت کہا کرتا تھا۔

(آثارالصنادید بہ حوالہ موج کوثر ص:۷۹)۔

مولانا قاسم نانوتوی کی تعلیم وتربیت

ادھر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بہ غرض حصول علم حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے ساتھ دہلی چلے گئے اور لگ بھگ سات سال تک دہلی میں فروکش رہ کر اپنے مشفق ومربی ومحسن استاذ سے علوم وفنون کی تکمیل کرتے رہے، یہاں تک کہ 1267ھ میں حضرت مولانا مملوک علی وفات پاگئے، اس وقت حضرت شاہ اسحاق دہلویؒ بھی وفات پاچکے تھے، البتہ ان کے ایک تلمیذ رشید حضرت شاہ عبدالغنی مجددی حیات تھے اور علم حدیث میں ان کا زبردست شہرہ تھا، اپنے استاذ کی وفات کے بعد حضرت مولانا نانوتویؒ نے تحصیل علوم حدیث کے لئے اپنے وقت کے اسی محدث جلیل کے سامنے زانوئے ادب طے کیا، گویا اپنے وقت کی ان دو عظیم شخصیتوں نے

ایک ہی استاذ مولانا مملوک علی سے فیض اٹھایا، ایک ہی درسگاہ مدرسہ شاہ عبدالعزیز کے طالبعلم بنے، فرق اتنا ہے کہ سرسیدؒ نے حضرت اسحاق دہلویؒ سے براہ راست استفادہ کیا اور حضرت مولانا نانوتویؒ نے ان کے شاگرد حضرت شاہ عبدالغنی مجددد دہلویؒ سے فیض اٹھایا۔

تعلیم کے بعد دونوں کے راستے جدا جدا

تعلیم کے بعد ان دونوں شخصیتوں کے راستے جدا جدا ہوگئے، سرسید انگریزی حکومت کے ملازم ہوکر دہلی کی منصفی پر مامور ہوئے، حضرت نانوتویؒ نے سترہ سال کی عمر میں علوم نقلیہ وعقلیہ میں مہارت حاصل کرنے کے بعد ذریعہ معاش کے طور پر مطبع احمدی دہلی میں صحہ کتب کا مشغل اختیار کیا، اسی دوران انہوں نے بخاری شریف کے آخری چھ پاروں کے حواشی بھی تحریر کئے، یہ 1852ء کا زمانہ ہے، اس وقت حضرت نانوتویؒ کی عمر زیادہ سے زیادہ اکیس برس تھی اور سرسید پینتیس برس کے ہوچکے تھے، دونوں کا قیام دہلی میں تھا، دونوں حضرات کھلی آنکھوں شاہ جہاں آباد کی بربادی کا مشاہدہ کررہے تھے، دونوں کے دل اس بربادی سے غم زدہ تھے، دونوں مسلمانوں کی تباہ حالی پر آنسو بہانے پر مجبور تھے، دونوں ہی اپنی قوم کے لئے کچھ کرنا چاہتے تھے مگر اچانک 1857ء کی بغاوت شروع ہوگئی۔

1857 کی شکست کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کو زبردست نقصان پہنچایا، دہلی، آگرہ، لاہور، ملتان، لکھنو، خیرآباد، بنگال، مدراس اور بہار وغیرہ کے ہزاروں مدارس ہندوستان کے سلاطین اور امرا کی وقف کردہ جائدادوں سے چل رہے تھے، مسلمانوں کی تعلیم کا دارومدار ہی جائدادوں پر تھا، 1883ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے ان تمام اوقاف کو بہ حق سرکار ضبط کرلیا، ڈبلیوڈبلیو ہنٹر کے بہ

قول ''مسلمانوں کے تعلیمی ادارے 18 رسال کی لوٹ کھسوٹ کے بعد یک قلم مٹ گئے۔ (ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص:۲۰۰)

مسلمانوں کی مذہبی تعلیم پر کاری ضرب

ایک طرف مسلمانوں کی مذہبی تعلیم پر کاری ضرب لگائی گئی اور مدارس کے سلسلے کو مٹا کر رکھ دیا گیا، دوسری طرف ملک میں ایسی تعلیم رائج کی گئی جو اپنے نتائج کے اعتبار سے اسلام اور مسلمانوں کیلئے سخت نقصان دہ تھی۔ انڈیا کی سپریم کونسل کے ایک اہم رکن سر چارلس نے جو گورنر کے اہم منصب پر فائز تھے ایک مرتبہ کہا کہ: ''میں یہ امید قائم کئے ہوئے تھا کہ جس طرح ہمارے لوگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہوگئے تھے، اسی طرح یہاں (ہندوستان میں) بھی ایک ساتھ عیسائی ہوجائیں گے''۔ (مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص:۱۴۳)

برطانیہ کی پارلیمنٹ کے ایک ممبر مسٹر مینکلس نے 1857ء میں دارالعلوم میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا: ''ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہئے''۔ (حکومت خود اختیاری، ص:۱۳۶) انگریز سمجھتے تھے کہ جب تک مسلمان قرآن کریم پڑھتے رہیں گے اور جب تک وہ شریعت کے اس سرچشمے سے سیراب ہوتے رہیں گے اس وقت تک انگریز ملک پر پوری طرح غالب نہیں آسکتے، چنانچہ برطانیہ کے ایک سابق وزیر اعظم گیڈاسٹون نے مجمع عام میں قرآن کریم کو ہاتھ میں لے کر کہا: ''جب تک یہ کتاب دنیا میں باقی ہے دنیا متمدن اور مہذب نہیں ہوسکتی''۔ (شیخ الاسلام کا خطبۂ صدارت، ص:۱۵ پچاس سالہ اجلاس عام آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ)

انگریز یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ مسلمان قرآن کریم پر مکمل یقین رکھتے ہیں اور جب تک وہ اس کتاب سے وابستہ رہیں گے۔ کسی انگریز حکومت کے وفادار

نہیں ہوسکتے، چنانچہ ہنری طامس کہتا ہے کہ: ''مسلمان کسی ایسی گورنمنٹ کے جس کا مذہب دوسرا ہو اچھی رعایا نہیں ہوسکتے، اس لئے کہ قرآنی احکام کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں ہے''۔ (حکومت خود اختیاری، ص:۵۵)

لارڈ میکالے نے اپنے عزائم مخفی نہیں رکھے اور صاف صاف لفظوں میں یہ اعلان کیا: ''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو رنگ ونسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں اور دل ودماغ کے اعتبار سے فرنگی''۔ (بحوالہ مدینہ بجنور ۲۸ رفروری ۱۹۲۷ء)

علماء کو پھانسی دی جارہی تھی

ایک طرف علماء کو پھانسی کی سزا دی جارہی تھی اور ایک ایک وقت میں کئی کئی سو علماء کو تختہ دار پر چڑھایا جارہا تھا، انہیں پابند سلاسل کیا جارہا تھا یا جلاوطنی پر مجبور کیا جارہا تھا، دوسری طرف عیسائی مشنریز ملک کے طور وعرض میں اپنا جال پھیلا رہی تھیں اور کوشش کی جارہی تھی کہ ہندوستان پر عیسائیت کا جھنڈا بلند کردیا جائے اور یہ امر یقینی بنادیا جائے کہ اس ملک کا ہر شہری عیسائی ہو، اس کیلئے مختلف طریقے اختیار کئے گئے، مسلمانوں کو عیسائی بننے کی صورت میں ملازمتیں دینے کا وعدہ کیا گیا، جو لوگ سالہا سال کی جنگ اور بدامنی کے نتیجے میں غریبی کی سطح سے نیچے جاچکے تھے انہیں ڈیڑھ آنہ یومیہ یا ڈیڑھ سیر اناج دے کر عیسائی بننے پر مجبور کیا گیا، بہ قول سرسید ''غریب آدمی کیلئے یہ اتنی بڑی دولت تھی کہ وہ اسکے عوض بہ خوشی اپنی گردن کٹوانے پر تیار ہوجاتا تھا''۔ بلاشبہ عیسائی مبلغین نے اپنی جدوجہد میں ہندوستانی مسلمانوں کے نامساعد حالات، جہالت، غربت، اور اقتدار سے محرومی وغیرہ کی بنا پر عیسائیت کی تبلیغ میں کامیابی حاصل کی، چنانچہ مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی لکھتا ہے ''انگریزی مشن جو ہندوستان میں کام کررہے ہیں انہیں خوب کامیابی مل رہی ہے، ہر روز اینگلو

انڈین کلب کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے۔(خطبات گارساں دتاسی ترجمہ ڈاکٹر حمید اللہ: ۳۰۳/۱) ایک جگہ لکھتا ہے: ''ہندوستان میں تبلیغ عیسائیت کو جو کامیابی حاصل ہورہی ہے اس میں شبہے کی گنجائش نہیں ہے، اس سے ہر عیسائی کو خوش ہونا چاہئے''۔(حوالہ سابق: ۳۷۸/۱)

ہمارے بزرگوں کی جدوجہد

اس سخت اور جاں کسل صورت حال میں حضرت مولانا نانوتویؒ اور ان کے رفقائے کرام کے سامنے ایک اہم سوال آیا اور یہ سوال ان کی فکری بصیرت کا امتحان تھا سوال یہ تھا کہ جو مذہب ایک ہزار برس تک اس ملک کے ہر شعبۂ زندگی پر چھایا رہا جس ملک کی زلف سنوارنے میں ہمارے اسلاف اور بزرگوں نے عمر بھر جدوجہد کی جس ملک نے صدیوں اسلام اور اسلامی علوم کی خدمت انجام دی، ان میں اضافے کئے لاتعداد دانش گاہیں قائم کیں، دینی درسگاہیں بنائیں، کیا یہ ملک مسلمانوں کے لئے اجنبی ہوجائے؟ اس سوال نے حضرت نانوتویؒ اور ان کے رفقا کے ذہن وفکر کو متاثر کیا۔ 1857ء کی شکست نے یہ تسلیم کرنے پر مجبور کردیا تھا کہ ہم اپنی آزادی فنا کر چکے ہیں اور ایک ایسی قوم کو ہم پر مسلط کردیا گیا ہے جو ہماری سیاست پر ہی اثر انداز نہیں ہوگی بلکہ ہمارے مذہب پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوں گے، ہماری تعلیم بھی متاثر ہوگی، ہمارے سوچنے کے ڈھنگ میں بھی تبدیلی آئے گی، عام ذہنوں میں یہ احساس جاگزیں ہوچکا تھا کہ ہم ایک شکست یافتہ قوم ہیں، تنزل نصیب ہیں، ہمیں اب مفتوح کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے، فتاح کی حیثیت سے نہیں، اس احساس نے وقت کا اہم سوال پیدا کیا، کیا ہم اپنے آپ کو اس قوم کے حوالے کردیں، اپنی تہذیب ثقافت اور تعلیم کو اس اجنبی قوم کی تہذیب، ثقافت اور تعلیم میں تحلیل کردیں ضرورت تھی کہ کوئی مرد خدا کھڑا ہو اور اپنی فکری بصیرت سے اس سوال کا جواب ڈھونڈے اور

اس مسئلے کا حل سوچے اور اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لئے سامنے آئے۔ یہ ایک پیچیدہ اور الجھا ہوا سوال تھا، شکست خوردہ قوم سر اٹھانے کے قابل بھی نہ تھی چہ جائے کہ وہ کچھ سوچ سکے، یا کوئی اقدام کرسکے، 1857ء کی بربادی پر چند ہی سال گزرے تھے اور اس کے لرزہ خیز مناظر دیکھنے والے بہ قید حیات تھے۔ اس مسئلے کے دو حل سوچے گئے، ایک علی گڑھ میں جو زمانی اعتبار سے موثر ہے مگر ہم اس کو پہلے ذکر کرنا چاہتے ہیں اور دوسرا دیوبند میں، علی گڑھ میں جو حل سوچا گیا اس کا ماحصل یہ تھا کہ ہم پر ایک قوم تسلط حاصل کرچکی ہے، دانش مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم اپنے حاکم کے علوم اور اس کی زبان سیکھیں تاکہ اجنبیت کی یہ خلیج پٹ سکے، اسی طرز فکر نے اس دانش گاہ کی بنیاد رکھوائی جسے ابتدا میں مدرسۃ العلوم کہا جاتا تھا اور آج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کہا جاتا ہے، سرسید مرحوم نے ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ 1886ء علی گڑھ میں فرمایا تھا: ''اس وقت ہمیں ضرورت ہے کہ جس قدر ہوسکے ایک کثیر تعداد میں ایسے نوجوانوں کو پیدا کریں جو ان علوم میں جو زمانے کی حاجتوں کے لئے ضروری ہیں سربرآوردہ ہوں''۔(روداد ایجوکیشنل کانفرنس 1886ء علی گڑھ)

دو نظریوں کے دو ادارے قائم ہوئے

سرسید مرحوم نے انگریزوں کے تئیں اپنی خدمات سے حکومت وقت کا جو اعتماد حاصل کرلیا تھا، اس سے انہیں اپنے کام میں بڑی مدد ملی، تخصی طور پر بھی وہ اعزاز واکرام سے نوازے گئے، یہاں تک کہ ''اسباب بغاوت ہند'' لکھ کر انہوں نے جس جرأت کا مظاہرہ کیا تھا وہ بھی ان کی توقیر کم نہ کرسکی بلکہ انگریزوں نے اس کتاب کو ایک مخلص کے خیالات سمجھ کر بڑی اہمیت دی اور اس سے ان کی قدر ومنزلت میں بڑا اضافہ ہوا، یہ تھا سرسید کا نظریہ جو دارالعلوم کی تاسیس کے بعد 1877ء میں علی گڑھ میں

مدرسۃ العلوم کی تاسیس کا سبب بنا۔اسی طرح دیوبند تحریک نے اس وقت کے مایوس کن حالات میں امیدوں کے چراغ جلائے اور اس خوف ناک ماحول میں دینی جدوجہد کا آغاز کیا جس نے مسلمانوں کو توڑ کر رکھ دیا تھا اور بہت سے لوگ حالات کے ساتھ مصالحت بلکہ حالات کے آگے سر جھکانے پر زور دینے لگے تھے، دیوبند نے ان حالات کا رخ موڑا اور ہندوستان کے مایوس ومجبور مسلمانوں کی رگوں میں زندگی کا خون دوڑایا، ان کے بے جان جسموں میں عزائم کی روح پھونکی اور اس طرح اسلام کے خلاف ہونے والی سازشوں پر سخت پہرے بٹھادیئے، حجاز مقدس میں جب دارالعلوم کے قیام کی اطلاع حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ کو دی گئی تو ان کی زبان سے بے ساختہ یہ دعا نکلی ''اے اللہ اس ادارے کو اسلام اور علم دین کی حفاظت کا ذریعہ بنا''۔

☆☆☆

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ [1]

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی ایک عظیم محدث، بے مثال مفسر، جلیل القدر شیخ، بلند پایہ عالم، مدبر قائد اور تحریک حریت وانقلاب کے امام تھے۔علم وفضل، زہد وتقویٰ، اخلاص وللّٰہیت، جرأت وہمت، استقامت وعزیمت، تدبر وذکاوت، جوش جہاد، جذبہ حریت اور ایثار وقربانی میں اپنی پوری زندگی میں یگانہ روزگار تھے۔ بلاشبہ آپ چودھویں صدی ہجری کے عظیم انسان تھے شیخ الہند ہی نہیں بلکہ شیخ العالم تھے۔آپ کی پیدائش 1268ھ، مطابق 1851ء میں بریلی میں ہوئی جہاں آپ کے والد ماجد حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (1904ء) بسلسلہ ملازمت مقیم تھے۔نشوونما اور تعلیم دیوبند میں ہوئی، جو آپ کا وطن اصلی تھا۔ابتدائی تعلیم ایک معمر دیندار بزرگ میاں جی منگلوریؒ اور میاں جی عبداللطیفؒ سے حاصل کی اور فارسی کی تمام کتابیں اور عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے چچا مشہور عالم مولانا مہتاب عالمؒ سے پڑھیں۔

15/محرم الحرام 1283ھ، مطابق 30/مئی 1866ء کو دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا، اس وقت آپ ''قدوری'' اور ''شرح تہذیب'' پڑھ رہے تھے۔آپ اس عظیم

[1] مولانا عبدالملک قاسمی، ہفت روزہ الجمعیۃ، نئی دہلی، 3 تا 9/اگست 2012ء

ادارہ کے اولین طالب علم ہوکر داخل ہوئے۔ اور مدرسہ دیوبند کے اول استاذ ملا محمود دیوبندیؒ اور حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ وغیرہ سے اکتساب علوم وفنون کیا۔ 1284ھ، مطابق 1867ء میں ''کنز الدقائق'، 'مبتدی'، اور 'مختصر المعانی' کا امتحان دیا، 1285ھ میں 'ہدایہ'، 'مشکوۃ'، اور 'مقامات حریری' کے امتحان میں شریک ہوئے۔ 1286ھ، مطابق 1869ء میں اپنے فخر زمانہ استاد حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ سے کتب صحاح ستہ ودیگر کتابیں میرٹھ اور دہلی میں رہ کر پڑھیں۔ 1288ھ میں فارغ ہوئے اور اسی سال مدرسہ کے معین مدرس بنادیئے گئے۔ 19/ذی قعدہ 1290ھ، مطابق 8/جنوری 1875ء کو آپ کی دستار بندی ہوئی۔ 1292ھ، مطابق 1875ء میں مدرس چہارم بنادیئے گئے۔

آپ کے شاگرد ہزاروں میں

1293ھ، مطابق 1876ء یعنی تقرری کے دوسرے سال ''ترمذی'، 'مشکوۃ' اور 'ہدایہ' وغیرہ جیسی نو کتابوں کا درس دیا۔ 1295ھ، مطابق 1878ء سے 'بخاری شریف' کا درس شروع کردیا۔ 1305ھ، مطابق 1888ء میں آپ صدر مدرس بنادیئے گئے۔ آپ نے 1289ھ، مطابق 1876ء سے 1339ھ، مطابق 1920ء تک تقریباً پچاس سال علم نبوت کی اشاعت فرمائی، آپ کی صدارت تدریس کے دور میں 860 طلبہ نے دورہ حدیث کی تکمیل کرکے فراغت حاصل کی جب کہ آپ کے چشمہ فیض سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے۔

آپ کے حلقہ تلامذہ میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ، امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ استاد العلماء مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ، شیخ الادب

مولانا اعزاز علی امروہویؒ، رئیس التبلیغ مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ، شیخ الحدیث مولانا فخر الدین مرادآبادیؒ اور مفسر قرآن علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جیسے صدہا اساطین فضل وکمال ونابغہ روزگار شخصیات شامل ہیں۔ آپ کے دور صدارت میں دارالعلوم دیوبند کو عالم گیر شہرت حاصل ہوئی۔ 1294ھ، مطابق 1877ء میں پہلے سفر حج کے موقع پر اپنے استاذ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے حکم سے سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت وارادت کا تعلق قائم کیا۔ اسی سفر میں حضرت حاجی صاحبؒ نے سلاسل اربعہ میں اجازت بیعت تحریر فرما کر عنایت فرمادی، بعدازاں حضرت نانوتویؒ نے ابھی اجازت بیعت وخلافت سے نوازا۔

ہر ہفتہ حضرت گنگوہی کی خدمت میں حاضری

حضرت نانوتویؒ کے وصال کے بعد قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے اصلاح وتربیت کا تعلق قائم کرلیا۔ آپ حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں ہر ہفتہ اس طرح حاضر ہوتے کہ جمعہ کے دن صبح کو پیدل گنگوہ پہنچ جاتے اور وہاں سے جمعہ کی نماز کے بعد واپس ہوجاتے۔ واضح رہے کہ دیوبند سے گنگوہ تقریباً 20 میل یعنی 30 کلومیٹر ہے۔ دربار رشیدی سے بھی سلاسل اربعہ میں اجازت بیعت وخلافت حاصل ہوئی مگر جب تک حضرت گنگوہیؒ حیات رہے آپ نے کسی کو بیعت نہیں کیا۔ اس کے بعد بھی اکثر وبیشتر دیگر اکابر کی طرف رجوع کرنے کا حکم فرماتے۔ بدرجہ مجبوری اور بہت ہی اصرار پر بیعت فرماتے۔ اس لئے آپ کے خلفاء کی تعداد زیادہ نہیں، مولانا ضرغام الدین مظفر نگریؒ مولانا صوفی محمد اکرام پنجابیؒ، مولانا مفتی محمد سہول بھاگلپوریؒ، مولانا وارث حسن کوڑہ جہان آبادیؒ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جنہیں آپ نے خرقہ خلافت

سے نوازا۔تحریک آزادی ہند میں آپ کی خدمات عدیم النظیر اور کارنامے بے مثال ہیں،آپ کی جدوجہد آزادی کا زمانہ بڑا طویل ہے،آپ نے آزادی کی جدوجہد اس وقت شروع کردی تھی جب کہ انڈین نیشنل کانگریس وجود میں بھی نہ آئی تھی۔1878ء میں استاذ محترم حضرت نانوتویؒ کے ایما پر'انجمن ثمرۃ التربیت' قائم کر کے جدوجہد کا آغاز کیا۔مورخ تحریک آزادی مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ اس انجمن کے مقصد تاسیس کے بارے میں رقم طراز ہیں۔''ثمرۃ التربیت سے صرف فضلاء ومنتسبین دارالعلوم کی تنظیم مقصود نہیں تھی بلکہ دراصل مقصد ایسے باحوصلہ افراد کی تنظیم تھی جو قیام دارالعلوم کے مقصد 1857ء کی تلافی کے سلسلہ میں کام کرسکیں''۔(اسیران مالٹا،ص:۱۲)

انجمن کے قیام کے دوسال بعد ہی حضرت نانوتویؒ کا وصال ہوگیا۔اس لئے اس انجمن کی باضابطہ سرگرمیاں جاری نہ رہ سکیں تاہم حضرت شیخ الہندؒ اپنے شاگردوں کی ذہن سازی کرتے رہے اور کم وبیش 30 سال نہایت راز داری کے ساتھ انجمن کے مقصد کی تکمیل کے لئے آبیاری کرتے رہے۔

جمعیۃ الانصار کی تشکیل فرمائی

1327ھ،مطابق 1909ء میں حضرت شیخ الہندؒ نے ازسرنو تنظیم کے لئے جمعیۃ الانصار کی تشکیل فرمائی اور اس کی نظامت کے لئے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو سندھ سے بلاکر دیوبند کے مرکز میں کام کرنے کا حکم دیا۔ جمعیۃ الانصار کا پہلا اجلاس 17-16-15/اپریل 1911ء کو مرادآباد میں زیر صدارت مولانا احمد حسن امروہویؒ منعقد ہوا۔ دوسرا اجلاس 1912ء میں میرٹھ میں ہوا جس کی صدارت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمائی۔تیسرا اجلاس 1913ء میں شملہ میں ہوا جس میں افغانستان کے شیخ الاسلام نے شرکت کی تھی۔اس جمعیۃ کی بڑھتی مقبولیت نے حکومت

برطانیہ کے کان کھڑے کردیئے اس لئے حضرت شیخ الہند نے دارالعلوم کے تحفظ کی خاطر مولانا سندھیؒ کو دیوبند سے دہلی منتقل کردیا۔

1331ھ،مطابق 1913ء میں دہلی میں نظارۃ المعارف القرآنیہ، کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کی سرپرستی میں آپ کے ساتھ حکیم اجمل خانؒ اور نواب وقار الملک بھی شریک تھے۔اس ادارہ کا مقصد عوام وخواص کی ذہن سازی تھا، بقول مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ:''یہ ادارہ دردمندان حریت کیلئے جائے اطمینان اور آزادی کی مساعیوں کیلئے خفیہ مشورہ گاہ تھا''اس ادارہ کا دفتر مسجد فتح پوری میں تھا۔ بڑے بڑے انقلابی لیڈروں مولانا ابوالکلام آزاد،مولانا محمد علی جوہر وغیرہ سے مولانا سندھیؒ اس ادارہ کو چلاتے رہے اور تحریک آزادی کیلئے افراد سازی کے منصوبے کی تکمیل میں سرگرداں رہے۔1332ھ،مطابق 1914ء میں جب جرمنی اور برطانیہ میں جنگ عظیم چھڑ گئی اور حالات کا دھماکہ خیز ہوگئے اور یہ ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ برطانیہ کو نقصان پہنچایا جائے اس سلسلہ میں حضرت شیخ الہندؒ نے مختلف اقدامات کئے ،حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو افغانستان روانہ کیا تاکہ حکومت افغانستان سے تحریک کیلئے ہمدردیاں حاصل کی جائیں خود حجاز مقدس کا سفر فرمایا تاکہ خلافت عثمانیہ سے فوجی امداد کی راہ ہموار کی جاسکے۔آپ کے خدام ومخلصین نے افغانستان میں مولانا سیف الرحمٰن کابلی اور حاجی صاحب ترنگ زئی کی سرکردگی میں انگریزوں سے باقاعدہ جنگ شروع کردی جو کچھ دنوں تک بہت کامیابی سے لڑی جاتی رہی۔

غالب نامہ شیخ الہندؒ کے حوالے

9/اکتوبر 1915ء کو آپ مکہ معظّمہ زادہا اللہ شرفا وعظمۃ پہنچے اور وہاں کے ترکی گورنر غالب پاشا سے ملاقات کر کے ہندوستان کی صورت حال سے مطلع کیا، غالب

پاشا نے مسلمانان ہند کے نام ایک پیغام حضرت شیخ الہندؒ کے حوالے کیا جس میں مسلمانوں کو ظالم انگریز کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی اپیل تھی۔ اس پیغام کو 'غالب نامہ' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ 'غالب نامہ' مولانا سید ہادی حسن رئیس خانجہاں پور مظفر نگر کے توسط سے ہندوستان پہونچایا انہوں نے حسب حکم اس کی نقلیں کر کے مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ تک پہنچادیں اور انہوں نے حضرت شیخ الہندؒ کے فرمان کے مطابق آزاد قبائلی علاقہ تک پہنچادیا۔ انگریز کی طرف سے سراغ رسانی کی انتھک کوششیں کامیاب نہ ہوسکیں۔ اس غالب نامہ نے آزاد قبائلی علاقوں میں جہاد حریت کا پورا ماحول تیار کردیا۔ اور علاقہ کے تمام خواتین اور با اثر علماء منتظر تھے کہ وسائل مہیا ہوتے ہی وہ اپنی قوم کے ساتھ مردانہ وار میدان جہاد میں کود پڑیں، برطانیہ کے آتش ظلم کو سرد کرنا جنہوں نے اپنا نصب العین قرار دے کر خلیفہ وقت کو ایک عرض داشت بتوسط حضرت شیخ الہندؒ روانہ کی جو بدقسمتی سے انگریز کے ہاتھ لگ گئی۔

ہندوستان کی جلاوطن حکومت

سفر حجاز سے قبل حضرت شیخ الہندؒ نے امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے دو کام نہایت اہم کئے۔ ایک تو یہ کہ ہندوستان کی جلاوطن حکومت ''حکومت موقتہ ہند'' میں شرکت کی، جس کے صدر مہاراجہ پرتاپ سنگھ اور وزیر اعظم مولانا برکت اللہ بھوپالی اور وزیر داخلہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ تھے۔ دوسرا اہم کام یہ ہوا کہ جنود ربانیہ کے نام سے ایک جماعت تشکیل دی گئی جس کا اصل مرکز مدینہ منورہ اور سالار اعظم حضرت شیخ الہندؒ قرار پائے۔ مولانا سندھیؒ نے ضروری خیال کیا کہ تحریک کے سلسلہ میں کابل میں ہونے والی سرگرمیوں سے حضرت شیخ الہندؒ کو باخبر کر کے مفید مشورے اور آئندہ کیلئے لائحہ عمل طے کیا جائے، چنانچہ مولانا سندھیؒ نے انتہائی راز دارانہ

طریقہ پر ایک خط ریشمی رومال پر تحریر کیا اور ایک خط مولانا محمد میاں منصور انصاری نے لکھا جس میں 'حکومت موقتہ' اور 'جنود ربانیہ' کی تفصیلات درج تھیں جن میں ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ارا کے تحریک کے اسماء بطور منصب وار ذکر کئے گئے تھے۔ نیز مولانا سندھیؒ کا ایک خط شیخ عبدالرحیم سندھیؒ کے نام تھا جس میں انہیں تاکید تھی کہ وہ مذکورہ تحریرات بحفاظت مدینہ منورہ پہنچادیں۔ یہ تینوں تحریریں مولانا سندھیؒ نے عبدالحق نامی ایک نومسلم کو دیں کہ وہ انہیں شیخ عبدالرحیم سندھیؒ کو پہنچادے، لیکن نہ معلوم کیا سبب ہوا کہ اس قاصد نے یہ تحریریں شیخ عبدالرحیم سندھیؒ کے بجائے اپنے سابق شناسا رب نواز کے حوالے کردیں جو انگریزوں کا ایجنٹ اور کاسہ لیس تھا، چنانچہ اس نے یہ سب خفیہ دستاویزات ملتان ڈویژن کے کمشنر کو پہنچا دیئے، کمشنر کے واسطے سے یہ تفصیلات سی آئی ڈی تک پہنچیں جس سے حکومت برطانیہ تحریک کی ہمہ گیری سے آگاہ ہوگئی اور اس کے بعد پورے ملک میں تحریک سے وابستہ افراد کی گرفتاریاں اور ان پر سختیاں شروع ہوگئیں۔

شیخ الہندؒ گرفتار کر لئے گئے

یہ خطوط 8,9 رمضان المبارک 1234ھ مطابق 9,10 جولائی 1916ء کو تحریک کئے گئے اور اگست 1916ء میں حکومت تک پہنچ گئے۔ تحریک کے راز فاش ہونے کے وقت حضرت شیخ الہندؒ حجاز میں مقیم تھے وہاں آپ کے سامنے ایک فتوی پیش کر کے دستخط کیلئے کہا گیا جس میں ترکوں کی تکفیر کی گئی تھی، آپ نے دستخط سے انکار کردیا جس کو بہانہ بنا کر شریف مکہ نے جدہ میں مقیم کرنل ولسن (معتمد برطانیہ) کے حکم پر حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقاء کی گرفتاری کا آرڈر جاری کردیا۔ چنانچہ 23 رصفر 1335ھ اتوار کی شب آپ کو اور آپ کے ساتھ مولانا وحید احمد فیض آبادیؒ، مولانا عزیر گلؒ اور

مولانا حکیم سید نصرت حسنؒ کو مکہ معظّمہ سے گرفتار کر کے جدہ بھیج دیا گیا، جب کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کو ایک روز قبل انگریزی حکومت کو برا کہنے کے پاداش میں مکہ معظّمہ کے جیل خانہ میں بھیج دیا گیا تھا۔ آپ نے کوشش کر کے اپنے آپ کو حضرت شیخ الہندؒ کے پاس جدہ پہنچایا۔ 17 ربیع الاول 1335ھ تک جدہ میں رہے۔

18 ربیع الاول 1335ھ، مطابق 12 جنوری 1917ء کو اسیران فرنگ کے اس مختصر قافلہ کو مصر روانہ کیا گیا جہاں جیزہ کے سیاسی قید خانہ میں تقریباً ایک ماہ رکھا گیا ،فرداً فرداً نہایت سختی سے تفتیش کی گئی اور الگ الگ کال کوٹھریوں میں تقریباً ایک ہفتہ رکھا گیا، ان دنوں ہر ایک کو پھانسی کا اندیشہ تھا۔ 24 ربیع الثانی 1335ھ، مطابق 16 فروری 1917ء کو جیزہ سے مالٹا روانہ کئے گئے جہاں 29 ربیع الثانی 1335ھ، مطابق 21 فروری 1917ء کو پہنچے اور روگیٹ کیمپ کے خیموں میں پہنچا دیئے گئے۔

حکیم سید نصرت کی شہادت

مولانا حکیم سید نصرت حسنؒ اسارت مالٹا کے 19 ماہ بعد ذی قعدہ 1336ھ کو چند ماہ بیمار رہ کر واصل بہ حق ہوئے اور شہید مالٹا ہو گئے۔ اور بقیہ حضرات یعنی شیخ الہندؒ و دیگر رفقاء 3 سال 16 دن مالٹا کی اسیری گزار کر 22 جمادی الثانی 1338ھ، مطابق 12 مارچ 1920ء بروز جمعہ رہا ہوئے اور تقریباً 3 ماہ کے سفر کے بعد 20 رمضان 1338ھ، مطابق 7 جون 1920ء کو بمبئی کے ساحل پر پہنچے جہاں ہزارہا افراد نے آپ کا پرتپاک استقبال کیا۔ استقبال کرنے والوں میں مہاتما گاندھی، مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ، مولانا شوکت علیؒ، مولانا حافظ محمد احمد مہتمم دارالعلوم دیوبند جیسے مشاہیر شامل تھے۔ بمبئی میں دو دن قیام رہا، خلافت کمیٹی کی طرف سے استقبالیہ جلسہ کیا گیا، اس کے بعد دہلی ہوتے ہوئے 27 رمضا 1338ء، مطابق 14 جون

1920 کو دیوبند پہنچے۔ راستہ میں ہر اسٹیشن پر زبردست ہجوم تھا، میرٹھ، مظفر نگر، دیوبند میں انسانوں کا سمندر بہہ رہا تھا۔ مالٹا سے واپسی کے عد کوڑہ جہان آباد، مراد آباد، امروہ، علی گڑھ وغیرہ کے اسفار کئے۔ 19 جولائی 1920ء کو آپ نے ترک موالات کا فتویٰ جاری کیا اور انگریز سرکار کے مکمل بائیکاٹ کا اعلان کیا۔ اسی فتویٰ کو تشریح کے بعد مولانا ابوالمحاسن سجادؒ نے مرتب فرمایا اور جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس دوم میں 474 علماء کے دستخطوں سے شائع کیا گیا۔ 29 اکتوبر 1920ء کو علی گڑھ کا سفر فرمایا اور وہاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حریف پسندوں کے آزاد ادارہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد رکھا۔

19 تا 21 نومبر 1920ء کو جمعیۃ علما ہند کا دوسرا اجلاس دہلی میں حضرت شیخ الہند کی صدارت میں عظیم الشان پیمانے پر ہوا۔ آپ شدید ضعف وعلالت اور بے پناہ نقاہت کی وجہ سے شریک اجلاس نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ کی کوٹھی پر تشریف فرما رہے۔ آپ کی طرف سے مفتی اعظم مفتی کفایت اللہؒ نے خطبہ صدارت تحریر فرما کر پیش کیا اور آخری اجلاس میں آپ کی انتہائی درمندانہ تقریر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے پیش کی اس اجلاس کے صرف 9 دن بعد 18 ربیع الاول 1339ھ مطابق 30 نومبر 1920ء کو قافلہ حریت کا عظیم قائد بلکہ امام کارواں رخصت ہو گیا اور دیوبند لے جا کر اس گنجینہ علم وسیاست کو دفن کر دیا گیا۔

☆☆☆

حکیم الامت

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ [12]

اس بات میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں کہ گزشتہ ڈیڑھ صدیوں میں جن علماء اور بزرگوں کی علمی و تصنیفی خدمات دعوتی و تبلیغی مساعی اور ان سے وابستہ اشخاص ورجال نے برصغیر کے دینی و علمی ماحول کو متاثر کیا اور انسانوں کے ایک بڑے طبقے کا رشتہ ان کے حقیقی خالق و مالک سے جوڑا، ان میں حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی فاروقی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۸۶۳ - ۱۹۴۳) کا اسم گرامی بہت ممتاز اور نمایاں ہے۔ انہیں ایک بڑے حلقے میں حکیم الامت کے لب سے یاد کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لقب ان کے اسم گرامی کے ساتھ نہایت مناسب اور موزوں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ حکیم الامت کی یہ ترکیب انہی کے لئے وضع ہوئی ہے۔ مجھے بچپن میں اپنے مربی و سرپرستی جد محترم حضرت میاں ثابت علی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۱۹۶۲ء ۹ اور بعض دوسرے بزرگوں کی زبانی جن قدسی صفات علماء اور بزرگوں کے نام اور کارنامے سننے کو ملے تھے، ان میں حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے خانوادے کے معروف عالم ومجاہد

[12] ماخوذ

حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ اور حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی فاروقی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اسمائے گرامی خصوصیت کے ساتھ نا قابل ذکر ہیں۔

حکیم الامت کی سرگرمیاں

ایسا شاہد ہی کوئی دن گزرتا رہا ہو، جس میں کسی نہ کسی کام یا شرعی حکم کے ذیل میں ان کا ذکر سننے میں نہ آیا ہو۔ میرے نانا محترم شرفِ ارادت تو حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے رکھتے تھے۔ لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی انہیں بے پناہ عقیدت تھی۔ دینی و فقہی مسائل کے سلسلے میں سب سے پہلے ان کی نگاہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ہی کی طرف اٹھتی تھی۔ اپنے حلقہ بگوش کو بھی وہ ہمیشہ اٹھی کی کتابوں کی طرف متوجہ فرماتے تھے۔

شاید اسی خاص ماحول، ان بزرگوں کے احوال وکوائف سننے اور بچپن کی مخصوص ذہنی و فکری تربیت کا ہی نتیجہ ہے کہ میں گرچہ زندگی کے مختلف نشیب و فراز سے گزرا ہوں، بہ وجوہ بارہ برس کی عمر میں میں نے گھر چھوڑ دیا، وطن کی رنگینیوں اور رعنائیوں سے دور ہی رہا، اس دوران میں کیسے کیسے لوگوں سے سابقہ پیش آیا، کیسے کیسے افکار و نظریات کے لوگوں میں رہا اور کیسی کیسی جماعتوں اور تنظیموں سے اور ان کے افراد و زعماء سے دور و نزدیک کے تعلقات رہے لیکن ان بزرگوں کے روحانی سحر سے میں نے خود کو کبھی آزاد محسوس نہیں کیا۔ کتاب و سنت اور عقائد صحیحہ سے ہمیشہ رشتہ استوار رہا۔ الحمد للہ کسی غلط نظریہ و فکر کا اثر میں نے کبھی قبول نہیں کیا۔ ہمارے مرحوم دوست والی آسی کا بہت مشہور شعر ہے۔

میں چلتا رہا سر اٹھائے ہوئے
مرا قتل ہر روز ہوتا رہا

حکیم الامت کی علمی خدمات

یہ شعر میری اس خانہ بدوشانہ زندگی پر پوری طرح صادق آتا ہے۔

حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ ستودہ صفات دین پسند حلقوں کیلئے آج بھی باعث فیض و برکت ہے۔ان کی دینی وروحانی خدمات کے نور سے ایک دنیا منور ہے۔انہوں نے زبان وقلم کے ذریعے رسول کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے نقوش حیات کو اجاگر کرنے کا ایسا کارنامہ انجام دیا کہ ایمان ویقین سے تعلق کر ھنے والا انسانوں کا ایک بڑا طبقہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ وہ اپنے اندر علم ومعرفت کا ایک جہاں سمیٹے ہوئے تھے، وہ بہ یک وقت قرآنی علوم کے عالم بھی تھے اور احادیث وسیرت کے رمز شناس بھی، حقیقی تصوف جس کا مناسب نام احسان ہے کے سمندر کے غوطہ زن بھی تھے اور علم فقہ کے اداشناس بھی اور اپنے عہد کے بے مثل واعظ ومتکلم بھی۔

حکیم الامت کا مقام اور مرتبہ

ہمارے مذہبی حلقوں میں ''عالم باعمل'' کی اصطلاح بہت مقبول ہے۔اسے ان علماء کے ناموں کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔جنہیں ان کی ذاتی زندگی میں نیک، متقی اور خداترس تصور کیا جاتا ہے۔ جہاں تک میں نے مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات سنے ہیں اور ان کے مواعظ وملفوظات کا مطالعہ کا ہے، اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ اصطلاح ماضی قریب یا موجودہ عہد میں سب سے زیادہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام کے ساتھ موزوں اور مطابق حال معلوم ہوتی ہے۔ مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا کہ میری اس رائے کو ''پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا'' سے تعبیر کردیا جائے۔لیکن جو لوگ خالی الذہن ہوکر اس پر غور کریں گے اور انکی دعوتی،

اصلاحی اور تربیتی زندگی کا مطالعہ کریں گے ان شاء اللہ وہ میری بات کی سب تصویب کریں گے۔گزشتہ صدی کی مذہبی شخصیتوں کی تاریخ اور انکی سیرتکا مطالعہ کریں تو ایسی شخصیتیں بہت کم ملیں گی، جنہوں نے عوامی زندگی اور اصلاح وتربیت کے منصب پر فائز ہوتے ہوئے اتنی بااصول اور منظّم ومنضبط زندگی گزاری ہو۔

ان کی زندگی کا کوئی گوشہ شاید ہی بے اصول اور قول وعمل کے تضاد سے داغ دار ہو۔ان کی پوری زندگی عامۃ المسلمین کی دینی، اصلاحی اور علمی رہ نمائی سے عبارت ہے۔انہوں نے اپنے مشاغل شب وروز کے لئے جو اصول اور ضوابط بنائے تھے تمام عمر اس کی پابندی کی اور ایسی پابندی کی کہ کبھی اس کے سامنے کسی بری سے بڑی شخصیت یا عہدہ ومنصب کی رعایت نہیں فرمائی۔ اس سلسلے میں ان کے بے شمار واقعات کتابوں میں موجود ہیں اور اہل علم کی زبانوں سے بھی سننے کو ملتے ہیں۔مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ پوری عمر تصنیف وتالیف، دعوت وتبلیغ اور اصلاح وتربیت کے مشغلے سے وابستہ رہے۔ ان کی کتابوں کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے۔ منتسبین ووابستگان ہزاروں کی تعداد میں ہیں، جن کو ایک بڑی جماعت کی حیثیت حاصل ہے۔مولانا کے اندر شخصیت سازی اور تعمیر سیرت کی بے پناہ صلاحیت تھی۔ان کے فیض تربیت سے ایسے ایسے آفتاب وماہتاب پیدا ہوئے، جنہوں نے اپنے مرشد کی وفات کے بعد ان کے مشن کو آگے بڑھایا اور دعوت واصلاح کے میدان میں بڑی نمایاں خدمات انجام دیں۔ان میں حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوری ثم الہ آبادی، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مسیح اللہ خان شیروانی، حضرت مولانا شاہ ابرارالحق حنفی، حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحی عارفی، خواجہ عزیزالحسن مجذوب، حضرت مولانا سراج احمد خان امروہوی، حضرت مولانا سید حامد حسین امروہوی اور حضرت مولانا اسعد اللہ رامپوری رحمۃ اللہ علیہما کے اسمائے گرامی نہایت

روشن وتابناک ہیں۔ یہ سب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی غیر معمولی جدوجہد، اصول اور ضابطوں کی بے رو رعایت پاس داری، اوقات کی مناسب تقسیم اور طے شدہ معمولات پر سختی سے پابندی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے اپنے اصول وضوابط اور معمولات پر کاربندرہ کرتنِ تنہا وہ کام انجام دیا، جو کسی بڑے ادارے کا متقاضی تھا۔

دعوت وتبلیغ میں درجہ کامل حاصل تھا

حضرت تھانویؒ قرآن وحدیث، فقہ وتفسیر اور معرفت وسلوک میں غیر معمولی امتیاز وتفوق کے علاوہ نفسیات شناس بھی تھے۔ انسانوں کی نفسیات میں انہیں گہرا درک حاصل تھا۔ کس انسان سے کب اور کیا برتاؤ کیا جائے، اس سے وہ بہ خوبی واقف تھے۔ یہ وہ خوبی ہے، جو اصلاح وتربیت اور دعوت وتبلیغ کے کام کیلئے نہایت ناگزیر ہے۔ اس صلاحیت کے بغیر اس راہ میں کوئی مفید خدمت انجام نہیں دی جاسکتی۔ اس کے بغیر جو بھی کام ہوگا، وہ اطمینان بخش نہیں ہوگا۔ جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اب تک جتنے بھی داعی، مبلغ اور مصلح ہوئے ہیں، انہوں نے اپنی اسی نفسیات شناسی اور مزاج رسی کی بدولت کامیابی حاصل کی ہے۔ مولانا عبد الماجد دریابادی کی کتاب ''حکیم الامت'' مولانا تھانوی کی زندگی کے اسی رخ کو پیش کرتی ہے۔ حفیظ جون پوری انیسویں صدی کے اواخر اور بیسوی صدی کے اوائل کے ایک مشہور وباکمال شاعر گزرے ہیں۔ یہ حضرت امیر مینائی کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے تھے۔ اس عہد کے بڑے بڑے اساتذہ فن نے ان کے شعری کمالات کا اعتراف کیا ہے۔ یہ شعر وسخن میں یکتائی کیساتھ جون پور کے بڑے زمین داروں میں بھی تھے۔ اس وقت کے زمین داروں میں بالعموم جو اخلاقی اور سماجی خرابیاں ہوتی تھیں، وہ ان میں بھی موجود تھیں۔ شراب وشباب ان کا خاص مشغلہ تھا۔ ان کی زندگی کا یہ پہلو جون

پور سے پٹنہ تک مشہور تھا۔ ایک بار انہوں نے جون پور میں حضرت تھانوی کا وعظ سنا۔ انہیں اپنی زندگی پر شدید پشیمانی ہوئی۔ وہیں مجلس میں بیٹھے بیٹھے ایک عریضہ لکھ کر مولانا تھانویؒ کی خدمت میں پیش کیا، جس میں انہوں نے اپنی اب تک کی زندگی پر اظہار تاسف وپشیمانی کیا تھا اور توبہ وبیعت کی خواہش بھی ظاہر کی تھی۔

ایک عجیب واقعہ

شاعر حفیظ جون پوری کچھ دنوں کے بعد تھانہ بھون ضلع مظفر نگر پہنچے۔ وہاں پتہ چلا کہ مولانا کسی جلسے میں شرکت کے لئے دیوبند تشریف لے گئے۔ وہ فوراً وہاں سے دیوبند کے لئے روانہ ہوگئے۔ دیوبند پہنچے تو حضرت مولانا تھانہ بھون کے لئے روانہ ہوچکے تھے۔ وہ پھر وہاں سے تھانہ بھون پہنچے اور حضرت تھانوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جون پور کی ملاقات کا حوالہ دیا، اپنی ماضی کی زندگی پر اظہار تاسف کیا اور بیعت کی خواہش کا اعادہ کیا۔ حفیظ صاحب کے چہرے پر داڑھی کے معمولی بال تھے، جنہیں دیکھ کر یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ یہ محض سفر میں شیو کرنے کا موقع نہ ہونے کی وجہ سے اُگ آئے ہیں۔ مونچھیں البتہ لمبی تھیں۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ مولانا تھانوی بیعت کے معاملے میں بہت محتاط واقع ہوئے تھے۔ کافی دن دیکھنے اور پرکھنے کے بعد ہی بیعت کا فیصلہ فرماتے تھے۔ البتہ اصلاح کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ لیکن چونکہ وہ ایک عارف تھے اور انسانی مزاج وطبائع کی شناخت رکھتے تھے، اس لئے انہوں نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا کہ حفیظ صاحب طلبِ صادق لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ انہوں نے بیعت کے لئے جمعہ کی نماز کے بعد کا وقت مقرر کردیا۔ مولانا کا یہ رویہ خانقاہ میں موجود لوگوں کے لئے حیرت ناک تھا۔ ایک نو وارد اور بہ ظاہر بے دین شخص کی طرف مولانا کا یہ التفات ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ لیکن کہا کسی نے کچھ

نہیں۔ وقتِ مقرر پر حفیظ جون پوری بیعت کے لئے حاضر ہوئے تو ان کا چہرہ بالکل صاف تھا۔ داڑھی کے نام سے ایک بال بھی چہرے پر نہیں تھا۔ مولانا تھانوی نے انہیں دیکھا، کچھ دیر دیکھتے ہی رہے۔

حفیظ صاحب کی صاف گوئی

حفیظؔ سمجھ گئے کہ حضرت بہ زبانِ خاموشی مجھ سے فرمارہے ہیں کہ ''اللہ کے بندے اگر تو نے اسے بڑھایا نہیں تو منڈاتے بھی نہیں۔'' قبل اس کے کہ مولانا کچھ فرماتے حفیظؔ صاحب خود ہی گویا ہوئے: حضرت! میں بیعت کے لئے حاضر ہوا ہوں، اب تو مجھے ہر بات آپ ہی کی ماننی ہے۔ چوں کہ میں ہمیشہ اسی حال میں رہتا ہوں، اس لئے میں نے اسے صاف کرانا ضروری سمجھا۔ تاکہ آپ سے میری کوئی بات پوشیدہ نہ رہے۔ مولانا کے ہاں صاف گوئی کی بڑی قدر تھی۔ انہوں نے بغیر کسی ڈانٹ پھٹکار کے انہیں اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کرلیا۔ چند روز قیام کے بعد حفیظ صاحب اپنے وطن آگئے، خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اپنے حالات اپنے مرشد کو لکھ کر بھیجتے اور رہ نمائی حاصل کرتے رہے۔ اس کے بعد حفیظ جونپوری میں ایسی تبدیلی آئی کہ اس عہد کے بڑے بڑے علماء اور زہاد کو ان پر رشک آنے لگا۔

انہوں نے اپنی شاعری کے سلسلے میں بھی مولانا کی مرضی دریافت کی تھی کہ حکم دیں تو شاعری ترک کردوں۔ مولانا نے فرمایا: ترکِ سخن مناسب نہیں۔ البتہ حکمت وموعظت کی باتوں کو موضوع بنانے کا التزام کیا جائے۔ اس سلسلے کا حفیظ جون پوری کا یہ شعر اپنے زمانے میں بہت مشہور ہوا تھا:

کرے بیعت حفیظؔ اشرف علی سے
بہ ایں غفلت یہ ہشیار تو دیکھو

حکیم الامت کی حکمت

بات آگئی ہے تو اسی ذیل کا ایک واقعہ سنتے چلئے۔ جگر مرادآبادی اردو دنیا کا ہر فردِ بشر واقف ہے۔ یہ اپنے زمانے کے نہایت مقبول اور ہر دل عزیز شاعر تھے۔ غزل سے ان کے مزاج کو خصوصی مناسبت تھی۔ اسی وجہ سے انہیں اردو دنیا میں رئیس المعزلین یا سلطانِ تغزل کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ آج بھی ان کے اشعار ذوق وشوق کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ جتنی شہرت ان کی غزلوں کو حاصل تھی، اتنی ہی یا اس سے کچھ کم وبیش ان کی زندگی وسرشاری کو بھی حاصل تھی۔ ہر وقت نشے میں رہتے تھے۔ بلانوشی کی اصطلاح شاید ایسے ہی لوگوں کے لئے وضع ہوئی ہو۔ ان کی رندی، سرشاری اور بادہ خواری کے سیکڑوں واقعات مشہور ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ وصف بھی تھا کہ خواہ وہ کتنی بھی پیئے ہوئے ہوں، کبھی آپے سے باہر نہیں ہوئے۔ ہمیشہ سنجیدگی کے دائرے میں رہتے تھے۔ علماء اور بزرگوں کا ہر حال میں اور بے حد احترام کرتے تھے۔ جگرؔ صاحب ایک روز مظفرنگر یا سہارن پور کے کسی مشاعرے میں شرکت کے لئے جارہے تھے۔ اسٹیشن پر ان کی ملاقات حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور خلیفہ خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ سے ہوگئی۔

خواجہ صاحب بھی بلند پایہ شاعر تھے۔ دونوں بڑے تپاک سے ملے۔ پوچھا کہاں جارہے ہو؟ حضرت مجذوب نے بتایا کہ تھانہ بھون جارہا ہوں، حضرت مرشد سے ملاقات کے لئے۔ جگرؔ صاحب بے چین ہوگئے اور کہا: ''میری بھی دیرینہ خواہش ہے کہ میں بھی حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر دو۔ لیکن کیا کروں، اپنی بلانوشی کی وجہ سے ہمت نہیں کر پاتا''۔ مجذوب صاحب نے فرمایا: ہاں یہ بات تو درست ہے۔ حضرت کے ہاں اس سلسلے میں بڑی سختی ہے۔ اس حال میں کبھی مت آجانا۔ کچھ دیر

میں دونوں اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔عصر بعد کی مجلس میں مجذوب صاحب پر بہت ناراض ہوئے۔کہا تم نے انہیں آنے سے کیوں روک دیا۔ یہ تو درست ہے کہ میرے ہاں سختی و پابندی زیادہ ہے۔لیکن یہ پابندیاں یا سختیاں شخصیتوں کو دیکھ کر عائد ہوتی ہیں۔جگر اس سے مستثنیٰ ہیں۔تمہیں انہیں آنے دینا چاہئے تھا۔کیا عجب کہ یہاں آنا ہی ان کی اصلاح کا ذریعہ بن جاتا۔

جگر اور مجذوب کی ملاقات

کچھ دنوں کے بعد پھر اسی جگہ پر جگر اور مجذوب کی ملاقات ہوئی۔علیک سلیک کے بعد مجذوب صاحب نے بتایا کہ میں نے آپ سے اس دن کی ملاقات کا تذکرہ حضرت سے کیا تھا۔جگر صاحب نے نہایت اضطراب اور بے چینی کیس اتھ حضرت تھانوی کا تاثر معلوم کرنا چاہا۔مجذوب صاحب نے بتایا کہ حضرت مجھ پر بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ تمہیں انہیں آنے دینا چاہئے تھا۔تم نے یہاں کی سختی اور پابندی کا تذکرہ کر کے ناحق انہیں روک دیا۔ جگر صاحب اس پابندی سے مستثنیٰ ہیں۔بس یہ سننے کے بعد جگر مرادآبادی کہیں اور جانے کا ارادہ ملتوی کر کے مجذوب صاحب کے ہمراہ تھانہ بھون کے لئے چل پڑے۔قصبے میں پہنچ کر کسی مسجد کے غسل خانے میں غسل کیا اور خانقاہ اشرفی میں حاضر ہوئے۔حضرت تھانوی بڑے تپاک سے ملے۔ کچھ دیر گفتگو کے بعد ان سے کلام کی فرمائش کی۔جگر صاحب نے وہ غزل سب سے پہلے اسی مجلس میں پڑھی تھی۔جس کا مطلع یہ ہے:

جان کر من جملۂ اربابِ مے خانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

جب یہ شعر پڑھا تو جگر کی ہچکیاں بندھ گئیں:

ننگِ مے خانہ تھا میں، ساقی نے یہ کیا کر دیا
پینے والے کہہ اٹھے یا پیرانِ مے خانہ مجھے

حکیم الامت کا اصلاحی طور طریقہ

جگر نے دو تین روز وہیں قیام کیا۔اسکے بعد ان کی زندگی یکسر بدل گئی اور ہمیشہ وہ مصلیٰ در بغل رہنے لگے۔یہ دونوں واقعات یہ بتانے کیلئے کافی ہیں کہ حضرت تھانوی واقعتاً حکیم الامت تھے۔افراد امت کے حالات وکوائف باریک بینی سے دیکھتے اور انکے امراض کا علاج کرتے تھے۔انکی اسی حکمت ودانائی اور فہم وتدبر کے باعث سیکڑوں گم گشتگانِ راہ کو منزل نصیب ہوئی۔مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ گروہی ومسلکی تعصّبات سے بلند ہوکر سوچنے کے عادی تھے۔ ہر بات میں حکمت واصلاح کے پہلو نکالنا۔دین کے وسیع مقصد کو سامنے رکھ کر اسکے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا اور اپنے وابستگان ومنتسبین کو بھی اسکی طرف متوجہ کرنا انکا خاص مزاج تھا۔اس سلسلے کے انکے متعدد واقعات آج بھی اہل علم ودانش کی مجلسوں میں سننے کو ملتے ہیں۔مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی (۱۸۵۶-۱۹۲۱ء) کے مسلک ومشرب کا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں۔وہ اپنے نقطۂ نظر کے اظہار میں بڑے سخت واقع ہوئے تھے۔انکے مزاج کی یہ سختی اس درجے کو پہنچ چکی تھی کہ بعض علماء کے بارے میں انہوں نے کفر کا فتویٰ دے ڈالا تھا۔جب ان کا انتقال ہوا تو مولانا تھانوی کی مجلس میں کسی نے اطلاع دی کہ احمد رضا خاں کا انتقال ہوگیا۔مولانا کو یہ بات پسند نہ آئی کہ اتنے بڑے عالم کا نام بس یوں ہی جناب اور صاحب کے بغیر لے لیا جائے۔ فرمایا: کون؟ مولانا رضا خاں بریلوی؟ اطلاع دینے والے نے کہا: جی ہاں۔فرمایا: اناللہ وانا الیہ راجعون۔آیئے ان کیلئے دعائے مغفرت کریں۔ہاتھ اٹھا کر کافی دیر تک

ان کے حق میں دعا فرماتے رہے۔ حاضرین نے بھی ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔ لیکن ان میں بعض لوگ ایسے تھے، جنہیں یہ بات ناگوار خاطر ہوئی۔ جب مولانا دعا فرما چکے تو ایک نے کہا: حضرت! حیرت ہے کہ آپ نے ایک بدعتی کا نام تعظیم کے ساتھ لیا۔ مولانا نے فرمایا: وہ بدعتی نہیں تھے، محبتی تھے۔ جب کسی کو کسی سے محبت ہوتی ہے تو اس میں غلو کے بھی امکان ہوتے ہیں۔ ابھی مولانا نے اپنی بات پوری کی ہی تھی کہ ایک دوسرے صاحب بول پڑے کہ حضرت! وہ تو آپ کو کافر کہتے تھے۔ پھر بھی آپ نے ان کے لئے دعائے مغفرت فرمائی۔ مولانا نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں فرمایا: ''میاں! مجھے وہ کافر اس لئے کہتے تھے کہ وہ مجھے کافر سمجھتے تھے۔ میری کسی بات سے انہوں نے یہی نتیجہ نکالا ہوگا کہ میں کافر ہوں۔ اگر وہ مجھے کافر سمجھتے ہوئے بھی ''کافر'' نہ کہتے تو وہ خود کافر ہو جاتے۔ یہ فقہ کا مسلمہ مسئلہ ہے۔'' اعظم گڑھ کے کسی گاؤں سے ایک صاحب نے مولانا کو خط لکھا۔ اس کا متن کچھ اس طرح تھا:

حکیم الامت کی حق گوئی

''میں آپ کے خلیفہ مولانا عبدالغنی پھول پوری رحمۃ اللہ علیہ کا مرید ہوں۔ میں نے گزشتہ برس مدرسۃ الاصلاح میں اپنے بیٹے کا داخلہ کرایا ہے۔ الحمدللہ! داخلے کے بعد سے میرے بیٹے میں کافی تبدیلی آئی ہے۔ نمازیں پڑھتا ہے، گاؤں کے خراب بچوں سے الگ رہتا ہے اور جی لگا کر تعلیم بھی حاصل کر رہا ہے۔ میرے بعض اعزہ کے بچے بھی اسی میں پڑھتے ہیں۔ وہاں پڑھانے میں مجھے بڑی سہولت ہے۔ لیکن میرے مرشد مولانا عبدالغنی صاحب کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ بچے کو اس مدرسے سے اٹھالو، وہاں کی فکر صحیح نہیں ہے۔ بچہ آزاد خیال ہو جائے گا اور قرآن کو حدیث وتفسیر سے سمجھنے کی بجائے اپنی عقل سے سمجھنے کی کوشش کرے گا۔ میرے مرشد

نے یہاں تک فرمادیا کہ بچے کو وہاں سے ہٹالو ورنہ میں بددعا کردوں گا۔ جب کہ میرا بیٹا بھی اسی مدرسے میں پڑھنا چاہتا ہے۔ اب آپ فرمائیں میں ایسی صوت میں کیا کروں؟'' مولانا نے خط کا مختصر جواب دیتے ہوئے فرمایا: اگر آپ اس بات سے مطمئن ہیں کہ آپ کے بیٹے کی وہاں صحیح تعلیم ہو رہی ہے اور آپ کا بیٹا بھی وہیں پڑھنا چاہتا ہے تو آپ اسے وہیں پڑھنے دیجئے۔ مولوی عبدالغنی کی بددعا کی فکر مت کیجئے۔ اگر وہ بددعا کریں گے تو میں یہاں سے دعا کردوں گا۔ قارئین ان دو واقعات سے اس بات کا پورا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اصلاح وتربیت کے سلسلے میں مولانا کی کیا سوچ تھی اور ہر بات سے وہ کس طرح مفید اور مثبت پہلو نکالتے تھے۔

اشرف علی دراصل ایک ادارے کا نام

مولانا تھانویؒ بے حد منظّم اور بااصول شخص تھے۔ انہوں نے اسی نظم وضبط اور اصول وضوابط کی روایت کو اپنے مریدوں اور قریب رہنے والوں میں بھی پروان چڑھانے کی کوشش کی۔ اس سے انکی غرض صرف یہی تھی کہ لوگوں کو سکون اور راحت حاصل ہو۔ ان کا احساس تھا کہ نظم وضبط اور اصول پسندی کے بغیر کوئی دعوت یا تبلیغ موثر نہیں ہوگی۔ یہ مولانا تھانویؒ کی زندگی کا ایک ایسا وصف ہے، جو ہمارے آج کے داعیوں، مربیوں اور مبلغوں کی زندگیوں میں مفقود ہے۔ قیقت یہ ہے کہ اشرف علی تھانویؒ کسی شخص یا فرد کا نام نہیں، بلکہ ایک علمی، روحانی اور تربیتی ادارے کا نام ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک ایسی دانش گاہ تھے، جس نے اصلاح وتربیت کے لاتعداد پیاسوں کی پیاس بجھائی۔ وہ سلسلہ بالواسطہ طور پر آج بھی جاری ہے۔

آج کے دور میں دعوت وتبلیغ اور اصلاح وتربیت کا کام کرنے کیلئے انکی تعلیمات مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ☆☆☆

مولانا محمد علی جوہرؒ

مولانا محمد علی جوہر کی ولادت 10؍دسمبر 1878ء میں شہر رامپور میں ہوئی۔ ابھی آپ شیر خوار ہی تھے یعنی تقریباً دو سال کی عمر میں آپ کو یتیمی کا داغ سہنا پڑا۔ تاریخ گواہ ہے کہ قدرت جس شخص سے دنیا میں کوئی بڑا کام لینا چاہتی ہے اسے بچپن ہی میں ماں یا باپ کی آغوش شفقت سے جدا کر دیتی ہے۔ آپ کے والد محترم مولانا عبد العلی خاں کے انتقال کے بعد آپ کی والدہ محترمہ آبادی بانو بیگم جو آگے چل کر سیاست میں بی اماں کے نام سے مشہور ہوئیں انہوں نے نہایت ہی صبر و استقلال کے ساتھ عمدہ طریقے سے اپنے بچوں کی پرورش کی اور انہیں نفیس و اعلیٰ تعلیم سے نوازہ۔ ابھی آپ زیر تعلیم ہی تھے کہ شہرت نے آپ کے قدم چومنا شروع کر دیا۔ طالب علمی کے دور ہی میں موصوف کو ہر ایک سے بے تکلف گفتگو کرنے کی جرأت پیدا ہوئی۔ آپ کی طبیعت میں خوشامد، تعصب اور حمایت بالکل نہیں تھی۔ آپ کا ظاہر و باطن دونوں یکساں تھا۔ جو خیال دل میں تھا وہی زبان سے عیاں ہوتا تھا۔ آپ سب سے غمخوار ہمدرد تھے۔ دوسروں کے درد و غم کو اپنا سمجھنا آپ کی زندگی کی اصل مقصد تھا۔ یہ شعر آپ کے مزاج کی نشاندہی کرتا ہے۔

خنجر چلے کسی پر تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

انقلابی رسالہ ''کامرید'' نکالا

مولانا محمد علی جوہر نے علی گڑھ سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ پھر اعلیٰ تعلیم کی غرض سے انگلستان کا سفر کیا اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ 1902ء میں واپس ہندوستان لوٹ آئے۔ وطن پرستی کا مادہ آپ کی طبیعت میں پہلے ہی سے موجزن تھا۔ آپ حقیقت میں بڑے ذہین، بلند و اعلیٰ شخصیت کے مالک تھے۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں مضمون نگاری کا شوق تھا۔ آپ کے اکثر مضامین Times of India ٹائمس آف انڈیا میں شائع ہوا کرتے تھے۔

1911ء میں آپ نے خود ایک انقلابی رسالہ ''کامرید'' نکالا۔ جس سے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ نثر میں شاعری کا فن آپکے مزاج کا ایک جز بن گیا تھا۔ جس سے ہر طرف تعارفی کلمات کا ایک دریا بہتا نظر آیا۔ 1912ء میں آپ کا ایک اور رسالہ منظر عام پر آیا جو ''ہمدرد'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس وقت مولانا صرف ایک ایڈیٹر ہی نہیں تھے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر صحیح معنوں میں ایک بے باک سیاسی لیڈر اور رہنمائے قوم وملت تھے۔ ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ قوم ان کی نہیں بلکہ آپ قوم کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔

1914ء میں جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تب آپنے بڑی ہی ذہانت وخرد مندی سے اپنے انقلابی خیالات کو بذریعہ قلم لوگوں تک پہنچایا۔ اس وقت آپ کا ایک ایک لفظ تیر ونشتر کی طرح فرنگیوں کے دلوں میں پیوست ہوتا جا رہا تھا۔ آپ کے ان انقلابی خیالات کی وجہ سے حکومت وقت نے آپ کو نظر بند کر دیا۔ تقریباً پانچ سال

تک آپ حکومت کی حراست میں رہے۔اس طرح کئی بار فرنگیوں نے آپ کو قید کیا۔ جس سے آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ قید خانے کی نذر ہوا۔انہیں ایام میں آپ کی شاعری کے جوہر بھی چمک اٹھے اور ایک مظلوم کی زبان بن کر نالہ،فریاد کرنے لگے۔ ایک جگہ یوں لکھتے ہیں:

ہوں لاکھ نظر بند، دعا بند نہیں میں
اللہ کے بندوں کو نہ اس طرح ستا دیکھ

آپ کانگریس کے صدر بن گئے

جب آپ کو اسیری سے رہا کر دیا گیا تو آپ کی سیاسی شخصیت میں اور اضافہ ہوا۔ پھر آپ کو انڈین نیشنل کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا اسی اثناء میں آپ کی زندگی میں ایک سانحہ یہ پیش آیا کہ آپ کی لخت جگر نورِ نظر آپ کو داغ مفارقت دے گئے۔ جس سے آپ کا دل بیٹھ گیا۔مگر آپ نے وطن سے محبت کا رشتہ نہیں توڑا۔ ہندوستان کی آزادی گویا آپ کی زندگی کا ایک مقصد تھا۔آپ کے دل کی دھڑکن تھی۔اسی مقصد سے آپ نے پھر ایک دفعہ 1931ء میں لندن سے سفر کا ارادہ کیا۔یہ سفر آپ کی زندگی کا اہم اور آخری سفر تھا۔محالفت کے ایک گروپ نے یہ خیال کیا کہ اب اس خاکستر کی زبان وبازوؤں میں اتنی توانائی کہاں مگر یہ خدا کی دین تھی کہ آپ جب بولنے پر اتر آئے تو فرنگی اور چند ہندوستانی غدار خود حیرت میں پڑ گئے اور کہا کہ یہ انسان، انسان نہیں بلکہ ایک متحرک آتش چٹان ہے۔ پھر آپ نے پہلی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں پر جوش خالص وطن پر تقریر کی اور کہا کہ ہندوستان کو آزادی چاہئے آزادی اگر آج تم وہ آزادی ہندوستان کو نہیں دو گے تو میں یہاں اپنی جان دے دوں گا۔اور پھر تم کو میری قبر کے لئے یہیں دو گز زمین دینی پڑے گی مہاتما گاندھی کی

جئے۔آپ کے یہ بول سننے کے بعد کچھ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ آپ مستقبل کو بالکل قریب سے دیکھ رہے تھے۔آزادی کا پرچم تو ان دنوں نہیں لہرایا۔مگر آپ نے جو عہد کیا تھا مالک نے اس کی آبرو رکھ لی۔ بتاریخ 4/جنوری 1931ء کو مشیت الٰہی نے یہ نعمت عظمی واپس طلب کر لی۔روح تو سرزمین لندن ہی میں پرواز کر گئی۔مگر آپ کے جسد مبارک کو مقدس سرزمین بیت المقدس قبلہ اول میں سپرد خاک کیا گیا۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

آپ کی موت پر نہ صرف چند ایک کو افسوس رہا ہے بلکہ سرزمین ہندوستان اور عالم اسلام کا ایسا کوئی گوشہ باقی نہیں رہا۔مولانا محمد علی جوہر نہ صرف ایک قوم وملت کے پیشوا اور بے باک سیاسی لیڈر تھے بلکہ ایک نام نہاد شاعر بھی تھے۔ جوہر آپ کا تخلص تھا آپ نے جو کچھ بھی لکھا ہے بے ساختہ لکھا۔جس کو اصلاح وترمیم کی ضرورت نہیں پڑی۔آپ کے اکثر شعر بہت مشہور ہوئے جیسے آپ کا یہ شعر آج ہر ایک کے دل میں پیوست ہو گئے ہیں۔

قتل حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد
پیغام ملا تھا جو حسینؓ ابن علیؓ کو
خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لئے ہیں

مولانا صبر وجمیل کا پیکر تھے

مولانا محمد علی جوہر حقیقت میں صبر وجمیل کا ایک پیکر تھے۔کئی بار آپ پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ برق نے آشیاں جلایا۔مگر آپ کے لبوں پر آہ وفغاں کا نام

تھا نہ چہرے پر کوئی غم کی لکیر تھی۔ موت کس کو نہیں آتی سبھی تو راہ عدم چلتے ہیں۔ مگر انسان کی زندگی کا کچھ ایک مقصد ہوتا ہے قضا تو سب کی نصیب میں لکھی گئی ہے مگر محمد علی کی موت، موت نہیں بلکہ ایک زندگی نظر آتی ہے۔ رشید احمد صدیقی نے کہا تھا کہ: ''ولادت تو مادرزاد ہوتی ہے لیکن محمد علی کی موت خانہ زاد تھی''۔ عام طور پر موت اپنا شکار خود منتخب کرتی ہے لیکن محمد علی نے خود موت کو منتخب کیا ہے۔

فرماتے ہیں:

قضا کس کو نہیں آتی یوں تو سب ہی مرتے ہیں
پر اس مرحوم کی بوئے کفن کچھ اور کہتی ہے

''آپ کی موت پر مہاتما گاندھی جی نے اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کی موت اس وقت ہوئی جب کہ ہمیں ان کی سخت ضرورت تھی۔ انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے زبردست کام کیا ہے۔ اگر وہ کچھ دن اور زندہ رہتے تو وہ برطانوی سامراج کے خلاف لڑنے والوں کی ایک بار پھر رہنمائی کرتے اور پورا ملک ان کے دوش بدوش ہو کر لڑتا''۔

ملک وملت کی جنگ اب بھی جاری ہے لیکن نعرۂ جنگ خاموش ہے فتح وشکست تو اسی لئے ہے کہ فتح وشکست ہوتی رہے۔ لیکن جنگ آزما کہاں ہے۔ شہادت کس کو نصیب ہوگی ایسا حسین کہاں جسے یزید کی تلاش تھی۔

بے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

☆☆☆

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں رح [14]

مسیح الملک حکیم اجمل خاں (1927 - 1868ء) انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول کی ایک ایسی ہمہ صفت موصوف شخصیت کا نام ہے جو تاریخ کے صفحات پر اپنے کارناموں کی وجہ سے ہمیشہ تابندہ رہے گی۔ بہ حیثیت ایک طبیب حاذق عوام وخواص کیلئے ان کی معالجانہ خدمات، قومی وملکی معاملات میں ان کی قیادت، ملک کی آزادی کی تحریکات میں ان کی بااصول رہنمائی، علمی کاموں میں ان کا انہماک۔ یہ سب وہ باتیں ہیں جو ماضی قریب کی تاریخ کا ایک نمایاں باب ہیں، طب یونانی کو جدید ہندوستان میں ایک باوقار مقام دلانے میں ان کی کوششیں انتہائی لائق ستائش ہیں۔

طب یونانی میں جدید تحقیقیں

طب یونانی میں جدید تحقیق شروع کرنے کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ سب سے پہلے اپنے قائم کردہ ادارے آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج میں طبی ریسرچ کا شعبہ انہوں نے ہی قائم کیا تھا۔ اطباء کے حقوق کی پاسداری کے لئے انہوں نے آل انڈیا

[14] حکیم سید غلام مہدی، نوائے طب وصحت اللہ آباد، جنوری-مارچ-2012ء

ویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس قائم کی تھی۔ یہ ایک ایسی تحریک تھی جس نے قدیم ہندوستانی طریق علاج، طب یونانی اور آیورویدک کے حاملین کو منظّم کیا اور ملک گیر پیمانے پر ان کی خدمات نے عوام کو فائدہ پہنچانے کی طرف نمایاں پیش قدمی کا سبب بنے۔ سرسید کی علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی بھی تھے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد میں بھی ان کا خون جگر صرف ہوا، سیاسی تحریکات نے ان کی ذکاوت، ذہانت، اور سوجھ بوجھ کا فائدہ اٹھایا۔ آزادی کی جدوجہد میں مصروف تمام سیاسی قائدین ان سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ مہاتما گاندھی، مولانا آزاد، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، ڈاکٹر مختار احمد انصاری وغیرہ نہ صرف ان کے شریک کار اور ہم قدم تھے بلکہ ان سے کسب فیض کرتے تھے۔ ایک دور میں وہ دلی کے بے تاج بادشاہ کہے جاتے تھے اور ان کا گھر شریف منزل، ہندوستان کے سیاسی و علمی ماہ نجوم کا مرکز بنا رہتا تھا۔ تصنیف و تالیف اور شعر گوئی سے بھی ان کو ایک گونہ تعلق تھا جس سے ظاہر ہے کہ وہ بلند ادبی ذوق کے حامل تھے۔ ان کی طبی تصانیف بھی موجود ہیں۔ اور ان کا شعری مجموعہ 'دیوان شیدا' (شیدا تخلص کرتے تھے) اپنے مریضوں کے لئے ان کے ہاتھ میں شفا تھی اور اپنے رفقائے کار کے لئے ان کی ہستی باعث فیوض۔ ایک طرف نواب رام پور ان کی صحبت سے فیضیاب ہوتے تھے۔ دوسری جانب شعراء، ادباء سیاسی شعور رکھنے والے سماجی رہنما اور زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ لوگوں ان کے عقیدت مند تھے۔ ڈاکٹر انصاری اور مہاتما گاندھی کے زیر اثر حکیم اجمل خاں نے کانگریس میں شرکت کی اور آخری عمر تک اس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی میں ان کی اہمیت کا اندازہ ٹی آر پارٹھا سارتھی کے ان الفاظ سے ہوسکتا ہے جو انہوں نے اپنی کتاب Dawn and Achievement of Indian Freedom میں لکھے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"The New Eara saw great names in the congress working committee with C Viaraghavacharia as President (Ajmal Khan and Others) with such tried servants of the Nation at the Helm, the struggle began"

حکیم اجمل خان کی خدمات

حکیم اجمل خاں کا مکان 'شریف منزل' خلافت اور کانگریس کے رہنماؤں کا مرکز بن گیا تھا اور ملک کی آزادی کی منزل پانے کے لئے ہندوستان کے دو بڑے فرقوں ہندو اور مسلمانوں کا اتحاد لازمی تھا جب کہ انگریزوں نے 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' کی پالیسی کے تحت ان دونوں فرقوں میں پھوٹ ڈالوانے کی پوری کوشش کی تھی۔ حکیم اجمل خاں انگریز حکومت کی اس کوشش کو ناکام بنانے میں سب سے زیادہ پیش پیش تھے۔ دسمبر 1919ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کا اجلاس امرتسر میں منعقد ہوا لیگ کے صدر حکیم اجمل خاں اور کانگریس کے صدر موتی لال نہرو تھے۔ یہ جلسہ بڑا پر جوش تھا اور عوام نے اپنے رہنماؤں پنڈت جی، حکیم صاحب، مہاتما گاندھی اور تلک کے جلوس نکالے تھے۔ حکیم صاحب نے اس موقعہ پر مسلمانوں سے اپیل کی کہ بقرعید پر گائے کی قربانی نہ کریں۔ مہاتما گاندھی نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہندوؤں کو گائے کی حفاظت کے سلسلے میں مسلمانوں سے جھگڑا کرنے کی کوئی وجہ نہیں، اس کے باوجود حکیم صاحب نے صرف ہندو مسلم اتحاد کے نقطہ نظر سے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا اور مسلم لیگ نے رزولیوشن پاس کر کے اس کی تائید کردی۔ حکیم صاحب کو ہندوستان کے ان دو بڑے فرقوں کا اتحاد، یگانگت اور یک جہتی ہر چیز سے زیادہ عزیز تھی، اسی کو سامنے رکھ کر گاندھی جی نے ان کے بارے میں اپنے اخبار Young India میں لکھا تھا: "Hindu Muslim Unity was the breath of his nostrils"

حکیم اجمل خاں نے مذکورہ جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے اپنے خطبہ کے آخر میں فرمایا تھا: ''اس حیثیت سے کہ ہم اس خاک سے پیدا ہوئے اور دوسری قوموں کے ساتھ ملک کے فخر کرنے والے وارث بنے، ہم ان فرائض کو جو ہمارے زادو بوم ہم پر عائد کرتی ہے نہ صرف اچھی طرح سمجھتے ہیں بلکہ دلی خواہش کے ساتھ ان کو ادا کرنے کے لئے ہم ہندو عیسائی پارسی اور دوسرے بھائیوں کے ساتھ آزاد ہیں''۔ (حیات اجمل) حکیم صاحب کی ان ہی خصوصیات سے متاثر ہو کر شری راج گوپال اچاریہ نے کہا تھا۔

"He was (Hakim Ajmal Khan) India one of the greatest patriots and working in the Caus of Unity" (Report of India Cogress)

آزاد ہند کا جو تصور حکیم صاحب کے ذہن میں تھا وہ ان کے اسی مذکورہ خطبہ کے مندرجہ ذیل الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے: ''ہندوستان کے لئے ایک نادیدہ مستقبل میں وہ عظمت اور شان پنہاں ہے کہ ماضی کا زیادہ سے زیادہ مہتم بالشان زمانہ بھی اس کے مقابلہ میں کم اور حقیر نظر آتا ہے۔ آیئے ہم سب متحدہ طاقت کے ساتھ اپنے ہاتھ بڑھائیں اور اسی مستقبل کے چہرے سے جو ہمارے ذہنی مگر اعلیٰ تخیل کے ساتھ وابستہ ہے نقاب اٹھانے کی خلوص دل سے کوشش کریں''۔ (سیرت اجمل)

حکیم صاحب پہلے مسلم لیگ کے ممبر تھے پھر نائب صدر ہوئے۔ 1918ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین بھی ہوئے۔ اور 1921ء میں کانگریس کے صدر کے فرائض بھی بڑی خوش اسلوبی سے ادا کئے۔

حکومت کے خلاف اعلان جنگ

آزادی کی لڑائی کا ایک مرحلہ وہ بھی آیا جب حکیم صاحب نے ملک کے رہنماؤں کو دہلی بلایا کئی دن تک شریف منزل میں مشورے ہوتے رہے آخر کار مہاتما گاندھی نے حکومت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ حکیم صاحب نے اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے 20 مارچ کو انگریز حکومت کا دیا ہوا حاذق الملک کا خطاب اور قیصر ہند کا تمغہ واپس کر دیا۔ کچھ دنوں بعد جمعیۃ العلماء ہند کے اجلاس کانپور میں انہیں، مسیح الملک کا خطاب دیا گیا جو پہلے سے بھی زیادہ مقبول ہوا۔ اسی سال کلکتہ میں تمام خاص جماعتوں کے اجلاس ہوئے، کانگریس، مسلم لیگ، خلافت اور جمعیۃ العلماء نے اس پر موقع پر خطابات کی واپسی، سرکاری ملازمتوں کے ترک اور عدالتوں کے مقاطعہ کی تجاویز پاس کیں، حکیم صاحب تحریک ترک موالات کے خلاف تھے مگر گاندھی جی نے انہیں اپنا ہمنوا بنالیا۔ انہوں نے دوسرے رہنماؤں کے ساتھ علی گڑھ کے طلباء سے یونیورسٹی چھوڑنے کی اپیل کی، تقریباً تین سو طلباء نے اس آواز پر لبیک کہی۔

29/اکتوبر 1920ء کو مولانا محمد حسن صاحب نے علی گڑھ میں جامعہ ملیہ کا افتتاح کیا اور حکیم صاحب کو امیر جامعہ (چانسلر) نیز مولانا محمد علی کو شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) بنایا گیا۔ جامعہ ملیہ کے فروغ اور بقاء کے لئے حکیم اجمل خاں نے ہر طرح کی کوششیں کیں اور جامعہ ملیہ کے مالی بحران کے دوران میں انہوں نے ذاتی ایثار کی بے مثال روایت قائم کی اور جامعہ کو اس بحران سے نکالا۔ قومی تعلیم اور صحت کے فروغ کے لئے جامعہ ملیہ کے ساتھ انہوں نے طبیہ کالج کے قیام اور طب میں تحقیق کے منصوبے کو بھی آگے بڑھایا۔ 13/فروری 1921ء کو حکیم صاحب نے طبیہ کالج کی رسم افتتاح مہاتما گاندھی کے ہاتھوں ادا کرائی۔ اس سے قبل 29 مارچ 1916ء کو

وائسرے ہند لارڈ ہارڈنگ نے اس کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ حکیم صاحب کو عورتوں کی تعلیم سے بھی بڑی دلچسپی تھی اور عورتوں میں صحت کے ساتھ مسائل اور ان کے تدارک کا علم حاصل کرنے کے نقطۂ نظر سے جنوری 1909ء میں انہوں نے ایک زنانہ مدرسہ طیبہ بھی قائم کیا تھا۔ ہندوستانی خواتین کے لئے تعلیم کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

"When we invite our women to have their share in eduction the idea appears to be novel, Somthing new and unheard of our elite class, but no plan of education will ever be complete unless the seed of sympathy for women finds its place in it". (حیات اجمل)

جدید اصطلاحات کے لئے ریسرچ کمیٹی قائم

یہاں اس بات کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ حکیم صاحب ہی وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے یونانی طب میں عصری تحقیق کی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے عملی قدم اٹھائے انہوں نے قدیم طبوں میں جدید اصلاحات کے مقصد سے ایک ریسرچ کمیٹی قائم کی۔ آیورویدک اینڈ یونانی طبی کالج قرول باغ نئی دہلی کی مجلس انتظامیہ نے ایک مجلس تحقیقات علمی (ریسرچ کمیٹی) قائم کی۔ جس کا رسمی افتتاح مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے 2 جولائی 1926ء کو کیا۔ اس موقع پر انہوں نے اپنی تحریر میں ایک تاریخی عہد نامہ لکھ کر اس پر دستخط کئے۔ جس میں یونانی طب میں بنیادی اصلاح کا کام شروع کرنے کا تذکرہ کرتے ہوئے خدا سے دعا کی گئی ہیکہ اس عظیم کام کو جاری رکھنے میں وہ ان کی مدد کرے۔ اس عہد نامہ پر حکیم اجمل خاں کے علاوہ حکیم فضل الرحمٰن، حکیم محمد کبیر الدین، ڈاکٹر سید ناصر عباس، حکیم محمد الیاس خاں اور حکیم عبدالحفیظ خاں نے دستخط کئے تھے۔ حکیم صاحب کا ایک اور اہم قدم ہندوستانی دواخانہ کا قیام تھا جس کا مقصد نہ

صرف دواؤں کی تحقیق تھا بلکہ دواخانہ کے سالانہ منافع سے طبیہ کالج کا خرچ چلانا بھی تھا۔ ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی سے حکیم صاحب کی ملاقات 1925ء میں پیرس میں ہوئی تھی، جب ڈاکٹر صدیقی جرمنی میں کیمسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

حکیم صاحب کا انتقال

حکیم صاحب کی زندگی مسلسل مصروفیات اور ان تھک محنتوں میں بسر ہوئی، جس کی وجہ سے بہت جلد ان کی صحت متاثر ہوگئی، صحت کی بحالی کی تدابیر کے طور پر ہی انہوں نے یورپ کا آخری سفر بھی کیا لیکن ملکی سیاسی ہنگاموں میں مصروفیت نے پھر ان کو چین نہ لینے دیا اور جلد ہی ان کا آخری وقت آ گیا۔ ان کا زادہ وقت مطب یا پھر رامپور میں صرف ہوتا تھا۔ آخر رام پور ہی میں ان پر دل کی بیماری کا حملہ ہوا اور 29 دسمبر 1927ء کو انہوں نے رام پور ہی میں سفر آخرت اختیار کیا۔ تدفین دہلی میں ہوئی۔ حکیم صاحب کے انتقال کا حادثہ ایک انتہائی غیر معمولی واقعہ تھا۔ جس نے عوام وخواص دونوں کو بری طرح متاثر کیا۔ مسیح الملک کی زندگی اور کارناموں پر اردو اور انگریزی زبان میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی زندگی کا سفر ہندوستان کی جدوجہد اور آزادی کی تاریخ بھی ہے اس لئے ان کے سوانح نگاران کے زمانے میں ہندوستان میں رونما ہونے والے واقعات سے صرف نظر نہیں کر سکتے تھے۔ ملک کی نمایاں شخصیت ہونے کے ساتھ ہی وہ تاریخ کی بھی ایک اہم شخصیت بن کر ابھرے۔ ان پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں سیرت اجمل (از حکیم اجمل خاں) حیات اجمل (از قاضی عبدالغفار) اور اجمل خاں۔ اے ورسٹائل جینئس (از حکیم ایم۔ اے۔ رزاق) خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

☆☆☆

مولانا حسرت موہانی کی بیگم نشاط النساءؒ [۱۵]

1857 کی جنگ آزادی ایک ایسی عوامی بغاوت تھی جس میں بادشاہ بیگمات عام اورخواص سبھی شامل تھے جس میں بادشاہ اور بیگمات کا ذکر اکثر کتابوں میں ملتا ہے ،لیکن خواتین خصوصاً مسلم خواتین کا تذکرہ کم ملتا ہے مہاتما گاندھی نے کہا تھا ’’قومی جدوجہد آزادی کی تاریخ ہندوستانی خواتین کے تذکرے کے بناء مکمل نہیں ہوسکتی‘‘ ہندوستان میں عوامی انقلاب کو بڑھاوا دینے والوں میں بے شمار غیر معروف قوم پرستوں نے قربانی جرأت وشجاعت کی شاندار مثالیں پیش کی ہیں انہیں جرأت وشجاعت کے واقعات سے لی گئی ایک شاندار مثالی بیگم حسرت موہانی نشاط النساء کی ہے جنہوں نے بیسویں صدی کے اوائل میں قومی تحریک آزادی میں بھر پور حصہ لیا۔

مولانا حصرت موہانی لکھتے ہیں:

’’اگر بیگم حسرت ،بیگم آزاد، اور کملا نہرو نہ ہوتیں تو حسرت کسی اخبار کے ایڈیٹر ہوتے ،مولانا ابوالکلام الہلال والبلاغ نکالتے رہتے اور جواہر لال ایک کامیاب بیرسٹر ہوتے ، یہ عورتیں وفاپرست وایثار مجسم تھیں۔انہوں نے جان دے دی مگر ہم سے یہ کبھی نہ پوچھا کہ لیلائے سیاست کے پرستارو!تم جیل جارہے ہو ہمارا

۱۵ ڈاکٹر ایس نسیم بانو: سالار،۲۴رجنوری ۲۰۱۲ء

کیا ہوگا ؟ نشاط النساء بیگم موہان ضلع اودھ کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئیں، آپ مذہبی تعلیم کے علاوہ اردو فارسی اورعربی زبانوں میں تعلیم حاصل کی،نشاط النساء اپنے پس ماندہ قصبے کی لڑکیوں کولکھنا پڑھنا سکھایا،موہان میں تعلیم نسوان کی شروعات آپ نے ہی کی۔نشاط النساء جب حسرت موہانی کی زندگی میں شامل ہوئیں قومی وملکی مسائل سے وہ آشنا ضرور تھیں۔کیونکہ اس وقت موہان میں اردو اخبارات پہنچنے لگے تھے۔یہ دیہات میں پلی ہوئی لڑکی نہایت بہادر اور باحوصلہ تھیں اور ہرطرح سے حسرت کی رفاقت کے لئے موزوں تھیں۔

بیگم حسرت خودداری کا مجسمہ تھیں

حسرت ہمیشہ مالی پریشانیوں سے دوچار رہے، اسکے باوجود نشاط صاحبہ نے کبھی حرف شکایت زبان پرنہیں لایا۔ ہر کٹھن موقع پر وہ آپ کیساتھ انہیں اورحسرت کو ہمیشہ اس رفاقت پر ناز رہا۔علی گڑھ کی تعلیمی زندگی سے فراغت ملتے ہی حسرت نے اپنے نظریات وعقائد کی اشاعت وترویج کی خاطر ماہنامہ ’’اردوئے معلیٰ‘‘ جاری کیا اردوئے معلیٰ کے ایک شمارے میں ایک طالب علم کا مضمون مصر میں انگریزوں کی پالیسی شائع ہوا۔اور حسرت دفعہ 124 (الف) کی زد میں آگئے ،انہوں نے طالب علم کا نام نہیں بتایا،اور ساری ذمہ داری اپنے سر لے لی۔

اس وقت مسلم معاشرہ پر سیاسی جمود طاری تھی۔اور دوسری طرف برطانوی سامراج کا خوف اس قدر عوام پر طاری تھا کہ کوئی بھی وکیل آپ کے مقدمے کی پیروی نہ کرسکا۔اور دوسال قید بامشقت کی سزا آپ کو سنا دی گئی۔ یہ آپ کی پہلی گرفتاری تھی۔جس سے نشاط النساء بیگم کی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہوا،مولانا حسرت کی چندسال کی رفاقت سے آپ کا شعور پختہ ہوگیا تھا۔گرفتاری کے وقت

حسرت کی صاحبزادی نعیمہ کی طبیعت حد درجہ ناساز تھی۔ اگر نشاط النساء چاہتی تو حسرت کو مغموم کرسکتی تھیں خود پریشان ہوسکتی تھیں، لیکن اس نازک وقت میں وہ بغیر کسی شش وپنج کے حسرت کو جانے دیا۔ اور دوسرے ہی دن ایک ہمت افزاء خط حسرت کے نام بھیجا جس میں لکھا تھا۔

بیگم نشاط کا خط مولانا حسرت کے نام

''تم پر جو افتاد پڑی ہے اسے مردانہ وار برداشت کرو۔ میرا یا گھر کا مطلق خیال نہ کرنا خبردار تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو' حسرت کے قید وبند کے اس زمانے میں مجسٹریٹ نے حسرت کو پڑھنے لکھنے کی اجازت دے دی۔ تو بیگم حسرت برابران کے پسندیدہ اخباران تک پہنچاتی رہیں۔ حسرت پر پانچ سو روپئے کا جرمانہ تھا۔ یہ جرمانہ آپ دے نہ سکے۔ بدلے میں حکومت نے آپ کی عزیز و نایاب کاتبیں ساٹھ روپئے میں نیلام کردی دوران قید حسرت نے مصائب اور سختیوں کا سامنا کیا، جس کی داستان وہ خود لکھتے ہیں:

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں

اس اک عشق میں میں نے کیا کیا نہ دیکھا

یہ مصیبت اور بلائیں نہ صرف حسرت نے دیکھیں بلکہ اس میں نشاط النساء بھی برابر کی شریک رہیں، جیل سے رہا ہونے کے بعد حسرت کا یہ جوش کم ہونے کی بجائے اور دوگنا ہوگیا۔ رہا ہونے کے بعد اپنے ہی گھر میں ایک کاٹھ کا پریس لگایا جس کا نام اردو پریس رکھا حسرت پریس مین کی خدمات انجام دیتے اور نشاط النسا پیپر مین کی خدمات انجام دیتیں لیکن کچھ عرصہ بعد ہی حکومت نے پریس بند کردیا، مولانا ابوالکلام

آزاد نے حکومت سے احتجاج کیا اور الہلال میں ''اردو پریس علی گڑھ کی ضمانت'' کے عنوان سے لکھا، جس میں انہوں نے بیگم حسرت کو حسرت کی کوہ عزت وثبات'' بیوی سے تعبیر کیا ہے''۔ دوسری گرفتاری بیگم حسرت کی سیاسی زندگی کی شروعات رہی۔ حسرت کے مقدمے کی پیروی بیگم حسرت نے اپنے ذمہ لی۔ حسرت کے مقدمے کے دوران اور بعد میں قید وبند کے زمانے میں ہمت اور قابلیت کے ساتھ پبلک ریلیشن آفیسر کی خدمات بھی انجام دیں، حسرت کے حالات سے بھی عوام کو باخبر رکھا۔ حسرت کے نظر بند ہونے کے بعد بیگم حسرت نے غیر ملی سامراجیت سے ٹکر لینے کیلئے تیار ہوگئی۔ مولانا کو جیل میں خط لکھا جس میں لکھتی ہیں: ''آج کارڈ 27 کا لکھا ہوا اور لفافہ بھی ساتھ ملا۔ تمہارے استقلال کی حد ہوگئی، میں تعریف کرتی ہوں، مگر افسوس کے تم سے علاحدہ رہنے کا خیال سخت تکلیف دہ ہے۔ خدا تمہاری مدد کرے۔ اگر خدانخواستہ قید ہوئی اور خدا نہ کرے خیال غالب یہی ہے کیونکہ تم اپنے دھن کے پکے ہو، ہم کو خوش ہونا چاہئے کہ ہمارے ساتھ ظلم ہوتا ہے، مگر ہم ظلم نہیں کرتے'' اسی صورت حال کا تذکرہ مولانا عبدالباری کے نام لکھے اس خط سے بھی ہوتا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے۔ ''اگر خدانہ کرے حسرت قید ہوئے تو مجھے بھی صبر کرنا چاہئے اور خدا سے دعا کرنا چاہئے کہ مجھے اتنی قوت اپنی قدرت کاملہ سے عطا کرے کہ کسی صورت میں بھی ظالموں سے حسرت کے ساتھ بے جا ظلم کرنے کا انتقام لے سکوں چاہے مجھے بھی قید یا پھانسی کیوں نہ ہوجائے''۔

بیگم کو چنانچہ احکام نظر بندی کی خلاف ورزی میں حسرت ڈیڑھ سال کے لئے جیل چلے گئے تو نشاط النساء نے اخباری بیان میں کہا۔ ''ایسی نظر بندی سے قید بہرحال بہتر ہے، حسرت نے خوب کے ایسی نظر بندی سے قید بہرحال بہتر ہے، کہا مجھے ان سے یہی امید تھی''۔

نشاط النساء بیگم کی خودداری

نشاط النساء بیگم کسی خوشحال گھرانے کی عورت نہیں تھیں، بلکہ وہ حسرت موہانی کی بیگم تھیں، جو حسرت کے ہمراہ نمک اور روٹی کھا کر دوران مقدمہ حسرت آپ نے معاشرے کی مخالفت کے باوجود پردہ ترک کیا، وہ چہرہ کھول کر نہایت ہی سادہ لباس میں باہر نکلتیں، کسی کی پرواہ نہیں کرتی تھیں، اس کے متعلق پنڈت کشن پرشاد کول لکھتے ہیں'' یہ جرأت مندانہ اقدام انہوں نے اس وقت کیا جب نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ ہندوؤں میں بھی پردے کی رسم شرافت کی علامت سمجھی جاتی تھی۔

عسرت اور تنگی کی داستان

پنڈت کشن پرشاد کول حسرت کے دوستوں میں شمارہ ہوتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ کانگریس کے کام سے مجھے علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں اپنے احباب سے میں نے سنا کہ حسرت کے گھر والوں کی زندگی بڑی مصیبت اور عسرت سے گزر رہی ہے میں نے کوشش کی کہ میں بیگم حسرت موہانی سے ملوں، میں نے ان سے ملنے گیا، کچھ مکانوں کے ایک احاطے میں نیم کے درخت تلے ایک کچا پکا چھوٹا سا مکان تھا، بیگم حسرت مجھے ایک کمرے میں جس میں ایک پرانی دری بچھی ہوئی تھی لے کر جا بٹھایا وہ جیل میں حسرت کا حال بتاتی رہیں، آخر میں جھکتے ہوئے کہا آپ منظور کریں تو کچھ مالی امداد کا بندوبست کیا جائے۔ انہوں نے یہ جوابدیا کہ مجھے یہ منظور نہیں کہ میرے لئے پبلک سے چندہ کیا جائے، میں جس حالت میں ہوں خوش ہوں، آپ اس کی زحمت گوارا نہ کریں لمحہ بھر کے سکوت کے بعد پھر بولیں۔ حسرت نے شعر کے کئی دیوان چھپوائے تھے۔ ان کا ڈھیر لگا ہوا ہے یہ کاروبار ابتر ہوگیا، اگر آپ دیوان

کے فروخت کرانے کا کوئی انتظام کرسکیں تو البتہ کچھ سہولت ہوجائے گی۔ میں یہ کہہ کر کوشش کروں گا ان سے رخصت ہوا لکھنو آ کر میں نے اپنے دوست بابو شیو پرشاد گپتا کو جو رئیس تھے اور مخیّر بھی تھے سب حال کی اطلاع دی۔ انہوں نے مجھے پانچ سو روپئے کا چیک فوراً بھیج دیا جو میں نے بیگم حسرت کو روانہ کردیا۔ نشاط النساء بیگم نے ایام مصیبت میں بھی مالی اعانت کا بار اٹھانا منظور نہیں کیا، اسی مصیبت میں وہ برابر حسرت کا ساتھ دیتی رہیں اور کبھی ان پریشانیوں کا ذکر حسرت سے نہ کیا۔ جو قید و بند میں اپنی زندگی گزار رہے تھے۔ انہیں پریشانیوں میں آپ کے دوکان کی چوری ہوگئی۔ سارا مال ضائع ہوگیا یہ دکان بیگم حسرت اور ان کی بچی کیلئے سہارا تھا۔ سارا مال چوری ہوگیا اور چور کا پتہ سرکار لگا نہ سکی۔ ایسے وقت میں بھی نشاط النساء نے حرف شکایت زبان پر نہ لائی۔

جب حسرت کی جیل کی مدت ختم ہوئی بوقت رہائی وہ نواب اسحاق خان صاحب اور قاضی بشیر الدین وکیل کے ہمراہ جیل کے دروازہ پر استقبال کیلئے موجود تھیں، نشاط النساء بیگم حسرت کے ساتھ ہر اہم سیاسی اجلاس میں انکی شرکت اور اس کیلئے بے سروسامانی کی حالت میں بھی دور دراز کے سفر کی صعوبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتی تھیں۔

وطن پرستی کا یہ جذبہ حسرت کی محبت سے ان کو ملا تھا لیکن ان کا دماغ بہت سلجھا ہوا تھا جس کا اثر حسرت پر رہا، اس حقیقت کا اعتراف حسرت اپنی بیگم کی دائمی جدائی کے بعد کیا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' اب کوئی کوتاہیوں پر ملامت کرنے والا نہ رہا، ظاہری تعلیم کو چھوڑ کر باقی کل باتوں میں بیگم اس سے بدرجہا بہتر تھیں، انہیں ہر قسم کی تنبیہ کا حق حاصل تھا، جس کا اثر بھی خاطر خواہ ہوتا تھا''۔

بیگم حسرت وفا شعار بیوی

مولانا حسرت کی اس حسرت بھری زندگی میں بیگم حسرت نے ایک وفا شعار بیوی ہونے کا حق ادا کیا، خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں: ''حسرت کی بیوی مسلمانان ہند کی عورتوں میں بڑی وفادار اور شوہر پرست عورت ہے ایام بلا میں ایسی وفا شعاری اس عورت سے ظاہر ہوتی ہے جیسی سیتا نے رام چندر سے کی تھی''۔ حسرت نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ قید بند میں گزارا لیکن قید و بند سے باہر بیگم نشاط النساء نے کلمہ حق کو بآواز بلند کہا حسرت جو کام آزاد رہ کر یا قید و بند میں نہ کیا اسے بہتر طریقہ سے نشاط النساء نے ہمت و استقلال کے ساتھ برطانوی سامراجیت کے خلاف کھڑی رہیں ہر قسم کی مشکل کا سامنا کیا سید سلیمان ندوی بیگم نشاط النساء کے اس جذبہ سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں ''شوہر کے قید و بند کے بعد جب ان کا کوئی مونس و مددگار نہیں ہوتا تھا ہر قسم کی مشکلوں کو بہادری و استقلال کے ساتھ برداشت کرنے میں شاید ہی کوئی مسلمان عورت ان کے مقابلہ کی نکل سکے۔ واقعی غور کرنے کا مقام ہے نشاط النساء سے کسی کا مقابلہ نہیں ہوسکتا مگر ہم اس قیمتی ورثے کی حفاظت کے لئے کوشار ہیں گے تو ہم نے نشاط النساء کو خراج عقیدت پیش کرلیا۔

☆☆☆

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ [16]

سب سے پہلے مڈل اسکول میں داخلہ لیا اور تھوری ہی عمر میں اردو و حساب، لکھنا پڑھنا سب کچھ سیکھ لیا والد صاحب نے ارادہ کرلیا کہ اب بجائے کالج کی تعلیم کے کسی اللہ والے شیخ کامل کی خدمت میں بھیج دیا جائے چنانچہ انتہائی کم عمری میں صرف ۱۲ رسال کی عمر میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں دیوبند بھیجدیا، حضرت شیخ الہندؒ نے آپ کی خصوصی تربیت فرمائی لہٰذا صرف سات سال کے عرصہ میں آپ حسین احمد سے مولانا حسین احمد بن کر دارالعلوم دیوبند سے نکلے، پھر خود کو اصلاح باطن کی فکر ہوئی تو استاذ محترم شیخ الہندؒ سے بیعت کی درخواست کی مگر استاد نے بیعت سے انکار فرما کر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت ہونے کا اشارہ فرمایا لہٰذا حسب حکم مولانا گنگوہی سے بیعت فرمایا۔ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت: ۱۳۱۶ھ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے والد محترم نے مع اہل و عیال مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمایا روانگی کے وقت حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا تھا کہ مکہ معظّمہ میں ہمارے پیر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی موجود ہیں حتی الامکان ان کی خدمت کرنا چنانچہ حضرت شیخ حاجی صاحبؒ سے بھی کسب فیض فرمایا اور سلوک کے مراحل طے فرمایا۔

[16] سید ظہیر احمد قاسمی، راشٹریہ سہارا، یکم جولائی 2010ء

حضرت مدنیؒ کے والد محترم کا مشورہ

پھر چند ماہ کے بعد مدینہ منورہ میں اپنے والد صاحب کے ہمراہ رہے، مدینہ منورہ میں حضرت مدنیؒ کا خاندان ایک بے کس مسافر کی طرح داخل ہوا اس لئے ان پیاروں کو سخت صعوبتیں برداشت کرنا پڑا حتی کہ فاقہ تک نوبت آ گئی، والد صاحب نے اپنے صاحبزادوں کو بٹھا کر فرمایا کہ تم زیارت حرمین کی غرض سے آئے تھے۔ اب وہ مقصد پورا ہو چکا ہے اس لئے میری رائے ہے کہ تم واپس وطن چلے جاؤ، مگر اس صبر واستقامت کے پہاڑ حضرت مدنی نے انتہائی ادب کے ساتھ جواب دیا کہ ''ہم کسی قیمت پر حرم محترم سے جدا نہیں ہوں گے خدا نے ہمارے لئے لکھا ہے وہی ہوگا اگر اناج نہیں ملے گا تو جنگل کے پتے کھا کر گذارہ کرلیں گے۔

غرض سب نے اپنا وطن مدینہ منورہ کو بنالیا، مدینہ منورہ والے حضرت مدنی کی اتنی عزت کرتے تھے کہ کسی دوسرے عالم کی اتنی عزت نہیں کرتے تھے مگر فاقہ پر فاقہ رہتا، فاقہ کا یہ عالم تھا کہ تین پاؤ مسور پر تیرہ آدمی قناعت کرتے تھے۔ کسی سے اس کا اظہار تک نہ کرتے، حتی کہ بالکل قریبی دوستوں تک بھی اس کی بھنک محسوس ہونے نہیں دیا اس دوران حضرت مدنیؒ مدینہ منورہ میں درس حدیث بھی دیتے رہے حلقۂ درس اتنا وسیع ہوگیا کہ حضرت مدنیؒ کی شہرت دور دور تک ہوگئی۔ پھر سب سے پہلے مدینہ منورہ سے ہندوستان کا سفر کیا اپنے استاذ شیخ الہند اور شیخ حضرت گنگوہیؒ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا تقریباً سات ماہ کے بعد مدینہ منورہ واپس ہوگئے، پھر مسلسل پانچ سال کے بعد ۱۳۲۵ھ میں دوبارہ ہندوستان کا سفر کیا یہاں حضرت شیخ الہند کی خدمت میں تین سال گزارے اور دارالعلوم دیوبند میں باقاعدہ مدرس کی حیثیت سے درس دیتے رہے۔ ۱۳۳۵ھ کا زمانہ تھا کہ ہندوستان میں انقلابی تحریکیں

زوروں پر تھیں حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے محبوب شاگرد کو سیاسی تعلیم دی اور اپنا راز دار بنایا، حضرت مدنیؒ نے پورے طور پر سیاست میں حصہ لیا، پھر ۱۳۲۹ھ کو مدینہ منورہ سے معتقدین اور شاگردوں کے خطوط کا تانتا بندھ گیا، مگر حضرت مدنیؒ اپنے استاذ سے کسی قیمت پر جدا ہونے کے لئے تیار نہیں تھے بالآخر استاذ کے اصرار پر اپنی اہلیہ کے ساتھ دوبارہ مدینہ منورہ پہنچ کر حلقۂ درس جاری فرمایا، دو سال کے بعد ۱۳۳۱ھ میں دوبارہ ہندوستان کے سفر کا ارادہ فرمایا کیونکہ اپنے سسرال والوں سے وعدہ فرمایا تھا کہ دو سال کے بعد آپ کی صاحبزادی کو ہندوستان لاکر آپ سے ملاؤں گا، پھر آٹھ نو مہینوں تک قیام فرمایا۔

حکومت برطانیہ کا تختہ الٹنے کی کوشش

اس دوران حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے تمام خدام انگریز کے خلاف کھڑے ہوگئے تھے اور حکومت برطانیہ کا تختہ الٹنے کے لئے طرح طرح کی اسکیمیں کررہے تھے، ادھر حاجی ترنگ زئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جہاد کا اعلان کر چکے تھے، ایران کی سرحدوں پر طوفان برپا تھا، ترکی اعلان جنگ کرنے والا تھا، جرمنی مکمل مستعدی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا ساری دنیا کو یقین ہو چکا تھا کہ اب بہت جلد جنگی نقارہ پر چوب پڑنے والی ہے ادھر برطانیہ نے تمام اسلامی ممالک میں طرح طرح کے جال پھیلائے رکھے تھے، غرض ہندوستان کے اس پرفساد ماحول سے حضرت مدنیؒ مع اپنی اہلیہ کے مدینہ کی طرف روانہ ہوگئے اور بڑے اطمینان کے ساتھ درس وتدریس میں مشغول ہوگئے اور ۱۳۳۳ھ میں شیخ الہندؒ نے زیارت حرمین شریفین کا ارادہ فرمایا اس سفر پر ہندوستان اور برطانیہ والوں نے سوالیہ نشان کھڑے کردیئے تھے کہ اس موقع پر چونکہ برطانیہ اور جرمن میں جنگ چھڑ چکی تھی اور ترکی نے جرمن کی حمایت کا فیصلہ

کر چکا تھا اس لئے لوگوں نے یہ گمان کیا کہ آپ ترکی حکومت کی حمایت کے لئے تشریف لے جارہے ہیں وغیرہ وغیرہ، غرض حضرت شیخ الہندؒ بذریعہ جہاز (پانی کی) جدہ پھر مکہ معظّمہ پہنچے اور ارکان حج سے فراغت کے بعد مدینہ منورہ پہنچے وہاں پانچ ماہ تک قیام رہا اس کے بعد ترکی خفیہ پولیس بعض مفسدین کی فتنہ انگیزی سے شیخ الہندؒ کی مخالف ہوگئی حتی کہ گرفتاری کا ارادہ کرلیا گیا مگر بااثر لوگوں چونکہ شیخ الہندؒ کے معتقد تھے اس لئے اس کی ہمت نہ کرسکے، پھر ۱۳۳۴ھ کو شیخ الہندؒ نے مدینہ منورہ سے مکہ معظّمہ روانگی کا ارادہ فرمایا حضرت مدنیؒ بھی بارادۂ خدمت استاذ ساتھ نکلے مکہ معظّمہ پہنچنے کے بعد ان اللہ والوں کا شغل محض طواف، عمرہ ذکر وعبادت تھا مگر کچھ ہی دنوں بعد مکہ کے علماء اور طلبہ کے اصرار پر حرم شریف میں بخاری شریف کا درس ہونے لگا بڑے بڑے حجازی علماء اس درس میں شرکت فرماتے اور شیخ الہندؒ کی معلومات پر تعجب فرماتے، ابھی چند ہی دن گذرے تھے کہ شریف حسین والی مکہ کے اشارہ پر ترکی حکومت کی برائی اور شریف حسین کی مدح پر مشتمل ایک فتویٰ دستخط کے لئے ان حضرات کے پاس پہنچا اس فتوے پر ان کے دستخط شریف حسین کے لئے بے حد ضروری تھے ان حضرات کے انکار پر شریف حسین کو بہت ملال ہوا۔

شیخ الہند کا گرفتاری وارنٹ

بالآخر اس نے شیخ الہندؒ کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کردیا ادھر حضرت مدنیؒ نے شریف حسین کو بہت سمجھایا اور دہلی وغیرہ کے معزز تاجروں نے بھی شیخ الہندؒ کی بے قصوری کو سمجھایا مگر شریف حسین نے کہدیا کہ یہ ہمارے آقاؤں (انگریزوں) کے مجرم ہیں اس لئے ان کو حوالہ کرنے کا ہی ہمیں حکم دیا گیا ہے تو حضرت مدنیؒ نے اپنے شیخ کو ایک محفوظ مقام پر روپوش کرادیا ادھر حضرت مدنیؒ کو سپاہیوں نے گرفتار کرلیا شیخ

الہندؒ کو جب اس کا علم ہوا تو خفیہ مقام سے باہر تشریف لائے اور انہیں بھی گرفتار کرلیا گیا، مگر معتقدین کی بددلی کے خوف سے حضرت مدنیؒ کو آزاد کردیا گیا اور پھر مدینہ منورہ سے گرفتار کرلیا اب ان اللہ والوں کا مختصر سا قافلہ جدہ سے مصر کے جیل کی طرف بھیج دیا گیا اور مصر سے مالٹا کی جیل کو روانہ کردیا گیا، مالٹا ایک مختصر سا جزیرہ ہے جو پہلے مسلمانوں کے قبضہ میں تھا پھر انگریز گورنمنٹ کے قبضہ میں چلا گیا اب مالٹا کی جیل میں ان حضرات کو مختلف پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا اور حضرت مدنیؒ کو صدمات پر صدمات پیش آئے کہ حضرت کے والد بزرگوار سید حبیب اللہ صاحبؒ اور برادر محترم کو ترکی حکومت نے گرفتار کرکے نظر بند کردیا جہاں ان دونوں نے تڑپ تڑپ کر جان دیدی۔ اسی پر بس نہیں حضرت مدنیؒ کی اہلیہ محترمہ اور لختِ جگر جو مدینہ منورہ میں رہ گئے تھے بھوک اور پیاس اور دیگر امراض میں مبتلا ہوکر واصل بحق ہوگئے۔

حضرت مدنیؒ فرمایا کرتے تھے کہ خاندان کے ساتھ آدمی اسی انقلاب کی نذر ہوگئے، مگر اس مجلد اعظم کے چہرہ پر بل تک نہ آیا، رضا برضا ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، غرض ان اللہ والوں کو رہائی کا وقت آگیا کہ ٹرکی اور جرمنی ہار گئے اور برطانیہ کی فتح ہوئی۔ ۱۹۱۹ء میں اعلان ہوا کہ تمام قیدی چھوڑ دیئے جائیں گے اور ۱۹۲۰ء میں ان اللہ والوں کا قافلہ رہائی پایا اور یہ قافلہ مالٹا سے بمبئی، بمبئی سے دہلی اور دیوبند پہنچا، اس وقت تین جماعتیں برطانوی حکومت سے برسرپیکار تھیں (۱) جمعیت علماء (۲) خلافت کمیٹی (۳) کانگریس۔

شیخ الہند کا خطاب

مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی کو ان تینوں جماعتوں نے شیخ الہند کا خطاب دیا اور تمام ملک میں آزادی کی لہر دوڑ گئی تھی ہر شخص سمجھتا تھا کہ اب انگریز کی خیر نہیں

رہے گی مگر افسوس کہ چند ہی دنوں میں حضرت شیخ الہند کا وصال ہوگیا اس کے بعد حضرت کی مشن کو شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ نے سنبھالا، یہ اللہ کا شیر ملک والوں کی ہر پکار پر لبیک کہتا مندرجہ بالا تینوں جماعتیں شیخ الاسلامؒ کو ملک کے جس گوشہ میں ضرورت ہوتی بلاتیں، اسی سلسلہ میں ۹ جولائی ۱۹۲۱ء کو خلافت کراچی کانفرنس ہوئی جس میں حضرت مدنیؒ پہونچے وہاں یہ تجویز پیش ہوئی کہ برطانیہ گورنمنٹ کی فوج میں بھرتی ہونا اور ملازمت کرنا حرام ہے اس کے بعد ہر شخص کو یقین ہوگیا کہ اب حضرت گرفتار کرلئے جائیں گے۔

چنانچہ ہوا یہی کہ ۱۸ دسمبر ۱۹۲۱ء کو انگریز افسر نے اپنے مسلح پولس کے ساتھ حضرت کے گھر پہنچا مگر لوگوں کا جوش وخروش اتنا تھا کہ اسے مجبوراً واپس جانا پڑا مگر رات کے موقع پر حضرت کو گرفتار کرلیا گیا کراچی جیل میں مقدمہ چلایا گیا، ہر طرف سے اشارے ملے کہ اب بھی اپنی تجویز واپس لے لیں رہائی ہوجائے گی، مگر حضرت مدنیؒ شیر ببر کی طرح برابر اپنی تجویز پر برقرار رہے، اس پر شیخ الاسلامؒ کو دو سال قید بامشقت کا حکمنامہ جاری ہوگیا دو سال قید کے بعد حضرت کی رہائی ہوئی تو دیوبند اور اطراف کے مسلمانوں کے لئے عید کا دن تھا پھر دسمبر ۱۹۲۳ء میں شیخ الاسلامؒ نے ہندوستان کی مکمل آزادی کا اعلان کردیا اس کے بعد کانگریس اور دوسری جماعتوں نے موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی اس کمیٹی نے جو دستور حکومت پیش کیا اس میں ہندوستان کی مکمل آزادی کا تصور نہ تھا تو شیخ الاسلامؒ نے للکار کر فرمایا کہ یہ دستور ناقص ہے ہم ہندوستان کی مکمل آزادی کے سوا کسی دستور کے قائل نہیں اس کے بعد ہندوستان میں حضرت کے خلاف برطانیہ حکومت نے غلط پروپیگنڈے کرائے حتی کہ ملک کی ایک غنڈہ پارٹی نے حضرت کے قتل کا تک ارادہ کرلیا مگر حضرت برابر استقلال کا پہاڑ بنے رہے اور اپنی مشن جاری رکھا۔

شیخ الہند کا وصال پر ملال

۱۹۵۷ء میں حضرت مدراس کے سفر پر تھے کہ طبیعت علیل ہوئی واپس دیوبند تشریف لائے مرض میں اضافہ پر اضافہ ہوتا گیا مگر لوگوں کے اصرار کے باوجود اپنے معمولات یومیہ ذکر وشغل کو ترک نہ کیا یکم دسمبر کو دل کے دورے بند ہوگئے اور افاقہ ہوگیا یہاں تک کہ جمعرات ۵ دسمبر ۱۰ بجے اپنے گھر کے صحن میں گھر کے لوگوں کو نصائح فرمائیں ساڑھے گیارہ بجے تقریباً معمولی غذا تناول فرما کر تھوڑی دیر آرام کرنے کے ارادے سے لیٹ گئے صاحبزادہ حضرت مولانا اسعد صاحبؒ پیر دبا کر باہر آگئے اس کے بعد ہی روح رفیق اعلیٰ کی طرف پرواز کرگئی مگر پتہ نہ چلا جب ظہر کی نماز کیلئے اٹھانے گئے تو پتہ چلا کہ قلب کا دورہ پڑ گیا ہے اور مسلمانان عالم کا یہ شفیق رہبر اس عالم سے رخصت ہو چکا ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون...

پسماندگان

حضرت کے پسماندگان میں حضرت مولانا امیر الہند سید اسعد مدنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، صدر جمعیۃ حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب دامت برکاتہم، حضرت مولانا سید اسجد مدنی دامت برکاتہم، ریحانہ، عمرانہ، صفوانہ، فرحانہ ہیں۔

ایک تاریخی تقریر کا اہم اقتباس

حضرت مدنیؒ نے دیوبند کی جامع مسجد میں ہندوستانیوں سے ایک دردناک اور ولولہ انگیز خطاب فرمایا اس کا کچھ اقتباس درج ذیل ہے۔ میرے بھائیوں اور بزرگوں! ۱۵/اگست ۴۷ء کے بعد سے ہم بہت بڑی حد تک غیر ملکی غلامی کے جوے

سے آزاد ہو چکے تھے اپنے دیش کی ترقی اور عالم لوگوں کی بھلائی اور خوش حالی کے لئے کام کرنے کی آزادی ہم کو حاصل ہوگئی ہے۔ اب ہمارا ملک بھی آزاد ہے، مرکز اور صوبوں میں آزاد حکومتیں قائم ہیں لیکن اس کے باوجود ابھی ہم کو مکمل آزادی حاصل نہیں ہوئی، انگریزی سیاست اب بھی ہمارے اندر کام کر رہی ہے حکومت برطانیہ کی پرانی مشن اسی طرح موجود ہے، بڑے بڑے راجہ، نواب، جاگیردار اور سرمایہ دار اب بھی ہمارے اندر فساد اور انتشار پیدا کر رہے ہیں جب تک یہ عناصر ہماری اجتماعی اور سیاسی زندگی میں دخیل نہیں اس وقت تک یہ سمجھنا کہ ہم کو مکمل آزادی حاصل ہوگئی ہے بالکل غلط ہے، انگریزی ایجنٹوں، پرانی حکومت کے کارندوں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی ریشہ دوانیوں نے ہمارے ملک کو فساد اور قتل وغارت گری کے جہنم میں جھونک دیا ہے اور اس ملک کے لینے والوں کی پرامن زندگی کو تباہ کر کے ان کو حقیقی آزادی کی نعمت اور اس کی برکتوں سے محروم کر دیا ہے، مذہب کے نام پر درندگی سب سے زیادہ شرم ناک بات ہے، دنیا کے پردہ پردہ کونسا مذہب ہے جس نے اس بربریت کی تعلیم دی ہو جس نے ضعیف بوڑھوں، معصوم بچوں، بے گناہ عورتوں اور مریضوں کے اس بزدلانہ قتل کی اجازت دیا ہو میں کہتا ہوں کہ وہ مذہب نہیں لعنت ہے، مذہب اسلام کے متعلق صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس درندگی کو برداشت نہیں کرتا، جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ہندوستان کے موجودہ فسادات میں انہوں نے زبردست جانی ومالی نقصانات اٹھائے ہیں، مسلمانو! مصائب کا طوفان کیوں نہ کھڑا ہو جائے عزم وہمت کا ثبوت دو، موت سے مت ڈرو، موت سے بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟ فرقہ وارانہ سطح سے ابھر کر ملک کی ترقی کے لئے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ

امیر شریعت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی دل وذہن اور زبان پر آتے ہی ایمان ویقین اور راسخ العقیدگی کا ایمان پرور احساس پیدا ہوتا ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اس طویل جدوجہد میں برصغیر کے کونے کونے، قریہ قریہ اور بستی بستی کا دورہ کیا۔ ہر جگہ اور ہر مقام پر مسلمانوں کو قرآن اور حدیث کی بنیاد پر اپنے لحن داؤدی میں اعلائے کلمۃ الحق کا درس دیا۔ آپ کی خطابت کا حسن آپ کی خوبصورت شخصیت کا عکس جمیل لئے ہوا تھا۔ آپ کو قدیم وجدید مدعیان نبوت سے سخت عداوت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی انتہا ہے جو امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کے دل ودماغ میں کارفرما تھی جب لاؤڈ اسپیکر ایجاد نہ ہوئے تھے تو بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی آواز بلندی سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک اور محترم زمانہ کے ہاشم یاد آئے تھے۔ جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی آواز جیسا کہ علماء تفسیر نے لکھا ہے کہ تقریباً دو میل تک پہنچتی تھی۔ جب کبھی کسی مخلص نے ان کے سوانح مرتب کرنے کی خواہش ان کے سامنے رکھی تو فرماتے: کون لکھے گا میری سوانح؟ ایک طوفان تھا جو گزر گیا میں نے بنجر زمینوں میں ہل جوتے، تاریک صحراؤں میں سفر کیا اور قبرستانوں

میں اذانیں دیں ہیں میں وہاں پہنچا ہوں جہاں دھرتی پانی نہیں دیتی تھی میں نے ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کے دلوں سے انگریز کا خوف نکال کر آزادی کا صور پھونکا یہ کہانی اتنی تلخ اور ہمہ گیر ہے کہ سوائے میرے اسے کوئی نہیں لکھ سکتا۔ ہاں اگر میں خود لکھتا تو بڑی دلکش معلوم ہوتی۔ مگر ہم جس مقصد عالی کے حصول کے لئے جدوجہد کررہے تھے وہاں اتنی فرصت کہاں؟

ایک دلچسپ واقعہ

اگر کھریلو معاملات نہ ہوں تو قلب ونظر کا سکون بے معنی ہوکر رہ جاتا ہے۔ امیر شریعت دیکھنے کو مسوری ایسی خوشنما اور دلفریب فضا میں رہ رہے تھے مگر رفیقہ حیات کی بیماری نے یہ جنت بھی جہنم بنادی تھی۔ اسی عالم میں ایک دن امیر شریعت کی چھ سات سالہ بچی گھر سے کھیلنے بازار اتری کہ غائب ہوگئی بچی کی گم شدگی نے سارے گھر کے ساتھ ساتھ حلقہ احباب کو بھی پریشان کردیا۔ مسوری کے نشیب وفراز کھنگال ڈالے گئے مگر بچی کا کوئی پتہ نہ چلا۔ بستر پر مریضہ کی حرارت بڑھ گئی۔ برطانیہ جیسی سلطنت کو للکارنے والا پیشانی سے پسینہ پونچھنے لگا۔ دوستوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ اسی طرح دن گزر گیا اور شام کے چراغوں نے مسوری کو جگمگا دیا۔ اتنے میں ایک انگریزی خاتون بچی کو لے کر گھر پہنچی۔ دیکھتے ہی امیر شریعت نے بچی کو سینے سے لگالیا اور انگریز عورت سے تلخی اور غصے میں کہا۔

''تم نے یہ کیا کیا؟ تم کون ہو! میرے گھر کا نظام تو نے درہم برہم کردیا''۔

انگریز خاتون! امیر شریعت کی یہ گفتگو نہ سمجھ سکی۔ مگر اس نے انگریزی میں کہا۔ عرصہ ہوا میری بچی جو شکل وصورت میں بالکل ایسی ہی تھی فوت ہوچکی ہے۔ مجھے یہ بچی بہت بھلی معلوم ہوئی میں آپ کی اطلاع کے بغیر اسے لے گئی، مجھے معاف کردیں

لیکن آئندہ صبح میں اسے یہاں سے لے جایا کروں گی اور شام کو چھوڑ جایا کروں گی۔ اس پر امیر شریعت نے کہا: تو ماں ہے! اگر ماں کے دکھی دل کو میرے دل کے ٹکڑے سے کوئی سکون مل سکتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن یہ دیکھنا کہ اس کی مریض والدہ بھی اسی کے سہارے زندہ ہے۔

امیر شریعت کی گرفتاری

چنانچہ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہا۔ کئی دنوں کے بعد انگریز خاتون اپنے خاوند کے ساتھ مسوری سے جانے لگی تو اس نے بلیوں کا نہایت خوبصورت جوڑا بچی کے کھیلنے کے لئے دیا۔ بلیاں اچھی نسل کی تھیں۔ گھر کے ہر فرد سے مانوس ہوگئیں بچی کو کھیلنے کے لئے جیتے جاگتے کھلونے مل گئے۔ قادیان تبلیغ کانفرنس نے مرزائی خلافت اور ایوان برطانیہ میں ارتعاش پیدا کردیا تھا۔ مرزائیت کی اڑتی ہوئی خاک میں خلیفہ قادیان کو موت کے نقشے ابھر کے دکھائی دینے لگے۔ باطل دعوؤں کی ایک ایک لکیر مٹنے لگی۔ آخر خود کاشتہ پودے کی حفاظت کے لئے امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کو قادیان کانفرنس کی تقریر کی بنا پر مسوری سے ۷ ستمبر ۱۹۳۴ء کو گرفتار کرلیا گیا۔

لیکن دوسرے دن ہی ڈیڑھ دو دن سے انہیں ضمانت پر رہا کردیا گیا۔ یہ ضمانت ڈاکٹر محمد امیر صاحب نے دی۔ امیر شریعت کی گرفتاری پر اہل خانہ تو بہر حال پریشان تھے لیکن بلیوں کے جوڑے میں سے نر نے تمام دن اور رات بغیر کچھ کھائے مکان کی چھت پر کھلی فضا میں وقت گزارا حالانکہ گھر کے سب لوگ اسے دودھ پینے کے لئے پکارتے رہے مگر وہ نیچے نہ اترا جیسے ہی امیر شریعت ضمانت پر رہا ہوکر مسوری پہنچے اور گھر والوں نے ان سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو انہوں نے فوراً آواز دی۔ بلاّ نیچے اتر کر امیر شریعت کے پاؤں چاٹنے لگا اور دودھ بھی پی لیا۔

مجذوب کی دعا

مقدمہ گورداسپور کی مصروفیت کے باوجود امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ اپنے مشن کیلئے رواں دواں رہے۔ ۱۹۳۴ء کا سال آخری مراحل پر تھا کہ معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کو ملتان جانا پڑا۔ جلسے کی حاضری تاحد نظر تھی اور اس پر خاموشی کا یہ عالم جیسے انسانی سروں پر پرندے بیٹھ رہے ہوں رات کے اس سکوت کو صرف امیر شریعت کی آواز توڑ رہی تھی واقعہ معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے اس تمثیلی انداز میں پیش کیا اور حاضرین کی محویت کا یہ عالم تھا کہ وہ محسوس کرنے لگے جیسے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری ان کے سامنے سے گزر رہی ہے۔ عین ایسے وقت پر مجمع سے ایک مجذوب اٹھا اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر اس نے ملتانی زبان میں کہا:

''سیدا! شالا اٹھائیں دفن تھیویں!

(اے سید! خدا کرے آپ یہیں (ملتان) میں دفن ہوں''۔

امرتسر جیل سے روانگی

۱۱/اپریل کو حسب دستور ڈسٹرکٹ جیل امرتسر سے شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ کو لاہور سنٹرل جیل میں تبدیلی کا حکم ملا۔ یہ کام پولیس اور دوسرے حکام نے بڑی رازداری سے کرنا چاہا لیکن نہ جانے اہل شہر کو کس طرح پتہ چل گیا کہ سینکڑوں کی تعداد میں لوگ ریلوے اسٹیشن پر شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ کی آمد سے پہلے پہنچ گئے۔ گاڑی چلنے میں کچھ منٹ باقی تھے کہ پولیس کی بھاری معیت میں شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ کو اسٹیشن پر لایا گیا۔ پاؤں میں لوہے کی بیڑیاں ہاتھوں میں ہتھکڑی اس حالت میں یہ مرد درویش جب اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوا تو پتھر بھی آبدیدہ ہوگئے۔ برطانوی سامراج کا مجرم وطن کا سپاہی قرآن کا

مبلغ، آزادی وطن کے جرم میں آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا قیدیوں کی گاڑی کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھا۔

عشق اپنے مجرموں کو پابہ جولاں چلا

آخر سینکڑوں انسانوں نے آنسوؤں کے ہار، دل کی دعائیں اور **حسبنا اللہ ونعم الوکیل** کہہ کر تین سال کے لئے اپنے سے جدا کیا: گاڑی نے منزل کی طرف سفر شروع کیا تو شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ نے کھڑکی سے باہر منہ نکال کر کہا:

درو دیوار پہ حسرت کی نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

بھنگی کا قبول اسلام

حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ ایک دفعہ کہیں سیڑھیاں چڑھ رہے تھے تو ایک بھنگی اوپر سے گندگی لے کر آرہا تھا، شاہ جی کو دیکھ کر دیوار سے چمٹ گیا، اللہ کے ولی کی جب بھنگی پر نگاہ پڑی تو اس کو کہا کہ اوپر آؤ میرے پاس، بھنگی حاضر ہوگیا۔ شاہ جی نے کہا کہ ہاتھ منہ دھو کر میرے ساتھ کھانے پر بیٹھو۔ اس نے تعمیل کی، شاہ جی نے اس کو اپنے پاس بٹھا کر ایک لقمہ اس کے منہ میں ڈالا اور پھر اس کو کہا کہ تم بھی لقمہ میرے منہ میں ڈالو۔ بھنگی کافی حیران ہوا۔

شاہ جی نے کہا انسان ہونے کے ناطے آپ میں اور مجھ میں کیا فرق ہے۔ گندگی اٹھانا تمہارا کام ہے، تم اس مکان کی گندگی صاف کررہے ہو، جب کہ میں پوری قوم کی گندگی صاف کررہا ہوں، بھنگی نے لقمہ اٹھا کر شاہ جی کے منہ میں ڈلا او ربولا، شاہ جی یہیں بیٹھے رہیں، وہ گھر گیا اور بیوی بچوں کو ساتھ لے آیا اور بولا..... یہی اسلام ہے تو پھر ہم سب کو مسلمان کردو۔

خطیب الہند کا ذوقِ شاعرانہ

سید الاحرار سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ شعر گوئی میں ندیمؔ تخلص فرماتے ان کا مجموعہ کلام ''سواطع الالہام'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ طبیعت کی موزونی کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ ساحرؔ لدھیانوی نے قحط بنگال پر جو نظم لکھی ہے، اس کے ایک بند کا دوسرا شعر نہیں ہو رہا تھا، شاہ جی نے نظم پڑھی، تعریف کی، ساحرؔ سے کہا ''اس کا صلہ یہ چند آنسو ہیں، انہیں فقیر کا نذرانہ سمجھو'' ساحرؔ نے تشکر وامتنان میں سر جھکا لیا، شاہ جی نے پوچھا ''اس بند کا دوسرا شعر کہاں ہے؟'' شعر تھا ؎

ملیں اس لئے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں کہ دختران وطن تار تار کو ترسیں

ساحرؔ نے کہا ابھی تک کوئی شعر موزوں نہیں ہو چکا، شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ نے قدرے توقف کیا پھر فرمایا یہ لو حاضر ہے ؎

چمن کو اس لئے مالی نے خون سے سینچا تھا کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں

اور ساحرؔ نے قبول کر لیا ان کے مجموعہ کلام ''تلخیاں'' میں شامل ہے۔

☆☆☆

محترمہ آبادی بیگم

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں لاکھوں ہندوستانیوں نے جان و مال وطن کی آبرو پر قربان کیے۔ اس جنگ میں ہندوستان اپنے ہی گھر کے غداروں کی وجہ سے ہار گیا اور انگریز قوم اس عظیم خطۂ ارض پر قابض ہوگئی۔ لیکن وطن پرستی کے جذبے کو دنیا کی سب سے شاطر اور دنیاوی طور پر ترقی یافتہ برطانوی حکومت بھی ختم نہ کر سکی اور انیسویں صدی کے نصف آخر سے بیسویں صدی کے ۱۹۷۴ء تک محبان وطن کی جدوجہد جاری رہی۔ آزادی وطن کیلئے لڑی گئی ہر لڑائی میں اپنے ہم وطنوں کے ساتھ مسلم مجاہد آزادی ہر محاذ پر پیش پیش رہے۔ وطن کی عزت و ناموس کیلئے بڑی سے بڑی قربانی دینے میں مسلمان عورتیں بھی ہم وطن غیر مسلم خواتین سے پیچھے نہیں رہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جھانسی کی رانی لکشمی بائی اور بیگم حضرت محل جیسی بہادر خواتین برصغیر کی تاریخ میں نمایاں ہوئیں تو بیسویں صدی کے نصف اول کی فیصلہ کن تحریک آزادی میں شریمتی سروجنی نائیڈو سے لے کر شریمتی اندرا گاندھی تک نامور ہندو خواتین کی بڑی تعداد وطن کیلئے ایثار و قربانی میں نمایاں ہیں۔ اسی طرح مسلم خواتین غالباً اس سے بڑی تعداد میں آزادی کی لڑائی میں شامل نظر آتی ہیں جن میں

عظیم مجاہد آزادی مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کی والدہ محترمہ آبادی بیگم یعنی بی اماں اور پیکر عزیمت وحریت مولانا حسرت موہانی کی اہلیہ نشاط النساء بیگم ایسی خواتین ہیں جنہوں نے گاندھی جی کی قیادت میں کانگریس کی فیصلہ کن تحریک آزادی میں عملی مجاہدانہ کردار ادا کیا۔ ہماری تاریخ آزادی کا سب سے المیہ ہے کہ تقسیم وطن کے بعد ایک خاص ذہنیت کی بالادستی نے وطن کی آزادی میں سب سے زیادہ خون بہانے والی اقلیت کی قومی اہمیت کو چھوٹا کر کے دکھانے کی سازش کی اور مسلم مجاہدین آزادی کے کارناموں کو نئی نسل کے ذہنوں سے محو کرنے کی منظّم کوشش کی گئی۔

وطن کے متعلق تلخ حقیقت

اس تلخ حقیقت کو جھٹلایا نہیں جاسکتا کہ تنگ نظر ذہنیت نے ملک کے تعلیمی نصاب اور جملہ عوامی ذرائع ابلاغ سے ان سرفروش مجاہدین وطن کو تقریباً خارج کر دیا، جن کے ذکر کے بغیر تاریخ آزادی نامکمل اور ایک حد تک غلط ہے۔ تاہم یہ سوچ کر صبر کیا جاسکتا ہے کہ یہ اس سب سے بڑے سیاسی جرم کا نتیجہ ہے جس نے مذہب کے نام پر مادرِ وطن کے ٹکڑے کرائے، برصغیر کی زمین ہی نہیں بلکہ صدیوں پرانی مشترکہ تہذیب وتمدن کے بھی بخرے کر ڈالے، چونکہ دنیا کی ہر بالادست اکثریت کم عددوں کے ساتھ کچھ ایسا ہی رویہ اختیار کرتی ہے، لہٰذا اس سے شکایت بے معنی ہے لیکن اس سے بڑھ کر اذیت وافسوس کی بات یہ ہے کہ اپنے آزاد سیکولر جمہوری ملک میں جہاں تحریر، تقریر اور اظہار کی مکمل آزادی ہے وہاں خود ہم نے اس سچائی کو بھرپور طریقے سے پیش نہیں کیا جس سے اس ملک کی نئی نسلوں پر یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ ہمارے بزرگوں نے بھی سرزمین وطن کو اپنے خون سے سینچا ہے، آزاد ہندوستان کیلئے ان کی قربانیاں اور جدوجہد کسی سے کم نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہمارے

مورخین اور دانشوروں نے اس موضوع پر کام نہیں کیا، کام کیا ہے، لیکن اس میں ملی اور وطنی خلوص کا فقدان صاف نظر آتا ہے۔ آپ تحریک آزادی ہند کی تاریخ کھنگالیے، دوسروں کی نہیں اپنی کتابوں کو دیکھئے صرف ایک مثال مجاہدۂ آزادی بی اماں کو پیش نظر رکھئے، اس سے زیادہ کچھ نہیں ملتا کہ آپ تحریک خلاف کے عظیم رہنما علی برادران کی والدہ تھیں، اپنے بچوں کو انہوں نے دین اسلام اور مشرقی علوم کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اعلیٰ سطح پر انگریزی تعلیم دلانے کیلئے بے پناہ کوشش وایثار کا مظاہرہ کیا اور اپنے دونوں فرزندوں کو جہد آزادی کی قیادت کے قابل بنایا۔ انہوں نے بابائے ہند مہاتما گاندھی کی قیادت میں کانگریس کو طاقتور بنانے میں تحریکِ خلافت کو کامیاب بنانے کیلئے اپنے نامور بیٹوں کو اپنے موقف پر جان تک قربان کرنے کی تلقین کی تھی جو اس وقت کروڑوں ہندوستانیوں کی زبان پر تھا کہ:

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

بی اماں کی تقاریر

دراصل علی برادران کے کارنامے اور ان کی عالمگیر شہرت کے شور میں عظیم خاتون مجاہد آزادی محترمہ آبادی بیگم عبدالعلی المعروف بہ 'بی اماں' کی قائدانہ جدوجہد اس حد تک گم ہو کر رہ گئی، ہمارے دانشوروں نے ان کی عظمت کے تذکرے بھی کیے لیکن سرسری اور اجمالی حالانکہ ان کی خدمات اور مساعی متقاضی تھیں کہ ان پر پوری پوری کتابیں صرف اردو میں ہی نہیں انگریزی اور دوسری ہندوستانی زبانوں میں مرتب کی جاتیں، تحقیق ہوتی اور حقائق کو دنیا پر اجاگر کیا جاتا۔ آزادی وطن کے بعد ۶۰ برسوں تک اس جہت میں بہت کم کام ہوا ہے۔ البتہ آزادی کی نصف صدی

گزر جانے کے بعد سنہ ۲۰۰۱ میں ہندی کے نامور صحافی مسٹر شری کانت نے خدا بخش لائبریری کی فرمائش پر مسٹر تقی رحیم کے تعاون سے بہار آرکائیوز میں محفوظ انگریزوں کے محکمہ خفیہ کی رپورٹس کو - An Account of Bi Amman's Bihar Visit 1922 کے عنوان سے مرتب کیا، اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق اردو ریڈر ڈاکٹر انجمن آرا بیگم نے اس دستاویزی کتاب کا اردو ترجمہ ''بی اماں کا دورۂ بہار۔ 1922'' کے عنوان سے کیا۔ یہ کتاب 'بی اماں' کے صرف اس تاریخی دورۂ بہار کی سرگرمیوں پر مبنی ہے جو انہوں نے ۱۹۲۲ء میں خلافت کمیٹی کے مقاصد کی ترویج کے لئے کیا تھا۔ اس موقع پر انکی ولولہ انگیز تقریروں نے نہ صرف بہار بلکہ مرکزی برطانوی حکومت کو لرزہ براندام کر دیا تھا۔ اس دور کے عمائدین، عوام اور مجاہدین آزادی کے درمیان وہ آزادی ہند کی خاتون سپہ سالار کی طرح باوقار اور باحوصلہ نظر آتی ہیں۔ اس ۲۰۰ صفحات کی کتاب میں اس وقت کے بہار کے پرستاران وطن کے ساتھ ساتھ بی اماں کی قائدانہ شخصیت روشن ہو کر سامنے آجاتی ہے، حالانکہ بی اماں نے بہار ہی نہیں ملک بھر میں خلافت اور کانگریس کا پرچم بلند کیا تھا۔ ان کی سیاسی شخصیت کے بہت سے پہلو ملک بھر میں ایسی ہی رپورٹوں اور دستاویزی شواہد کی صورت میں بکھرے ہوں گے۔

یہ اربابِ تحقیق کی ملی اور وطنی غیرت کا فرض منصبی ہے جو غالباً ابھی تک تشنۂ عمل ہے۔ بی اماں وطنی سیاست کے کس بلند مرتبے پر فائز تھیں، بقول ڈاکٹر عابد رضا بیدار: ''بی اماں سے لاکھوں ہندوستانی عوام نے بے انتہا محبت کی اور گاندھی جی نے انہیں محترم سمجھا، وہ ٹوپی جو گاندھی جی نے پہنی تھی جو گاندھی کیپ کہلاتی ہے وہ بی اماں کا ہی عطیہ تھی''۔

بی اماں کا آزادی میں کردار

بی اماں کا دورۂ بہار ۱۹۲۲ء کے ''تعارف'' میں مرتب کتاب مسٹر سری کانت نے محترمہ بی اماں کے حوالے سے ہندوستان کے تقریباً تمام ہی مورخین اور سیاسی تذکرہ نویسوں کی کم نگاہی کو آشکارا کر دیا ہے، موصوف لکھتے ہیں: ''جنگِ آزادی کے بہت سے قصے یا تو تاریخ میں اپنی جگہ بنانے میں ناکام رہے یا پھر مورخین نے قصداً انہیں نظر انداز کر دیا۔ بی اماں جنہوں نے انگریزوں کی غلامی سے ملک کو آزاد کرانے میں اہم کردار ادا کیا، ان کی سرگزشت تاریخ کا ایک ایسا ہی قصہ ہے۔ بی اماں جنہوں نے ۱۹۲۲ء میں بہار کا دورہ کیا تھا، تحریک خلافت کے مجاہدین علی برادران کی والدہ تھیں۔ بی اماں نے اس تحریک کے لئے بہت زیادہ کام کیا جو اس زمانے میں انگریزوں کی سامراجیت کو ختم کرنے کے لئے زور پکڑ رہی تھی۔ لیکن نہ تو ممتاز مورخ مسٹر کے، کے، دت کی کتاب "Freedom Movement in Bihar" میں اور نہ ڈاکٹر راجندر پرساد کی معروف خودنوشت سوانح عمری میں بی اماں کے بہار کے دورے کا کوئی ذکر ہے اور نہ جنگ آزادی میں ان کی خدمات کا کوئی تذکرہ۔ بی اماں نے عوام میں جو تقریریں کیں ان کے مطالعے سے بے ساختہ میکسم گورکی کے شاہکار ناول 'ماں' کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

بی اماں نے بہار کے دور دراز علاقوں میں جا کر گھر کی چہار دیواری میں مقید ہندو مسلم خواتین کو جنگِ آزادی کا اصل مفہوم سمجھایا۔ اس زمانے میں کسی خاتون کا یہ ایک غیر معمولی سیاسی کارنامہ تھا۔ غالباً بہار کی تاریخ میں وہ پہلی خاتون تھیں جنہوں نے انگریزی حکومت کے خلاف جدوجہد آزادی میں حصہ لیا تھا اور ہندو مسلم اتحاد بحال کرنے کے لئے مثبت کوششیں کی تھیں۔

بی اماں کی تقاریر سے پیغامات

ہر چند کہ مورخین نے بی اماں کو نظر انداز کر دیا لیکن اس زمانے کے ایک نا معلوم شاعر کی نظموں کی وہ ایک نمایاں کردار بن گئیں۔ اس وقت کی ایک سی، آئی، ڈی رپورٹ میں یہ نظمیں درج ہیں، بی اماں کی تقریروں میں آج بھی شورش زدہ بہار کے لئے جو ذات پات اور دوسرے جھگڑوں میں گرفتار ہے۔ ایک مناسب پیغام ہے۔ ایسے وقت میں جب کہ لوگ مذہب اور ذات پات کے نام پر ختم نہ ہونے والے تنازع میں ایک دوسرے سے برسر پیکار ہیں، بی اماں کی تقریروں میں امن وآشتی سے رہنے کا پیغام ملتا ہے۔

دراصل پسرنا کمار چودھری نے میرے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ میں مسلم طبقے پر کام کروں اور اس کے رول اور خدمات کی تاریخ مرتب کروں۔ مسٹر چودھری کے تفویض کردہ موضوع پر جب میں نے کام کرنا شروع کیا تو ریاستی آرکائیوز میں بی اماں سے متعلق بہت سی دستاویزیں اور کاغذات نظر سے گذرے۔ میرے اندر جوش کی ایک لہر دوڑ گئی کہ تاریخ کی اس حقیقت کو بے نقاب کردوں جس پر مورخین نے پردہ ڈال رکھا ہے''۔

محترمہ آبادی بیگم کی ولادت

محترمہ آبادی بیگم عرف بی اماں کی ولادت ۱۸۵۲ء میں امروہہ ضلع مرادآباد میں ہوئی۔ ان کے آباواجداد کا تعلق مغل دربار سے تھا۔ اس معزز خاندان کے افراد مغلیہ سلطنت میں اہم عہدوں پر فائز ہوتے آئے تھے۔ آبادی بیگم کے بزرگوں میں سے ایک نواب شمس الدین خاں تھے جنہوں نے امروہہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

دہلی کے بادشاہ نے انہیں امروہہ کے علاقے میں جاگیر عطا کرنی چاہی تو انہوں نے اس وجہ سے قبول نہیں کی کہ وہ امروہہ میں کثرت سے آباد اہلِ سادات پر حکومت کرنا گناہ تصویر کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں جب آبادی بیگم صرف ۵ سال کی تھیں ان کے والد، والدہ اور اہل خاندان کو امروہہ چھوڑ کر سنبھل جانا پڑا۔ اس ترکِ مکانی کی وجہ یہ تھی کہ ان کے والد کا تعلق بہادر شاہ ظفر اور اس وقت کے اہم مجاہدین آزادی سے تھا۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد آبادی بیگم کے والد کو بھی انگریزوں نے گرفتار کیا اور برائے نام مقدمہ چلا کر پھانسی کی سزا دی۔

کہتے ہیں کہ تختۂ دار پر انہوں نے خود اپنے گلے میں پھندا ڈالا لیکن اس سے قبل کہ جلاد رسی کو کھینچتا ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ بی اماں کے چچا سنبھل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے لیکن پھر وہ کہاں گئے یہ کبھی معلوم نہ ہو سکا۔ بی اماں اپنی والدہ کے ساتھ رامپور چلی گئیں۔ جہاں ان کا بچپن گزرا۔ جب وہ جوان ہوئیں تو ان کی شادی عبدالعلی صاحب سے ہوئی جو ریاست کے کسی محکمے میں ملازم تھے۔

بی اماں بیحد سلیقہ شعار اور خوش اخلاق خاتون تھیں۔ ان کے شوہر اور سسرال کے لوگ ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کے چھ بچے ہوئے۔ ۱۸۸۰ء میں رامپور میں ہیضے کی وبا پھیلی جس میں عبدالعلی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ بیوہ ہو جانے کے بعد انہوں نے دوسری شادی نہیں کی۔ اگرچہ وہ ابھی جوان تھیں اور لوگ عقد ثانی کر لینے پر زور دیتے تھے لیکن انہوں نے یہ کہہ کر سب کو خاموش کر دیا کہ ''پہلے ایک شوہر تھا، اب تو چھ ہیں''۔ ان کی مراد اپنے چھ بچوں سے تھی، جن کی اچھی پرورش اور تعلیم وتربیت کو انہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا۔ ان کے بچے انہیں بی اماں کہتے تھے، بعد میں وہ پورے ہندوستان کی بی اماں ہو گئیں۔

بی اماں کی وفات

عبدالعلی صاحب نے تھوڑی بہت جائداد چھوڑی تھی، اس کے علاوہ گزارنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ لوگوں نے ان کو رائے دی کہ وہ یہ جائداد فروخت کر دیں۔ لیکن انہوں نے جواب دیا: ''میرے شوہر جو جائداد اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں اس پر میرے بچوں کا حق ہے، میں اس ترکے کو ضائع نہیں ہونے دوں گی۔'' وہ سلائی کڑھائی کا کام کر کے کسی نہ کسی طرح بچوں کو پالنے لگیں۔ اپنی غیر معمولی ماں کے بارے میں مولانا محمد علی جوہر لکھتے ہیں: ''میرے والد نے ۱۷ رمضان المبارک ۱۲۹۷ ہجری میں بعارضہ ہیضہ، کوئی ۳۲-۳۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔ سوائے قرآن پاک کے انہوں نے کچھ نہیں پڑھا تھا، اسی کی مدد سے اردو کا بین السطور ترجمہ پڑھنے کی استعداد پیدا کرنی تھیں۔ والد نے ۳۲-۳۰ ہزار کا قرضہ چھوڑا تھا اور پانچ لڑکے اور ایک لڑکی جن میں سب سے بڑے کی عمر ۱۳ سال کی تھی جو تین برس کی عمر میں ہی مرگی کے موذی مرض میں مبتلا رہے اور سب سے چھوٹا میں خود تھا جس کی عمر پونے دو سال کی تھی۔ مجھے والد مرحوم بالکل یاد نہیں مگر والدہ مرحومہ کو کبھی نہیں بھول سکتا، علاوہ اس فیض گراں مایہ کے جو شوکت صاحب کی محبت، نگرانی اور ترغیب وتحریص کی بدولت مجھے نصیب ہوا۔ میں جو کچھ ہوں، اور جو کچھ میرے پاس ہے وہ خداوند کریم نے مجھے اسی مرحومہ کے سائے میں پروان چڑھنے کا موقع مرحمت فرمایا۔ والد مرحوم کی وفات کے دن سے خود گھر کی بوڑھی ماماؤں کا سادہ اور سستا لباس پہنا اور انہی کی طرح روکھی سوکھی کھا کر گزر بسر کی مگر ہمارا کوئی سوال رد نہیں کیا اور ہمیں اس عیش وآرام میں رکھا، پالا اور بڑا کیا جو ہمارے ان چچاؤں کی اولاد سے عیش وآرام میں کم نہ تھا بلکہ کچھ زائد ہی تھا، جو بفضل تعالیٰ والد صاحب کے انتقال کے وقت زندہ

اور سلامت تھے۔ اور جنکی جائدادوں پر قرض کا بوجھ نہ تھا جو ہمارے ترکہ پر تھا اور جو ریاست میں بڑے عہدوں پر ممتاز تھے۔ ان سب سے پہلے ہمیں گھر سے نکال کر بریلی اسکول میں تعلیم کیلئے والدہ مرحومہ نے بھیجا، اور وہ سب تو اسکول چھوڑ چھاڑ کر گھر چلے گئے مگر ہماری تعلیم جاری رہی اور شوکت علی صاحب جس طرح رامپور کے باشندوں میں غالباً سب سے پہلے گریجویٹ ہوئے۔ اس طرح میں سب سے پہلے آکسفورڈ کا گریجویٹ ہوا''۔ (خودنوشت روزنامہ ہمدرد ۱۷ جون ۱۹۲۷ء)

مولانا محمد علی کو اطلاع ملی کہ رامپور میں بی اماں کی طبیعت بہت خراب ہو چکی ہے۔ علی برادران کو رامپور شہر میں داخلہ کی اجازت نہیں ملی بی اماں خود اسٹیشن پر تشریف لے آئیں۔ بیٹے ماں کو دہلی لائے ڈاکٹر انصاری کا علاج ہوا مگر ۱۹۵۲ء کو پیدا ہونے والی بی اماں کا ۱۳-۱۲ نومبر ۱۹۲۴ء کو رات میں انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بی اماں کیلئے ہندوستان کا کون سا ایسا ادنیٰ سے اعلیٰ تک سیاسی راہنما نہیں بچا جس نے خراج عقیدت پیش نہ کیا ہو۔ گاندھی جی نے بی اماں کو اتحاد آزادی وطن کا نشان لکھا بلکہ اپنے آپ کو بی اماں کا تیسرا بیٹا مانا تھا۔''

☆☆☆

وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزادؒ [1]

مولانا آزادؔ کہ جن کا اصل نام محی الدین احمد تھا، ایک علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ مولانا نے تخلص ''آزادؔ'' اس خواہش کے زیر نظر رکھا تھا کہ ایک دن ہندوستان انگریزوں کے قید سے آزاد ہوگا تو وہ خود کو فخر کے ساتھ نہ صرف آزاد کہہ سکیں گے بلکہ اپنے ساتھیوں کو بتائیں گے کہ دیکھو بچپن سے ہی میں ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کررہا تھا۔ ایک مولانا آزاد کی پیدائش 11 نومبر 1888ء میں مکہ معظّمہ میں ہوئی تھی۔ ان کے والد مولانا خیرالدینؒ بن شیخ محمد ہادی ایک عالم دین اور صوفی پیر تھے۔ جب مولانا آزاد تقریباً 11 سال کے تھے تو اپنے والد کے ساتھ ہندوستان چلے آئے اور کلکتہ میں بس گئے۔

کلکتہ میں انہوں نے یوں تو کئی مکانات میں رہائش اختیار کی مگر آخر میں وہ اشرف مستری لین، بالی گنج سرکلر روڈ میں ایک مکان کرایہ پر لے کر رہنے لگے جسے آج ''مولانا آزاد میموریل'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ کیونکہ اسے کلکتہ کے ایک ادارہ ''مولانا ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوشن آف ایشین اسٹڈیز'' نے مرکزی حکومت وحکومتِ مغربی بنگال کی مدد سے ان کے نام میں محفوظ کرادیا۔ مولانا آزاد کی اس

[1] رافعہ سعادت بی اے (علیگ)۔ سالار، 11 نومبر 2010ء

رہائش کو محفوظ کرانے میں جو لوگ پیش پیش رہے، ان میں خاص نام ہیں: پروفیسر نورالحسن، جے کے رائے، اے کے رائے، احمد سعید ملیح آبادی، پروفیسر مہاویر سنگھ، پروفیسر ایچ وی مہادیون اور راقم الحروف۔ مولانا آزاد کی تین بڑی بہنیں یعنی خدیجہ بیگم، فاطمہ بیگم آرزو، حنیفہ بیگم آبرو، اور ایک بھائی مولانا غلام یسین ابوالنصر آہ تھے۔ مولانا اپنے خاندان میں سب سے چھوٹے تھے۔ بہنوں میں سب سے بڑی خدیجہ بیگم تھیں جن کا انتقال 1943ء میں ہوا۔ دوسری فاطمہ بیگم تھیں جن کا انتقال 1966ء میں ہوا۔ تیسری بہن حنیفہ بیگم کا انتقال بھی 1943ء میں ہوا۔ بھائی غلام یسین کا انتقال 1909ء میں ہی ہوگیا تھا۔ مولانا کی طرف ان کے سبھی بہن بھائی عالم وفاضل، مفکر اور مصنف تھے۔ چونکہ خود مولانا آزاد بہت کم عمر میں عالمی شہرت یافتہ مصنف وعالم بن چکے تھے۔ ان کے بہن بھائی وہ شہرت حاصل نہ کرسکے جو ان کے بھائی مولانا آزاد کو حاصل ہوئی۔

مولانا آزاد بٹوارے کے لئے راضی نہ تھے

مولانا آزاد کی ذات میں قدرت نے بیک وقت بہت سی خصوصیات جمع کردیتے ہیں۔ وہ عالم دین بھی تھے، اور مفسر قرآن بھی، وخطیب بھی تھے اور مفکر بھی، وہ مدبر بھی تھے اور دانشور بھی، وہ ایک سیاستداں بھی تھے اور صحافی بھی، دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی کونسی خصوصیت باقی تمام خصوصیات پر حاوی تھی۔

جدوجہد آزادی ہند کی تاریخ میں جو سب سے اہم بات یاد رکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد ملک کے بٹوارے سے قبل اور اس کے بعد وہ واحد شخصیت تھے کہ جنہوں نے ملک کی تقسیم کے لئے رضامندی ظاہر نہیں کی۔ یہاں تک کہ گاندھی جی اور نہرو آخر میں تقسیم کے لئے راضی ہوگئے۔ مولانا آخر تک ایک مضبوط چٹان کی

طرح اڑے رہے۔ اپنی تصانیف میں مولانا نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی ناکامیابی یہ تھی کہ وہ تقسیم کو نہ روک سکے۔

ہندو مسلم ایک پلیٹ فارم پر

ہندوستان کے رہنماؤں میں بہادر شاہ ظفرؒ کے بعد مولانا آزاد واحد ایک ایسے لیڈر تھے کہ جنہوں نے آزادی ہند کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر یکجا کیا ہو۔ یہ بات بھی بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ مولانا آزاد نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے قرآنی آیات وہدایات کی وکالت بھی کی تھی۔ وہ انتہائی زور دے کر کہا کرتے تھے کہ ہندو مسلم اتحاد کی نشاندہی پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات زندگی میں نمایاں طور پر موجود ہے۔ یہ کارنامہ ان کی زندگی کا عظیم ترین کارنامہ کہا جاتا ہے۔ ہم لوگوں کے ساتھ دراصل پریشانی یہ ہے کہ ہم مولانا کو سمجھے بغیر ہی ان کا احترام کرتے ہیں۔ مولانا آزاد نے صرف 15 برس کی چھوٹی سی عمر میں درس نظامیہ جیسے اہم ومعتبر اور محققانہ نصاب تعلیم کی پڑھائی مکمل کی تو تمام دنیا ان کی دانشورانہ صلاحیتوں پر حیران رہ گئی۔

1906ء اور 1915ء کے درمیان مولانا آزاد بطور ایک مضمون نگار، ادیب ومصنف اور محقق بن کر نمودار ہوئے۔ مسلمانان ہند کو انگریزوں کے خلاف جدوجہد آزادی میں شامل کرنے کی غرض سے انہوں نے 1912ء میں کلکتہ سے ''الہلال'' نام کا اخبار جاری کیا۔ انگریزوں نے جب دیکھا کہ یہ اخبار ہندوؤں اور مسلمانوں کے دل ملا کر کام کر رہا ہے تو انہوں نے اسے بند کر دیا۔ اس کے بعد مولانا نے 'البلاغ'' جاری کیا جسے 1916ء میں انگریزوں نے پھر بند کر دیا۔ آج کچھ لوگ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفریق ڈالنے کے لئے اکثر ایک بحث چلا دیتے ہیں کہ آپ مسلمان

پہلے ہیں یا ہندوستانی۔ اس کا جواب مولانا بڑا اچھا دیا تھا۔ مولانا کی مشہور تقریر جس سے ان کے دل میں اسلام اور ہندوستان دونوں سے محبت کا اظہار ہوتا تھا۔ گاندھی جی کو بہت پسند تھی۔ جس میں مولانا نے کہا تھا ''میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں، اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام تاریخ اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ میں اس کی حفاظت کروں۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحد قومیت کا ایک عنصر ہوں''۔

مولانا آزاد کی زندگی کھلی کتاب

مولانا نے خود اپنے بارے میں پارلیمنٹ میں پرشوتم داس ٹنڈن کی ایک تقریر کے جواب میں کہا تھا کہ ''میری پوری زندگی ایک کھلی کتاب ہے..... میں بے غرض ہوں اور جو بے غرض ہوتا ہے۔ بے پناہ ہو جاتا ہے۔ آپ سمجھے! بے پناہ کون ہوتا ہے..... بے پناہ وہ ہوتا ہے جسے کوئی تلوار کاٹ نہیں سکتی۔'' تقسیم وطن اور اس کے بعد کے وحشیانہ فسادات سے اس عظیم رہنما ومفکر کی زندگی کو ویران بنا دیا گیا مگر باوجود اندرونی طور پر اجڑ جانے کے بعد انہوں نے آزاد مگر جغرافیائی طور پر منقسم ہندوستان میں تعلیم، سائنس، اور ثقافت کی بحالی کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ آزادی کے بعد بھی مولانا آزاد نے تعلیم وثقافت کے لئے بڑا کام کیا اور بہت سے ادارے کھولے جیسے ساہتیہ اکادمی، نرتیہ ناٹیہ کلا اکادمی، آئی، سی، سی، آر وغیرہ جہاں تک

مولانا تقسیم ہند سے قبل پاکستان کے قیام کے بعد پاکستان کے بارے میں انہوں نے منکسر المزاجی کے ساتھ کام لیا اور صحافیوں سے یہی کہا کرتے تھے کہ اب چونکہ پاکستان کا قیام عمل میں آ گیا ہے، ان کی خواہش یہی ہے کہ وہ پھلے پھولے اور ترقی کی راہ پر گامزن ہو۔ اس سلسلہ کی قابل ذکر بات یہ ہے کہ قائد پاکستان محمد علی جناح مرحوم نے آخر میں اپنی غلطی کا اقرار و احساس کر لیا تھا اور وہ اپنے آخری دنوں میں دلی آ کر پنڈت نہرو سے گفتگو کے خواہش مند تھے مگر موت نے انہیں اس کی مہلت نہیں دی اور ادیب ہندوستان کے از سر نو متحد ہونے کا خواب پارہ پارہ ہو کر رہ گیا۔

مولانا آزاد کا قرآن سے شغف

چنانچہ انہوں نے قرآن پاک کی تفسیر بنام ''ترجمان القرآن'' بھی لکھی، جس کے متعلق پرانے چراغ میں مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ فرماتے ہیں :
''۳۴-۱۹۳۳ء میں ان کی تفسیر و ترجمہ ''ترجمان القرآن'' کی پہلی پھر دوسری جلد چھپ کر نکلی میں اس زمانے میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں تدریس کے فرائض انجام دیتا تھا اور تفسیر میرا خاص مضمون تھا میں نے یہ جلد بڑے ذوق سے پڑھی اور اس سے بہت فائدہ اٹھایا۔ سورہ برأت کی تفسیر کے سلسلے میں انہوں نے غزوۂ تبوک سے بچھڑ جانے والے تین صحابیوں کی داستان ان کے ایک رفیق کعب بن مالکؓ کی زبان سے جس طرح سنائی ہے اس میں ترجمہ و روایت کی پوری احتیاط و دیانت کے ساتھ اپنے جادو نگار قلم سے جس طرح جان ڈال دی ہے ان کی ذہنی کشمکش، نازک امتحان، اسلام سے سچی وفاداری اور عشق رسول کی جس طرح تصویر کھینچی ہے ان کے دل کی دھڑکنوں کو جس طرح الفاظ میں منتقل کیا ہے، جس برجستگی و بے ساختگی کے ساتھ اردو اور فارسی کے آبدار شعروں کو جا بجا نگینہ کی طرح جڑا ہے، اس نے مضمون کو صرف اردو

ہی نہیں بلکہ دنیا کے کلاسیکی ادب میں شامل ہونے کا مستحق بنا دیا ہے۔ اس سے زیادہ سحر طراز قلم نے حضرت یوسفؑ و یعقوبؑ کی سیرت و کردار، جذبات و تاثرات ان کے درد و غم، ان کے ثبات و استقامت کی تصویر کھینچنے میں کمال دکھایا ہے۔ یہ ایک تفسیری مضمون ہے۔ جس میں قرآن مجید کی وجہ سے قدم قدم پر ''ہوشیار و نگاہ روبرو'' کی صدا کانوں میں آتی ہے، لیکن پیدائشی ادیب اور غیر معمولی ذہین انسان اپنے ادبی جوہر دکھانے اور نئے نئے گل کھلانے سے باز نہیں رہ سکتا جب یوسف جیسے جمیل و جلیل انسان کا تذکرہ ہو''۔

آزادیٔ وطن کی خاطر مولانا کی جدوجہد

انہوں نے دینی خدمت کے جذبے سے افغانستان، عراق، مصر، شام اور ترکی وغیرہ کے اسفار کئے، چنانچہ عراق میں انہوں نے ان ملک بدر مجاہدین سے ملاقات کی جو ایران میں ایک آزاد حکومت نے قیام کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ مصر میں انہوں نے شیخ محمد عبدہ اور سعید پاشا و دیگر مجاہدین سے ملاقات کی جو اس وقت عرب دنیا میں انتہائی فعال و متحرک شخصیات گردانی جاتی تھیں۔ ان تمام تعلقات کی بنیاد پر اور ان لوگوں سے ترغیب پا کر انہوں نے ''قومی جہاد'' کو اپنے ذہن میں ترتیب دیا۔ غیر ممالک کے ان طویل دوروں سے وطن واپسی کے بعد مولانا آزاد بنگال نے ایسے دو لوگوں سے ملے جو تحریک آزادی کے سرگرم رکن تھے۔ اروند گھوش اور شری شیام سندر چکرورتی۔ اس کے بعد انہوں نے برطانوی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ ابوالکلام آزاد نے دیکھا کہ بنگال اور بہار میں تحریک آزادی کی سرگرمیوں پر پابندی ہے۔ چنانچہ دو سال کی قلیل مدت میں مولانا آزاد نے شمالی ہند اور بمبئی میں تحریک آزادی کے متعدد سینٹر اور دفاتر قائم کر دئے۔ اس دوران ان کے حلقے میں

شامل بعض لوگ مسلم مخالف بھی تھے۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ برطانوی حکومت مسلم قوم کو ہندوستان کی جنگ آزادی کی جدوجہد کے خلاف استعمال کررہی ہے۔مولانا آزاد نے ان کی اس غلط فہمی کا بحسن وخوبی ازالہ کیا اورانہیں یہ یقین دلایا کہ ہندوستان کی جنگِ آزادی میں ہندومسلم دونوں ایک ہیں۔

استخلاص وطن کے لئے قلمی جہاد کا آغاز

جولائی ۱۹۱۲ء میں مولانا آزاد نے قلمی جہاد کا بھی آغاز کردیا اور ''الہلال'' نامی ہفت روزہ کی اشاعت کا بیڑہ اٹھالیا۔جس کا مقصد مسلمانوں کے درمیان اس تحریک آزادی کو فروغ دینا تھا۔ ہندومسلم کے درمیان خوں ریز فسادات کے بعد جب دونوں قوموں کے درمیان تلخیاں بڑھ رہی تھیں اس وقت ''الہلال'' نے ان دونوں کو باہم متحد کرنے میں اہم ترین کردار ادا کیا۔اس دوران ''الہلال'' ہندوستانی قوم کے جذبات کا بہترین ترجمان بن چکا تھا۔ الہلال کے مقام ومرتبے سے متعلق شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی نے ان سے کہا: ''حضرت! آپ ''الہلال'' اس ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں حالانکہ اس میں تصاویر ہوتی ہیں اور اس کا ایڈیٹر (مولانا ابوالکلام آزاد) متشرع بھی نہیں ہے''۔ اور پھر فرمایا: ''میں الہلال کیوں نہ پڑھوں کہ یہ پہلا رسالہ ہے جس نے ہم کو جہاد کا سبق یاد دلایا ہے جو ہمارا فریضہ تھا اور ہم اسے بھول چکے تھے''۔ (مولانا آزاد اوران کے ناقد، ص ۱۹)

نئی نسل کے نام مولانا کا پیغام

مولانا ابوالکلام آزادؒ دین اور نئی نسل سے متعلق کیا سوچتے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر مختار احمد

انصاری جنوری ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی دعوت کیلئے لاہور آئے تھے تو تینوں مسلمان رہنماؤں کو اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل نے تقریروں کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ تینوں ۲۹ رجنوری ۱۹۲۸ء کو دن کے سوا گیارہ بجے کالج میں آئے۔

مولانا آزاد کی پہلی تقریر

مولانا آزاد نے سب سے پہلے تقریر کی اور اس میں طلبہ کو بتایا کہ آپ پرانی تہذیب کو دنیوی ترقی کیلئے رکاوٹ سمجھتے ہیں، لیکن مغربی تہذیب کے خطرات بھی آپ پر واضح رہنے چاہئے جو مذہب کیلئے تباہ کن ہیں، مسلمان مذہب کے بغیر ترقی نہیں کرسکتے۔ مسلمانوں کیلئے راہ اعتدال ایک ہی ہے اور وہ ہے خدا کے کلام اور رسول اللہؐ کے احکام کی پیروی اور پابندی، مسلمانوں کو قرآن مجید کے مطالعے پر زیادہ توجہ کرنی چاہئے جو ہر حال اور ہر زمانے میں انکا رہنما ہے۔ یہی ان کیلئے فلاح وکامیابی کا وسیلہ ہے۔تاریخ کی شاہراہ پر ماضی کے نقوش انمٹ اور انمول ہوتے ہیں، ایسی فقیدالمثال ہستیوں کو ہمیشہ حلق احساس میں زندہ رکھنا چاہئے۔ چونکہ اہل علم کے تعاون سے ہی مہذب معاشرہ وجود میں آتا ہے جن سے علم وفکر کے چراغ جلتے ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کی روشنی کو پھیلتے رہنا چاہئے۔اسکی خوشبو کی ہمیشہ مہکتے رہنا چاہئے۔علم خدا کا نور ہے اگر وہ تقسیم نہیں ہوتا تو خیانت ہے۔مولانا کا علم قرآنی تعلیمات پر محیط تھا۔ وہ علم وعمل کا پیکر تھے۔ ان کے علمی کارناموں سے روشناس ہونا معاشرے کے ہر فرد کیلئے مشعل راہ ہے۔ ورنہ ایسی ناقابل فراموش ہستیاں اوراق گم گشتہ میں ناپید ہوکر رہ جاتی ہیں۔امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار بھی ایمان افروز شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ان کی خداداد صلاحیت اور قابلیت کو متعین کرنا گویا سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ ☆☆☆

مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ [۱۸]

چمنستانِ قاسمی کے گل سرسید، علمائے دین کی عظیم وطنی، قومی اور ملی اقدار و روایات کے امین، امام العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری ؒ کے شاگرد رشید، عالم، فقیہ، مفکر، دانشور اور تحریک آزادی کے مقتدر رہنما مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ؒ کو 'مجاہد ملت' کے محترم لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ اس معزز لقب کے پوری طرح حقدار تھے۔ ملک وملت کی فلاح اور وقار کے لئے آپ کی زندگی واقعی جہد مسلسل کی تصویر تھی جیسا کہ وحدیت عصر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ؒ فرماتے ہیں:

''ہمارے ملک میں قومی وملی تحریکات کے شروع ہونے، سیاسی وملی شعور کے بیدار ہونے، جماعت سازی اور خطابت وصحافت کے اس دور میں (جو تحریکِ خلافت اور جنگ آزادی کے بعد بڑے پیمانے پر شروع ہوا) اعزاز واکرام اور تعریف وتوصیف کے خطابات والقاب دینے کا عام رواج ہوگیا اور بعض مرتبہ اس میں ایسی فیاضی، غلو اور مبالغہ اور عجلت وجذباتیت سے کام لیا گیا کہ بعض حقیقت پسندوں کی زبان پر یہ مصرعہ آ گیا 'اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی' لیکن ہر کلیہ میں استثناء ہوتا ہے۔ اس کلیہ میں بھی کئی استثنا ئات ہیں جن میں اس وقت وہ توصیفی القاب کا

۱۸ فاروق ارگلی کے مضمون سے اقتباسات لئے گئے، ۲۵ رمئی ۲۰۱۱ء سہارا

استثناء کروں گا ایک مولانا محمد علی جوہرؔ کے لئے 'رئیس الاحرار' کے خطاب کا، دوسرے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی h مرحوم کے لئے 'مجاہد ملت' کے لقب کا۔ مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی ؒ مرحوم صرف ہندوستان کی ملت اسلامیہ ہی کے تعلق سے 'مجاہد ملت' کہلانے کے مستحق نہ تھے بلکہ وہ ہندوستان کی آزادی کے لئے جدوجہد، انگریزی حکومت واقتدار کے مقابلہ میں صف آرائی، ہندو مسلم اتحاد اور ایک آزاد منصفانہ جمہوری ودستوری نظام کے لئے ایثار وقربانی اور قید وبند کی آزمائشیں برداشت کرنے والے قائد کی حیثیت سے بھی ایک صاحب عزیمت وصاحب شجاعت مجاہد کے لقب کے مستحق تھے''۔ (پرانے چراغ جلد سوم)

ملک کی تحریک آزادی

ملک کی تحریک آزادی کے آخری اور فیصلہ کن مرحلے میں مہاتما گاندھی، موتی لعل نہرو، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی ؒ، مفتی اعظم ہند مولانا کفایت اللہ ؒ، حکیم اجمل خان، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی، حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لعل نہرو جیسے اکابر رہنماؤں کی قومی جدوجہد میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ؒ کی ذات گرامی بھی نمایاں طور پر شامل ہے۔ زمانۂ طالب علمی سے ہی بزرگان دارالعلوم دیوبند کے جذبۂ حریت سے آراستہ مولانا حفظ الرحمٰن کی ولادت ۱۰ جنوری ۱۹۰۱ء کو ضلع بجنور (یوپی) کے تاریخی قصبہ سیوہارہ کے ایک معروف دینی خانوادے میں ہوئی۔ ان کے والد مولوی شمس الدین قصبہ کے معزز زمیندار اور دیندار شخصیت تھے۔ ان کا اصل نام معزالدین تھا لیکن وہ اپنے تاریخی نام حفظ الرحمٰن سے مشہور ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد صاحب سے ہی حاصل کی۔ سیوہارہ میں ہی انہوں نے عربی، فارسی، اردو اور درس نظامی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اگرچہ آپ

کے خاندان میں جدید انگریزی تعلیم کا عام طور پر رواج تھا آپ کے بڑے بھائی فخر الدین اور بدرالدین علی گڑھ میں پڑھتے تھے۔ خالہ زاد بھائی ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے ولایت میں تعلیم حاصل کی تھی لیکن مولانا شمس الدین صاحب نے بچے کا رجحان دینی تعلیم کی طرف دیکھ کر اسی راہ پر آگے بڑھاتے ہوئے انہیں مدرسہ شاہی مراد آباد میں داخل کرایا۔ کچھ برسوں کے بعد سیوہارہ کے مدرسہ فیض عام میں درس نظامی مکمل کیا پھر مزید دینی تعلیم کے لئے دارلعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور امام العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث اور فقہ کی غیر معمولی دولت علم و عرفان حاصل کر کے باقاعدہ عالم دین بن گئے۔

مولانا سیوہاروی کی خدمتِ خلق

یہ مولانا حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ طالب علمی کا واقعہ ہے جب وہ حضرت سترہ سال کے تھے۔ ایک دن سہسپور اسٹیشن کے قریب ایکسپریس ٹرین حادثے کا شکار ہوگئی۔ یہ خبر سیوہارہ پہنچی تو وہ پیدل ہی سہسپور کی طرف دوڑ پڑے اور جائے حادثہ پر پہنچ گئے۔ حادثہ اتنا خوفناک تھا کہ وہ رو پڑے۔ پھر زخمیوں کو اٹھا کر ہسپتال پہنچانے کے کام میں لگ گئے۔ ٹرین کے ملبے کے نیچے سے لوگوں کی دلخراش چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ دوسروں کے ساتھ زخمیوں کو ملبے میں دبے ہوئے مسافروں کو نکالنے میں جی جان سے مصروف رہے۔ ان کے چہرے پر خوف کی جگہ ایک عزم تھا۔ وہ بھوکے پیاسے کام کرتے رہے۔ گاؤں کے ایک بزرگ نے اس لڑکے کو انتھک کام کرتے دیکھا اور معلوم کیا کہ وہ لڑکا کون ہے تو کسی نے بتایا کہ یہ لڑکا سیوہارہ کے شمس الدین کا بیٹا معزالدین ہے۔ انسانی ہمدردی کے اس جوش اور جذبے میں وہ خود زخمی ہوگئے تھے۔ بعد میں ان کا علاج ہوتا رہا ہے۔ (ضلع بجنور کے جواہر)

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کی اوائل عمری کا ایک اور واقعہ انکی شخصیت کے غیر معمولی انسانی پہلو کو اجاگر کرتا ہے جب قصبے میں ایک کوڑھی کی موت واقع ہوگئی۔ لوگ اسکی لاش کے قریب جانے کو بھی تیار نہ تھے۔ کوئی اسے نہلانے کو راضی نہ تھا۔ حفظ الرحمٰن کو معلوم ہوا تو وہاں پہنچے اور بغیر کسی کراہت اور خوف کے انہوں نے اس جذامی کی لاش کو اٹھایا، غسل دیا اور کفن پہنایا اور اپنے ہاتھوں سے اسے دفن کیا۔ اپنے عظیم المرتبت بزرگوں کے حکم پر آپ نے درس و تدریس کا شغل اختیار کیا۔ آپ کچھ دنوں تک دارالعلوم دیوبند اور جامعہ اسلامیہ امروہہ میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۲۸ء میں ڈابھیل گجرات کے جامعہ اسلامیہ میں مدرس ہوگئے۔ اس وقت آپ کی عمر صرف اکیس (۲۱) سال کی تھی۔ ملک میں جنگ آزادی شباب پر تھی۔ گاندھی جی کی قیادت میں ستیہ گرہ کی تحریک جاری تھی۔ انکے دل میں بھی تحریک آزادی میں حصہ لینے کی شدید آرزو مچل رہی تھی۔ انکے ذہن پر اپنے وطن سیوہارہ کے سیاسی ماحول کا بھی اثر تھا۔ ۱۹۱۸ء میں انہوں نے سیوہارہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی، خلافت کمیٹی اور مجلس احرار الاسلام کے ہفت روزہ اجلاس کو دیکھا تھا جس میں مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، علی برادران، پنڈت جواہر لعل نہرو، سوامی دیانند سرسوتی اور بہت سے مقامی لیڈروں کے علاوہ سیوہارہ کے نامور مجاہدِ آزادی حکیم مظاہر حسین سیوہاروی پیش پیش رہے تھے۔ نوجوان عالم دین مولانا حفظ الرحمٰن اسی تاریخ ساز اجلاس میں آزادئ وطن کیلئے ذہنی طور پر تیار ہو چکے تھے:

شیخ الہند کی مالٹا سے رہائی

یہ وہی زمانہ تھا جب وہ اپنے عہد کے نامور مجاہدین آزادی کے اس کارواں میں شامل ہوگئے جس میں مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ، علامہ انور شاہ کشمیری

رحمۃ اللہ علیہ، مولانا شبیر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ، مفتی عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا نور الدین بہاری رحمۃ اللہ علیہ، اور مولانا عبد الحنان ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ جیسے جاں نثارانِ ملک ملت قومی تحریک آزادی کے پرخطر راہ پر تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ مالٹا کی قید سے رہا ہوکر ہندوستان آچکے تھے۔ دیوبند قومی آزادی کی ملک میں سب سے بڑی درسگاہ تھی۔ اسی زمانہ میں حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا مفتی عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند سے علاحدہ ہوگئے۔ انہوں نے ضلع سورت کے ڈابھیل نامی مقام پر جامعہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔ حضرت مولانا محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اگرچہ یہ تفریق دارالعلوم دیوبند کے لئے عارضی طور پر مضر ثابت ہوئی مگر احاطۂ گجرات جیسے علم سے خالی علاقہ میں ایک بہت بڑے مدرسے کی بنیاد پڑ گئی جو ایک برکت تھی۔

نوجوانی میں شعلہ بیاں مقرر

غیر معمولی ذہانت اور پرجوش جذبۂ آزادی نے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ کو نوجوانی کے دنوں میں ہی شعلہ بیاں مقرر بنادیا تھا۔ حضرت مولانا احمد سعید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے ساتھ وہ جمیعۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے تحریکِ آزادی کے اکابر رہنماؤں کی صف میں شامل ہوگئے۔ وہ علمائے دیوبند کے متحدہ قومیت کے نظریے کے زبردست مبلغ تھے۔ گاندھی جی اور مولانا آزاد سے وہ بیحد متاثر ہوئے تھے۔ وہ اس نظریے میں مکمل یقین رکھتے تھے کہ ہندوستان بلاتفریق مذہب وملت تمام ہندوستانیوں کے اتحاد کی قوت سے ہی برطانوی استعمار سے آزاد ہوسکتا ہے۔ ملک کی تقسیم اور مسلمانوں کی علاحدگی پسندی خود ملت اسلامیہ کے لئے

انتہائی مہلک ثابت ہوگی۔ مسلمان اپنے دوسرے برادران وطن اور مشترکہ تہذیب کے دائرے میں رہ کر ہی اپنا صحیح حق حاصل کرسکتے ہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن شروع سے جمیعۃ العلماء ہند کے سرگرم کارکن ہوگئے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں ڈابھیل سے واپس آئے اسی زمانہ میں جمیعۃ کے امروہہ اجلاس میں مولانا کی تجویز منظور کی گئی کہ جمیعۃ علماء کو باقاعدہ طور پر کانگریس سے وابستہ کردیا جائے۔ تحریک آزادی ہند کی تاریخ کا یہ اہم واقعہ ہے جس کے گہرے اثرات مستقبل کے سیکولر جمہوری ہندوستان پر مرتب ہوئے۔

تادم آخر ممبر پارلیمنٹ

''سب جانتے ہیں کہ مولانا مرحوم آزادی کے بعد بننے والی پہلی پارلیمنٹ کے ممبر بنے پھر تادم آخر ممبر رہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا آخری الیکشن ۱۹۶۲ء میں ہوا۔ مولانا اپنی شدید علالت (جو مرض وفات ثابت ہوئی) میں مبتلا رہنے کی وجہ سے ایک دن بھی الیکشن کا کام نہیں کرسکے۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ الیکشن میں ۱۷ ہزار ووٹوں سے کامیاب ہوئے۔ یہ کامیابی ایک طرف تو مولانا سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ کی غیر معمولی مقبولیت اور اخلاص کے ساتھ ان کی قومی خدمات کا ثبوت ہے تو دوسری طرف قوم کی بیداری مغزی اور محسن شناسی کی علامت بھی ہے۔ (مولانا کا حلقۂ انتخاب سنبھل تھا) اتنی طویل مدت تک پارلیمنٹ کے ممبر رہنے اور بلا شرکت غیرے مدتوں تک مسلمانوں کے عظیم رہنما ہونے کے باوجود مولانا اپنا ذاتی مکان دہلی میں نہیں بنا سکے اور پرانی دہلی کے محلّہ بلیماران میں جہاں اس وقت جمیعۃ علماء ہند کا صدر دفتر تھا اسی کے قریب ایک متوسط درجہ کے کرائے کے مکان میں رہتے تھے جو کسٹوڈین کی تحویل یا ملکیت میں تھا۔ آزادی کے بعد ہندوستان سے پاکستان

منتقل ہوجانے والے مسلمانوں کی جائیداد پر قبضہ اور نگرانی کے لئے ایک مستقل محکمہ 'کسٹوڈین' کے نام سے مدتوں تک قائم رہا۔ جس کی چیرہ دستیوں نے مسلمانوں کو عاجز و درماندہ کر رکھا تھا۔ پھر ان مکانات کو نیلام کیا گیا اور ان کی خریداری کا اولین حقدار ان کے ساکنوں کو قرار دیا گیا۔ مولانا کے مرض وفات میں اس مکان کی نیلامی کا نوٹس آیا۔ اتفاق سے جس وقت مولانا کو اس نوٹس کی اطلاع ان کے معتمد حاجی حسام الدین صاحب نے دی اس وقت راقم الحروف مولانا کے پاس حاضر تھا۔ مولانا نے یہ اطلاع پاکر جس تاثر بھرے بلکہ درد بھرے لہجے میں اظہار خیال کیا اسے راقم بھول نہیں سکتا۔ فرمایا: ''ہمارے پاس تو اتنے پیسے نہیں کہ یہ مکان خرید سکیں اور ہمارے سیوہارہ کے آبائی مکانات توڈھہ کر ختم ہوگئے۔

یہ تھا مولانا کا زاہدانہ کردار کہ ان کی وجہ سے لاکھوں مسلمان مالا مال اور صاحب جائیداد ہوگئے مگر وہ خود اس لائق بھی نہ ہوسکے کہ سر چھپانے کیلئے معمولی سا ذاتی مکان بھی بنا سکتے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مولانا کی وفات کے بعد کچھ صاحب ثروت دوستوں نے بلکہ ممنون احسان افراد نے نیلامی میں اس مکان کو کسٹوڈین سے خرید کر ان کے اکلوتے صاحبزادے محمد اسلم (لطف الرحمٰن) کو دے دیا تھا''۔

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ کے بے لوث زاہدانہ اور درویشانہ کردار اور موجودہ دور کے جمعیۃ علماء ہند کے ناظمین وصدور کی امارت، تمول اور دنیوی شان وشوکت میں زمین اور آسمان کا فرق ہے لیکن مسلمانان ہند کے بڑے اور بااثر طبقے کا اس ۹۱ سالہ تنظیم کے تئیں احترام یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ اکابرین کے اسی پرخلوص ملی جذبے کا دائمی اثر ہے جو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسے مجاہدین ملک وملت کے دلوں میں موجزن تھا۔

مجاہد ملت کی گرانقدر تصنیفات

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ملک وقوم کی خدمت کے لئے وقف تھی اور وہ پوری طرح ایک مصروف سیاسی شخصیت رہے لیکن وہ دین اسلام کی علمی خدمت کی جانب بھی بیدار اور سرگرم رہے۔ ان کی گرانقدر تصنیفات ''قصص القرآن''، 'اسلام کا اقتصادی نظام، اور 'اخلاق وفلسفۂ اخلاق' اسلامیات کے موضوع پر لافانی کتابیں ہیں۔ ''قصص القرآن'' انبیاء علیہم السلام کی سوانح حیات اور ان کی دعوت حق کی مستند تاریخ وتفسیر جو قرآن مجید کے گہرے مطالعے اور صحت قدیم اور جدید تحقیقات سے مرتب کی گئی ہو اس سے پہلے موجود نہیں تھی۔ عربی میں البتہ شیخ عبد الوہاب نجار کی 'قصص القرآن' موجود ہے مولانا نے اردو میں یہ کتاب تصنیف فرما کر ایک بڑی ضرورت کی تکمیل کی اور اسلامیات وعلوم قرآن کے طلبہ کے لئے ایک قیمتی ذخیرہ مہیا کردیا۔ یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں ہے۔

چوتھی جلد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات وحالات پر مشتمل ہے'' ان کے علاوہ آپ کی تصانیف میں حفظ الرحمٰن لمذہب النعمان، البلاغ المبین فی مکاتیب سید المرسلین، انور البصر فی سیرت خیر البشر، متحدہ قومیت اور مالا بار میں اسلام وغیرہ بھی آپ کی غیر معمولی علمی لیاقت بصیرت اور عبقریت کا روشن ثبوت ہیں۔ اسلامی علوم کے فروغ کی جانب مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی خصوصی توجہ رہی۔ آپ نے اپنے عہد کے عظیم اسلامی اشاعتی ادارے 'ندوۃ المصنفین' کے قیام میں بانی ادارہ حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بنیادی کردار ادا کیا۔ ندوۃ المصنفین نے ادبیات اسلامی کے میدان میں جو اشاعتی کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ ناقابل فراموش ہیں۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ

اور حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ یادگار ہمیشہ قائم رہتی اگر مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نااہل ورثاء نے اسے برباد نہ کر دیا ہوتا۔

اخبار الجمعیۃ بہترین روزنامہ

جمعیۃ علماء ہند کے ناظم عمومی کی حیثیت سے آپ نے اخبار الجمعیۃ کو ملک کا بہترین روزنامہ بنادیا الجمعیۃ پریس، لائبریری اور اشاعت کتب کا شاندار ادارہ قائم کیا۔ آپ ہی کی کوشش سے ہندوستانی مسلمانوں کا پہلا انگریزی اخبار مسیج ویکلی ۱۹۵۱ء میں شائع ہونا شروع ہوا تھا جس کے ایڈیٹر سید اوصاف علی تھے۔ مجاہد ملت کی ان مساعی جمیلہ کا اعتراف شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی محبت سے کیا ہے۔

بحیثیت ایک مقتدر کانگریسی رہنما وہ عوام وخواص میں محبوب ومحترم رہے۔ انکی سیکولر اور فراخ دل شخصیت ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں مقبول رہی۔ انہوں نے بلاتفریق مذہب وملت بندگان خدا کی خدمت انجام دی۔ نئے بھارت کی تعمیر میں وہ پنڈت جواہر لعل نہرو کے ترقی پسند عزائم اور مساعی کے حامی اور مددگار رہے۔ انہوں نے ساری زندگی دوقومی نظریہ کی مخالفت کی اور بڑی جرأت وپامردی کے ساتھ ہندو فرقہ پرستی اور مسلم فرقہ پرستی کے خلاف جہاد کیا جس نے ملک کے دوٹکڑے دیئے۔ فرقہ پرستی اور عصبیت کے خلاف مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ کی جدوجہد کے حوالے سے نامور تاریخ داں، صحافی اور دانشور مفتی شوکت علی فہمی لکھتے ہیں: ''تقسیم کے بعد ایک ایسا وقت آیا جب ہندو فرقہ پرستی نے ملک کے امن وامان کو غارت کر دیا۔ ملک میں جابجا یکطرفہ فسادات کا دور شروع ہوا اور ملک کا کوئی حصہ باقی نہ رہا جہاں ہندو فرقہ پرستی نے سر نہ اٹھایا ہو۔ مولانا کے لئے یہ نازک ترین وقت تھا، وہ تن تنہا ملک

کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک دوڑتے پھرتے تھے۔ ملک میں جہاں بھی یکطرفہ ہنگامہ ہوتا تھا ایک جانباز سپاہی کی طرح اس کی آگ میں کود پڑتے تھے اور اس وقت تک انہیں چین نہیں آتا تھا جب تک فرقہ پرستی اور باہمی منافرت کی آگ کو اپنے سامنے بجھا نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ یہی فیروز آباد میں ہوا اور یہی بھوپال میں ہوا اور اس کے بعد جبل پور میں فسادات کی آگ بڑھکی تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہی اسے بجھایا تھا۔ یہ آگ جبل پور سے نکل کر مدھیہ پردیش کے دوسرے علاقوں تک پھیل چکی تھی۔ ۱۹۶۱ء میں جب علی گڑھ، چندوسی اور میرٹھ میں فسادات کی آگ بھڑکی اس وقت مولانا کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو چکے تھے۔ رفتہ رفتہ آپ کی صحت جواب دیتی جارہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود مولانا کے جوش عمل میں کوئی فرقہ نہیں آیا۔ وہ جان کی بازی لگا کر علی گڑھ گئے، اس کے بعد چندوسی گئے پھر میرٹھ میں رہے جب تک وہاں فسادات کی آگ بالکل نہ بجھ گئی''۔

مجاہد ملت کا تقویٰ

مجاہد ملت کی شخصیت حقیقی معنوں میں دور ساز تھی۔ مزاج میں درویشانہ سادگی تھی اپنی مصروف ترین زندگی کا خاصا حصہ وہ عام لوگوں کے درد دور کرنے میں صرف کرتے تھے۔ متقی ایسے تھے کہ جمعیۃ علماء ہند کے ناظم کی حیثیت سے انہوں نے کبھی کوئی الاؤنس یا بھتہ قبول نہیں کیا۔ بڑے بڑے لوگ انہیں تحفوں اور نذرانہ سے خوش کرنے کے متمنی رہتے تھے لیکن آپ نے کسی کو موقع نہیں دیا۔ آپ اپنی کتابوں کی آمدنی سے گزر بسر کرتے تھے۔ کانگریس پارٹی کی طرف سے آپ نے تین پارلیمانی الیکشن لڑے لیکن پارٹی فنڈ سے ایک پیسہ بھی قبول نہیں کیا۔ پارلیمنٹ کانگریس پارٹی اور جمعیۃ علماء ہند کے بنیادی کاموں کے ساتھ ساتھ ملی اور سماجی خدمات کا سلسلہ

آزادی کے بعد سے زندگی کے آخری ایام تک جاری رہا۔انہوں نے کسٹوڈین کے محکمہ سے مسلمانوں کی ہزاروں جائدادیں واگزار کرائیں اوقاف، حج کمیٹی اور مسلم تعلیمی اداروں، بالخصوص مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بہتری کے لئے ان کی تاریخ ساز جدوجہد سے پورا ملک آگاہ ہے۔آپ نے سینکڑوں دینی مدرسوں کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔آپ دارالعلوم دیوبند کے جید عالم دین تھے لیکن انہوں نے دیوبندی، بریلوی ،شیعہ، اہل حدیث، بوہرا یا خوجہ کسی بھی مسلک ومشرب کی تفریق کبھی نہیں کی۔آپ اتحاد بین المسلمین کے سچے حامی تھے۔

انہوں نے سالہا سال شب وروز ملک وملت کی خدمت کی، انہوں نے کبھی اپنی صحت کی پرواہ نہیں کی۔انہیں پھیپھڑے کا کینسر تھا جس نے ۱۹۶۲ء کو ملک وقوم کا یہ عظیم مجاہد دنیائے فانی سے رخصت ہوگیا۔

☆☆☆

۱۹ مولانا محمد عثمان فارقلیط رحمۃ اللہ علیہ

مختلف مذاہب، عقائد، طبقات اور تہذیبوں کا مالک ہندوستان موجودہ عہد میں دنیا کا بہترین آزاد سیکولر جمہوریہ ہے۔کثرت میں وحدت اور ہمہ رنگی میں ایک رنگی اس کی عظمت ہے،لیکن یہ تلخ حقیقت بھی آج دنیا کے سامنے ہے کہ انگریز کی سازش اور تنگ نظر اکثریتی ذہنیت نے ہی دوقومی نظریہ دے کر عظیم ہندوستان سے ٹکڑے کرائے لیکن مسلم قوم کے نام پر بننے والا ہمارا پڑوسی ملک کہا ہے اور ہندوستان تعمیر وترقی کی کن بلندیوں کی جانب گامزن ہے۔اپنے وطن کو ایسا خوبصورت سیکولر جمہوری ملک بنانے میں بھی اکثریتی رہنماؤں کے ساتھ سب سے اہم اور بنیادی کردار قوم پرست ولی اللّٰہی تحریک آزادی کے امین علمائے دیوبند کا بھی ہے۔حضرت مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ سے لے کر حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ اور سبحان الہند مولانا احمد سعیدؒ وغیرہ اکابر رہنماؤں کی قربانیاں آفتاب کی طرح مطلع تاریخ پر درخشندہ ہیں۔مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا حسرت موہانیؒ، مولانا محمد علی جوہر، ظفر علی خاں جیسے عظیم المرتبت رہنماؤں کی قابل فخر تاریخ ہمارے سامنے

۱۹ فاروق ارگلی کے مضمون سے اقتباسات لئے گئے۔راشٹریہ سہارا،6/مارچ2012

ہے۔جنہوں نے دوقومی نظریے کورد کرتے ہوئے تقسیم کی مخالفت میں آواز بلند کی، جس کے نتیجے میں آج بھی مسلمان اپنے وطن میں بہت سی ناانصافیوں اوراستحصال کے باوجود ملک کی دوسری اکثریت کی شکل میں برابری کے احساس اورعزت ووقار کے ساتھ ہم وطنوں کے قدم سے قدم ملا کرتعمیر وترقی کے راستے پر سے محبت کے نظریے کوقوت بخشنے کا سبب سے بڑا کارنامہ علمائے عظام کے ساتھ ساتھ ہمارے قابل فخر صحافی رہنماؤں نے انجام دیا ہے۔

آزادی کی جنگ میں قوم پرستی کے نظریے کے ساتھ عوام کو بیدار کرنے میں لاتعداد صحافیوں اور متعدد اخبارات وجرائد نے برصغیر کے گوشے گوشے میں انقلاب کی صدائیں بلند کیں، لیکن قومی سطح پر جس اخبار کی خدمات آزادی سے پہلے اورآزادی کے بعد سے اب تک مسلم قوم کی زندگی اورمزاج کا حصہ بیں وہ ہے جمعیۃ علماء ہندکا ترجمان 'الجمعیۃ' جوتحریک آزادی میں وطن پرست مسلمانوں کا سب سے بڑا آرگن تھا۔ اسی اخبار کے ذریعہ عہد ساز اسلامی دانشور سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی آواز مشرق سے مغرب تک گونجی، اسی عہد آفریں اخبار نے ہندوستانی ملت اسلام اوراردو زبان کوایک ایسا مایۂ ناز صحافی، مفکر، ادیب اور ذہن ساز رہنما دیا جس کی مثال اردو کی پوری صحافتی تاریخ میں کچھ پیشواؤں کو چھوڑ کر مشکل سے ملے گی۔اس عظیم المرتبت شخصیت کا نام نامی ہے مولانا محمد عثمان فارقلیط، جنہوں نے 25 برس تک روزنامہ اخبار 'الجمعیۃ' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اردو صحافت کی تاریخ میں اپنی علمی عبقریت، فکری صلاحیت، تحریر کی جادواثری اورملی جذبے کی شدت کے ایسے نقوش لوحِ زمانہ پر مرتسم کئے جنہیں کبھی مٹایا نہیں جاسکے گا۔

یہ بھی المناک حقیقت ہے

لیکن یہ بھی ایک المناک حقیقت ہے کہ اس ولی صفت مفکر صحافی کے دنیا سے رخصت ہوجانے کے بعد اس لئے اتنی بڑی شخصیت اور کے عدیم المثال کارنامے طاق نسیاں کی نذر ہوگئے کہ انہوں نے فقیری اوردرویشی کے انداز میں ملک وقوم کے لئے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ صرف کردیا لیکن ذاتی تشہیر کے سامان اور مادی وسائل جمع نہیں کئے۔ملت کی دن رات خدمت کرتے رہے مگراپنی اولاد کوبھی اس قابل نہ بناسکے کہ وہ ان کا کام زمانے میں زندہ رکھنے کے لئے وہی طریقے اختیار کرتی جواس دنیا کا رواج ہے۔خدا کا شکر ہے کہ جمعیۃ علماء ہند قائم دوائم ہے، اخبار 'الجمعیۃ' بھی ہفت روزہ سہی، زندہ سلامت ہے۔مولانا نے جس نظریے کی تبلیغ وترویج میں سرمایہ حیات لٹادیا، اس کے وارث بھی تمام تر ملی، قومی، دنیوی، مادی ترقیوں کے ساتھ موجود ہیں، لیکن وہ مولانا کو یاد کرنا ہی شاید بھول گئے۔

مولانا فارقلیط کی خدمات

مولانا کو دنیا سے گئے 40 برس ہونے کو آتے ہیں، اس دوران کہیں کہیں کسی باضمیر اردو والے نے چھوٹا موٹا مضمون وغیرہ لکھ کر اپنی زبان، تہذیب اور مذہبی اقدار کے محسن کو یاد کرلیا جس کی کسی کو خبر لگی، کو کسی نہ لگی، جبکہ یہ کار منصبی شاندار علمی تنظیم جمعیۃ علماء ہند کوانجام دینا چاہئے تھا جس سے اس عظیم صحافی اور قلمکار کواس کی شایان شان دنیا یاد کرسکتی اوراس سے نئی نسلوں کوترغیب ملتی۔ہاں مولانا کے ایک عم زاد برادر مولانا سلیمان صابر مرحوم اپنے محدود ترین وسائل کے ساتھ کچھ کرتے رہے، انکی تحریروں کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا تھا، مولانا سلیمان صابر جمعیۃ اہل حدیث ہند کے جریدہ

ترجمان کے ایڈیٹر تھے۔اس کتاب کے بارے میں مرحوم کے سابقہ دفتر میں پوچھنے پر بتایا گیا کہ شاید ایسی کوئی کتاب چھپی تو تھی مگر کسی نے دیکھی نہیں لیکن عظمتیں کبھی معدوم نہیں ہوتیں۔پچھلے سال فعال تنظیم یونائیٹڈ مسلم کے نوجوان صحافیوں نے مولانا فارقلیط کی حیات اور کارناموں پر مختصر لیکن وقیع تاثراتی مضامین پر مشتمل جریدہ شائع کر کے ایک بڑے کام کا آغاز کر دیا۔تنظیم سے وابستہ پرجوش اور باصلاحیت ادیب وصحافی جناب سہیل انجم ایک مبسوط کتاب مولانا کی زندگی اور خدمات کے موضوع پر شائع کرنے والے ہیں اللہ ان کے عزائم میں برکت عطا فرمائے۔لیکن یہ کام ایک آدھ کتاب سے پورا نہیں ہوسکتا۔مولانا محمد عثمان فارقلیط ہماری صحافت، ادب اور ملی تاریخ کا اتنا بڑا نام ہے کہ جس پر قومی سطح پر تحقیق واشاعت کی ضرورت ہے۔مولانا محمد عثمان فارقلیط کی شخصیت کے بارے میں نامور ودانشور پروفیسر اختر الواسع نے بالکل درست فرمایا ہے کہ:''لوگ پیدا ہوتے ہیں، زندہ رہتے ہیں اور مرجاتے ہیں، ان کی موت پر ان کے اعزا آنسو بہاتے ہیں، احباب کفِ افسوس ملتے ہیں، لیکن کچھ دن بعد یہ لوگ بھی بھول جاتے ہیں کہ کون کب پیدا ہوا کب تک جیا اور کب مرگیا۔ اس کے برعکس کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ لوگوں کیلئے قابل رشک اور قابل تقلید مثال کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں، ایسی فکر وعمل کے حوالے سے انہی کے لئے کہا گیا ہے:

جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی جسم مرجانے سے انسان نہیں مرجاتے

مولانا کی صحافتی عظمت

مولانا عثمان فارقلیط ایسی ہی نابغہ روزگار شخصیات میں سے تھے۔ایک ایسا صحافی جس نے قلم کی حرمت پر کبھی آنچ نہیں آنے دی، جس نے حق پسندی کی خاطر

باطل سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا، جس نے جرأت وبے خوفی کو اپنے لئے ایمان وایقان کا حصہ بنائے رکھا''۔(قلم کی حرمت کے امات دار،مضمون)

مولانا فارقلیط کی صحافتی عظمت کے بارے میں اسی دور کے عظیم ملی صحافی ودانشور مولانا عبد الماجد دریا آبادی کی رائے ہے:''موصوف (مولانا فارقلیط صاحب) کی مدح وتحسین میں کچھ کہنا یا انکے دور ادارت پر تبصرہ کرنا اپنی ہی صحت بصارت وبصیرت کا اعلان کرنا ہے۔: مدح خورشید خود است۔جہاں تک لکھنے کا تعلق ہے مسلمان صحافیوں میں اور لوگ بھی خاص لکھ لیتے ہیں، لیکن جب سوال خیالات وعقائد کی پختگی کا آئے گا اور سلجھے اور طرز تحریر اور عقل وجذبات کے امتزاج اور رائے کی اصابت کا، اور مسلک میں توازن وتسلسل کا اور پختہ سوجھ بوجھ کا تو کوئی ایسا نہیں نکلے گا جسے موصوف کی مسند پر بٹھایا جاسکے یا ان کا ہم پلہ قرار دیا جاسکے''۔

مذکورہ بالا تاثرات مولانا دریا آبادی نے مارچ 1973ء میں اپنے اخبار 'صدق جدید' میں ایک تبصرہ کے تحت تحریر فرمائے تھے جب بوجہ پیرانہ سالی مولانا فارقلیط 'الجمعیۃ' کی ایڈیٹرشپ سے ریٹائر ہوئے تھے۔

مولانا فارقلیط کا گھرانہ

مولانا محمد عثمان فارقلیط قصبہ پلکھوا (اب ضلع غازی آباد) کے ایک معزز اور دین دار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ان کے دادا مولانا نصر اللہ فارسی کے ماہر اور جید عالم تھے۔وہ بہترین خطیب تھے، جامع مسجد پلکھوا میں ان کا خطبہ سننے کے لئے لوگ جوق در جوق جمع ہوتے تھے۔ان کی تقریر اس قدر موثر ہوتی تھی کہ سامعین کے دلوں میں نقش ہوجاتی تھی۔ان کی وجہ سے پلکھوا میں مسلم معاشرہ میں رائج بہت سی غیر شرعی رسوم کا خاتمہ ہوا۔مولانا نصر اللہ بیحد متقی اور پرہیزگار انسان تھے۔زندگی

گزارنے کے لئے وہ بندقوں کی مرمت کا کام کیا کرتے تھے۔جس سے ان کے گھر کے اخراجات پورے ہوتے تھے۔1857ء میں جب انگریزوں نے دہلی پر حملہ کیا ان دنوں مولانا نصراللہ دہلی میں تھے۔جنگ میں مجاہدین آزادی کی شکست کے بعد جب گرفتاریوں اور پھانسیوں کا باز مولانا نصراللہ پر الزام لگا کہ وہ بہادر شاہ کے فوجیوں کو بندوقیں سپلائی کرتے تھے۔مولانا جان بچانے کے لئے روپوش ہوگئے اور تبھی اپنے وطن پلکھوا پہنچے جب امن وامان قائم ہوگیا۔مولانا فارقلیط کے والد محمد احمد صاحب پڑھے لکھے انسان تھے اور اپنے والد کی طرح اردو فارسی میں مہارت رکھتے تھے، وہ ٹھیکیدار کا کام کرتے تھے۔انہوں نے کشمیری گیٹ کے علاقہ میں مکان خرید کر دہلی میں رہائش اختیار کی لیکن پلکھوا کی آمد ورفت بھی برقرار رہی۔ بعد میں انہوں نے چاندنی چوک کے مشہور محلّہ کوچہ استاد داغ میں سکونت قائم کرلی۔

یہیں ماہ مئی 1897ء میں مولانا فارقلیط پیدا ہوئے۔ جب تعلیم کا وقت آیا تو ابتدائی تعلیم اردو، عربی اور دینیات نئی سرزک میں واقع مدرسہ حاجی علی جان میں حاصل کی، اس کے بعد مولانا امداد صابریؒ کے مطابق ''دہلی کے کوچہ قابل عطار میں مولانا ایوب ایک مشہور منطقی رہتے تھے۔ جو ہندوستان کے مشہور منطقی مولانا اسحاق رامپور کے شاگرد تھے اور خود بھی منطق اور حکمت میں انہوں نے کمال پیدا کیا تھا۔ عام طور سے منطقیوں کا دماغ مذہب کے خلاف جایا کرتا ہے لیکن مولانا ایوب منطق سے اسلام کی حقانیت ثابت کرتے تھے۔علمی ودقیق مضامین ایسے عام فہم زبان میں بیان کرتے تھے کہ جن کو پڑھے لکھے مسلمان اور اسلام سے ناواقف غیر مسلم بھی سمجھ لیتے تھے۔مولانا ایوب عقل وعرفان کے سمندر کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے جہاں بڑے بڑے داعیان عقل نہیں پہنچ سکتے تھے۔ بقول مولانا فارقلیط مولانا ایوب ان کے بچپن کے دوست تھے۔انہوں نے تعلیم کا شوق دلایا اور انہیں منطق کی کئی کتابیں

پڑھائیں۔مولانا نے علم معانی کی تعلیم مسجد فتح پوری کے ایک افغانی عالم مولانا سلطان صاحب سے حاصل کی۔انہوں نے مدرسہ حاجی علی جان کے مشہور محدث وعالم مولانا عبدالرحمٰن سے دینی کتابوں کا سبق لیا، اور اس سلسلہ کے شیخ الحدیث مولانا احمداللہ صاحب کے ترمذی شریف کے درس میں شریک ہوئے۔ان کے گھر کا ماحول علمی تھا، وہ نہایت ذہین طالب علم تھے، انہوں نے چھوٹی سی عمر میں عربی، اردو اور فارسی میں عالمانہ مہارت حاصل کرلی۔1922ء میں وہ تعلیم سے فارغ ہوئے۔

اسلامی حقانیت اور صداقت کا اثر

یہ اسلام کی حقانیت اور صادقت کا اثر تھا کہ ایسے مناظروں میں فتح مسلمانوں کو ہی حاصل ہوتی تھی۔ دہلی کے مناظروں میں سبحان الہند مولانا احمد سعید بہت سرگرم تھے، اپنی غیر معمولی ذہانت اور ذہنی بصیرت سے انہوں نے کفار کا ناطقہ بند کردیا تھا۔اس ہنگامہ خیز دور میں جب عیسائی اور آریہ سماجی اسلام پر بری طرح حملہ آور تھے مولانا احمد سعید صاحب نے 1920ء میں مناظرین اسلام کی باقاعدہ ایک تنظیم بنائی تھی جس کا نام ''انجمن اصلاح المومنین'' تھا۔اس تنظیم کا مقصد تھا مسلم علماء کو فن تقریر وخطابت اور دشمنان اسلام کے ساتھ مناظرہ کرنے کی تربیت دے کر دین کے تحفظ کے لئے تیار کرنا۔1922ء میں مولانا محمد عثمان فارقلیط اس تنظیم میں شامل ہوگئے اور بہت جلد ان کی غیر معمولی ذہانت، علمیت اور نکتہ آفرینی کی بدولت صف اول کے مناظرین میں ان کا شمار ہونے لگا۔عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کی دیکھا دیکھی قادیانی بھی انگریز حکومت کی سازش سے مسلمانوں کے خلاف میدان میں کود پڑے۔نوجوان مجاہد اسلام مولانا محمد عثمان فارقلیط نے عیسائی پادریوں، آریہ سماجی مہاشیوں کے ساتھ ساتھ قادیانی بے دینوں کو بھی مناظروں میں دھول چٹادی۔

مولانا کے مناظروں کی پوری روداد اگر جمع کی جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ عیسائی مشنریوں کی اسلام کے خلاف نفرت انگیز سازشوں کی تاریخ ''فرنگیوں کا جال'' میں اس کے مصنف مولانا امداد صابری نے ان مناظروں کا اجمالاً ذکر کیا ہے۔ مولانا کی یہ عظیم تالیف عرصہ سے نایاب تھی جسے راقم الحروف نے از سرنو مرتب کر کے شائع کرادیا ہے۔ مولانا محمد عثمان کے نام کے ساتھ فارقلیط کا لاحقہ عیسائی پادریوں سے مناظروں کے زمانے میں لگا۔ مولانا نے اس ضمن میں خود لکھا ہے:

پادریوں سے مناظرے

''1925ء میں پادری احمد مسیح سے میرے متعدد مناظرے ہوئے۔ یہ مناظرے بکرست ہال سرکی والان میں ہوا کرتے تھے، ایک بار ان سے لفظ فارقلیط پر مناظرہ ہوا، یہ مناظرہ ہر جمعہ کو تین بار چلتا رہا۔ راقم نے پادری لیفرائے کی ایک کتاب سے استدلال کر کے بتایا کہ اس لفظ کے مصداق حضرت محمد ﷺ ہیں۔ تین بار مناظرہ کے بعد لوگوں نے مجھے فارقلیط کہنا شروع کر دیا۔ ان کے کہنے سے مجھے بھی یہ نام بہت پسند آیا، جوانی کا عالم تھا، راقم خود اپنی شہرت چاہتا تھا اس لئے میں نے بھی اپنے نام کے ساتھ فارقلیط لکھنا مناسب سمجھا۔

بعد میں مجھے اسے ترک کرنے کا خیال آیا لیکن فارقلیط اس قدر مشہور ہو چکا تھا کہ بغیر نام کے ہی لوگ مجھے اس لفظ سے پہچان لیا کرتے تھے۔ پھر میں نے بھی رہنے دیا کیونکہ فارقلیط کے بغیر پہچان لینا مشکل ہو گیا تھا''۔ (واضح ہو کہ فارقلیط عبرانی زبان کا لفظ ہے جو عہد نامہ قدیم Old Testament میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کا ترجمہ ہے، جس کے لغوی معنی ہیں جھوٹ اور سچ کے درمیان فیصلہ کرنے والا۔

مولانا کی علمی قابلیت

مولانا کی علمیت اور قابلیت کے بارے میں نامور دانشور آنجہانی مالک رام لکھتے ہیں: ''اسلام سے متعلق ان کا علم تھا ہی، انہوں نے ہندو دھرم اور عیسائیت کا بھی وسیع مطالعہ کیا اور یوں لیس ہو کر مخالفین کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ اس سلسلے میں انہیں یوپی، سندھ، آندھرا پردیش (جو اس وقت حیدرآباد دکن کہلاتا تھا)، بنگال تک کا سفر کرنا پڑا بلکہ وہ برما اور ملایا تک گئے اور ہر جگہ انہیں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی، اور لوگ ان کی وسعت علم، حسن بیان اور حاضر جوابی سے بہت متاثر ہوئے۔ اسی زمانے میں انہوں نے انگریزی، ہندی، سندھی اور کچھ کچھ سنسکرت بھی سیکھ لی تاکہ مختلف مذاہب کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر سکیں۔ مناظرہ بازی کا سلسلہ 1926ء تک جاری رہا''۔ (تذکرہ معاصرین، جلد چہارم)

قادیانیت کے خلاف بھی مولانا فارقلیط زندگی بھر پورے علمی اور منطقی استدلال کے ساتھ صف آرا رہے، انہوں نے اپنے طویل دعوتی تجربات کی بنیاد پر علماء و دعاۃ کو کچھ مشورے بھی دیئے ہیں اور ان کے گھسے پٹے دعوتی وسائل و اسالیب پر نقد بھی کیا ہے اور بدلتے حالات میں جدید وسائل و اسالیب کو بروئے کار لانے پر زور دیا ہے۔ موصوف کے ان مشوروں میں جو خلوص ہے اور ساتھ ہی ان کے دل میں جو درد موجود ہے اس کا اندازہ ان کے الفاظ و جملوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں: ''راقم یہاں علمائے کرام کی ایک بنیادی کمزوری کی طرف بھی اشارہ کر دینا چاہتا ہے۔ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ قادیانیوں کا مقابلہ ضرور کیا جائے۔ (قادیانیوں سے متعلق گفتگو کے پس منظر میں یہ بات کہی گئی ہے) اور مسلم عوام کو مرزا صاحب فریب کارانہ وساوس سے بچایا جائے۔ لیکن ان کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ نہ تو برصغیر میں اور

نہ باہر کی دنیا میں تبلیغ اور اشاعت اسلام کو منظّم طریقے سے انجام دیتے ہیں اور نہ اس کے وسائل مہیا کرتے ہیں۔

مساجد کی تعمیر اور مدارس کا قیام

ہمارے علمائے کرام انگریزی زبان سے عموماً ناواقف ہوتے ہیں، حالانکہ انگریزی ہی بین الاقوامی زبان ہے اور عیسائیت کا سارا لٹریچر اسی زبان میں ہے۔ بہت کم علمائے انسائیکلو پیڈیا، ڈکشنری آف دی بائبل، انسائیکلو پیڈیا آف بریٹانیکا اور جیوش انسائیکلو پیڈیا، ڈکشنری آف دی بائبل، انسائیکلو پیڈیا آف ریلی جنز اینڈ ایتھک اور اسی طرز کے دوسرے لیٹریچر بھی نہ دیکھے ہوں گے، بجائے اس کے علمائے کرام اندر اور باہر کی دنیا میں اسلام کی تبلیغ کا سلسلہ قائم کریں۔ مختلف ممالک میں مساجد تعمیر کرائیں اور ہر مسجد میں اسلامیات پر لٹریچر جمع کریں۔ یورپ اور امریکہ اور مسلم ممالک میں اسلامی مدارس قائم کریں اور اسلامیات اور دوسرے مذاہب کے ماہرین سے تبلیغ اسلام کرائیں، عیسائیوں کے جواب کے لئے انگریزی میں اخبارات اور رسائل نکالیں، مختلف ممالک کے ریڈیو اسٹیشنوں سے صادقت اسلام پر تقریر کریں اور عیسائیوں کے ہر اجلاس میں پہنچ کر اپنے خیالات پیش کریں۔ وہ یہ سارے کام فتوی تکفیر سے لینا چاہتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ سارے علماء عالمی تبلیغ سے سبکدوش ہوجائیں گے اگر انہوں نے قادیانیوں کو کافر قرار دے دیا۔ حالانکہ ان کو معلوم ہے کہ باہر کی دنیا میں ان کا نظام تبلیغ پھیلا ہوا ہے اور ہر جگہ انہوں نے مساجد اور مدارس قائم کر کے قبائل کے مسلمانوں کو مشنریوں سے بچانے کی کوشش کی ہے اور پادریوں کی یورشوں کا بھرپور جواب دیا ہے۔ جب تک ہمارے علمائے کرام انگریزی میں لکھنے پڑھنے کی مشق کر کے ساری دنیا میں قادیانیوں سے زیادہ کام نہ کریں گے ان کی ترقی

کو بحث ومباحثہ سے نہ روکا جاسکے گا۔ کام کر کے دکھاؤ اور میدان جیت لو۔ اور جب سے پاکستان نے سرکاری طور پر قادیانیوں کو خارج از اسلام قرار دیا ہے علماء سمجھتے ہیں کہ قادیانیوں کی ترقی رک جائے گی اور پاکستان کا فیصلہ ان کے جمود کے لئے کفارہ بن جائے گا۔ یہ بات میں اپنے تجربے کی بنا پر حسبۃً للہ لکھ رہا ہوں۔ لندن میں جو دیوبندی اور بریلوی خیال کے لوگ مقیم ہیں ان میں سے ایک شخص نے عندالملاقات راقم سے اعتراف کیا کہ اب تک لندن میں مقیم کوئی عالم خواجہ کمال الدین کا بدل ثابت نہ ہوسکا اور نہ کسی کو خواجہ صاحب کے مجلّہ 'اسلامک ریویو' کے پیمانے پر کسی رسالے کے اجراء کی توفیق ہوئی۔ البتہ بریلوی خیال کے علماء نے اہل حق کے خلاف تکفیری مشن بدستور چلا رکھا ہے''۔ (بحوالہ: مولانا محمد عثمان فارقلیط اپنی خودنوشت یادداشتوں کے آئینے میں۔ از مولانا اسعد اعظمی)

جمعیۃ علماء ہند کا اخبار

جمعیۃ علماء ہند نے 1925ء میں اخبار 'الجمعیۃ' جاری کیا، جمعیۃ علماء ہند آغاز سے ہی کانگریس کی ہمنوا رہی، یہ تنظیم اکابرین دیوبند کے جہاد آزادی اور قوم پرست نظریات کی بنا پر قائم کی گئی تھی، اخبار پہلے سہ روزہ شروع ہوا جس کے ایڈیٹر سید ابوالاعلیٰ مودودی مقرر ہوئے انہوں نے تین سال تک اپنے قلم سے کانگریس کی تحریک کو طاقتور بنانے کا کام کیا۔ مولانا مودودی کا شمار عالمی شہرت یافتہ اسلامی دانشوروں میں ہوتا ہے ان کی علمی، دینی، ادبی اور صحافتی زندگی کے آغاز کا زمانہ تھا لیکن ان کی پر جوش اور بصیرت افروز تحریروں نے اخبار کو پورے برصغیر میں مشہور کر دیا۔ 1928ء میں مولانا مودودی حیدرآباد روانہ ہوگئے تو ان کی جگہ مولانا بلال احمد زبیری ایڈیٹر ہوئے۔ اسی اثنا میں سبحان الہند مولانا احمد سعیدؒ جمعیۃ کے ناظم عمومی ہوئے۔ مولانا فارقلیط بھی کراچی سے دہلی آگئے تھے، چونکہ مولانا احمد سعید فارقلیط

صاحب کی بیحد قدر کرتے تھے اس لئے انہوں نے فارقلیط صاحب کو 'الجمعیۃ' میں مترجم اور نائب مدیر بنادیا۔ انہوں نے بڑے خلوص ومحنت کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں نبھائیں اور زبیری صاحب کے بعد 'الجمعیۃ' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

کئی بار جیلوں میں گئے

ایسا نہیں ہے کہ ان کو حق گوئی وبے باکی کی سزا نہ بھگتنی پڑی ہو، وہ کئی بار جیل بھی گئے لیکن جادۂ حق سے ان کے قدم کبھی نہیں لڑکھڑائے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے تقریباً پچاس سال صحافت میں گزارے لیکن انہیں تصنیف وتالیف کے لئے وقت نہیں ملا۔ انہوں نے صرف ایک ناول 'از بلا' اسپین میں عیسائیت کے خلاف اسلام کی صداقت پر تصنیف کیا۔ یہ ایک عیسائی حسینہ از بلا کے قبول اسلام کا قصہ ہے۔ یہ ناول 'الجمعیۃ' میں بالاقساط چھپا، بعد میں کتابی صورت میں بھی شائع ہوا۔ اس کا انگریزی ترجمہ رنگون سے اور بنگالی ترجمہ کلکتہ سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ 'رہنمائے عقل' اور 'کلید خود شناسی' دو مختصر کتابیں لاہور سے شائع ہوئیں۔ 25 سال تک ملک وملت کی خدمت کرنے کے بعد بوجہ ضعیفی وخرابی صحت 1972ء میں 'الجمعیۃ' کی ادارت سے ریٹائر ہوگئے، انہیں اردو صحافت کی ترقی وترویج کے مسائل سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔

1973ء میں آل انڈیا اردو ایڈیٹرز کانفرنس کی صدارت کی اس پر ان کا صدارتی خطبہ اردو صحافت کی تاریخ میں ناقابل فراموش ہے۔ 12 جون 1976ء کو بعارضہ فالج دہلی میں آپ کا انتقال ہوا۔ وصیت کے مطابق جنازہ آبائی وطن پلکھوا لیجایا گیا، جہاں اپنے خاندانی قبرستان میں دفن کئے گئے۔

☆☆☆

فدائے ملّت مولانا سید اسعد مدنیؒ [20]

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

موت، موت ہے لیکن ہر موت، موت نہیں ہوتی اس دنیائے فانی میں چند نفوس قدسیہ ایسی گذری ہیں جن کی موت بھی حیات سے بڑھ گئی ان کا علم، وتقویٰ، طہارت، عبادت، ریاضت، کے ساتھ قومی وملی تاریخ ساز خدمات نے عامۃ المسلمین پر وہ نقوش چھوڑے کہ جن کی وجہ سے ان کی موت بھی حیات بن گئی۔ حضرت والا کے حالات واقعات، قوم وملت کے لئے آپ کا درد وغم ہم سب کو بلکہ قوم مسلم کو معلوم ہے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت کو تقریباً چار سال گذر چکے لیکن حضرت کی گرانقدر خدمات ایسی زندہ وتابندہ ہیں جیسے آج بھی وہ ہمارے روبرو موجود ہیں۔

ہنستے ہوئے جہاں کو رلاکر چلے گئے
پیغام اپنا سب کو سنا کر چلے گئے
مثل جرس رہے سدا غافل کے واسطے
سوئے ہوئے تھے ہم وہ جگا کر چلے گئے

[20] راشٹریہ سہارا، 06 فروری-2011ء

کس نے بلادیا کسی سے نہ کچھ کہا
خاموش اٹھ کر بزم سے باہر چلے گئے
تسکین قلب کے لئے آئے تھے جو یہاں
درد جگر وہ اور بڑھاکر چلے گئے
کچھ لوگ انتظار میں بیٹھے تھے شام تک
جانے کہاں وہ صبح نہاکر چلے گئے
کرتے بھی لوگ اس کے سوا اور کیا بھلا
اپنے گھروں کو اشک بہا کر چلے گئے
دیکھا سواد شہر تو پتوار رکھ دیا
ساحل قریب تر ہے بتا کر چلے گئے
علم وہنر کہاں وہ سخن ور کہاں رہے
سنگیت رہ گیا ہے نواگر چلے گئے
نقش قدم پہ ان کے عزیز وچلے چلو
وہ راستے کو کرکے اجاگر چلے گئے
ابکون ہے جو دے ہمیں گوہر نکال کر
وہ بحر معرفت کے شناور چلے گئے

حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ اپنے عہد کے ایک عظیم شخصیت تھے مزید یہ کہ وہ ایک عظیم شخصیت کے بیٹے بھی تھے اس طرح حضرت والا کو ان دونوں پہلوؤں سے عظمت حاصل ہوئی اس عظمت کے آثار ان کے آغاز عمر سے شروع ہوگئے تھے انہوں نے شعور زندگی حاصل کرنے اور فراغت تعلیم کے بعد ہی سے ملت اسلامیہ کے مسائل سے دلچسپی لینی شروع کردی تھی اپنے بڑوں کے انتقال کے بعد ان کی جگہ

بحیثیت ،رہبر ملت، کے اونچا مقام حاصل کرلے اور برصغیر کے مسلمان کو درپیش پریشان کن مسائل ومعاملات کے لئے متحرک ومستعد جماعت جمعیۃ العلماء ہند کے وہ سربراہ قرار پائے۔

فدائے ملّت کی جدوجہد

حضرت فدائے ملت نے ملت کے مشکل ترین مسائل کا دور پایا،ان سے پہلے جمعیۃ علماء ہند کو حصول آزادی کیلئے ضروری جدوجہد کو انجام دینا پڑا تھا ان کا مقابلہ غیر ملکی اقتدار سے تھا اس مقابلہ میں انکو غیر مسلم اہل وطن کیساتھ شرکت اور آپسی تعاون بھی حاصل رہا تھا اور مولانا اسعد میاں صاحبؒ کو جمعیۃ علماء ہند کی جدوجہد کا وہ عہد ملا جس میں غیر ملکی سامراجی طاقت کے علاوہ ملک کے اندرونی اختلافات سے بھی واسطہ پڑا یعنی سامراجی غلبہ ختم ہونے پر اہل ملک کا اقتدار قائم ہوا لیکن اکثریتی فرقہ کو حکومت میں والیت حاصل ہوئی ایسی صورت میں ملت اسلامیہ کے مسائل کے پیش نظر اسکی نصرت اور تقویت کے معاملات سامنے آتے اور انکے حل کیلئے فکر کرنا ہوتی تھی اور اس سلسلہ میں ضروری مسائل کے حل کے ضمن میں ان کو اپنے ہم وطنوں اور حکومت کے سربراہوں سے واسطہ پڑتا تھا،تقسیم ملک نے جو تلخی پیدا کردی تھی اس میں شروع کا عہد ہندو اکثریت اور مسلم اقلیت کے درمیان ایک طرح سے کشمکش اور منافرت کا دور بن گیا تھا اسلئے مسائل کے حل میں حکمت عملی کی محنت کی اور مخلصانہ جدوجہد کی ضرورت تھی اس عہد کی ذمہ داریوں میں مولانا اسعد مدنیؒ نے نمایاں حصہ لیا چنانچہ مسلمانوں کا ایک مخلص طبقہ ملت کے مسائل کے پیچیدہ ہونے کی صورت میں ان سے اچھی توقع قائم کرتا تھا اور ان سے فکر اور تلاش حل کی امید کرتا تھا مولانا اسعد صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے ہمت اور حوصلہ بھی بے پناہ عطا فرمایا تھا۔اور یہ وراثت ان کو

بڑی حد تک اپنے والد کی عظیم شخصیت سے ملی تھی۔ان کے عظیم والد شیخ لاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے برطانوی استعمار کے ظلم وستم کے ماحول میں ملت اسلامیہ کی آزادی اور عزت کیلئے نہایت مخلصانہ اور انتھک جدوجہد کی تھی اور اپنے راحت وآرام کی مسلسل قربانی دی تھی اور بار بار جیل گئے تھے انکی عظمت کی ایک بڑی علامت یہ تھی کہ انہوں نے سیاست اور دین داری کو بہت خوبی کیساتھ جمع کیا تھا،ایک طرف وہ علمی لحاظ سے ایشیاء کی عظیم ترین دینی درسگاہ دارلعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث تھے۔

مولانا مدنی کو شیخ الاسلام کا خطاب

دوسری طرف روحانی دنیا کے مربی ومرشد اعظم تھے جن سے ارادت وخلافت میں سینکڑوں ہزاروں لوگ منسلک تھے چنانچہ اس راہ سے بھی ان کا بڑا فیض جاری تھا، انہوں نے جنگ آزادی میں شرکت مخلصانہ اور رضائے الٰہی کی طلب کے جذبے سے کی تھی اور اس کے لئے تکلیفیں اٹھائیں،جس کی قدر مسلمانوں کے ہر خورد وکلاں طبقہ میں تھی اور اس کی بناء پر وہ شیخ الاسلام، کے خطاب سے نوازے گئے، انہوں نے اپنے اس دینی وعلمی بلند مقام کیساتھ ملکی سیاست میں جدوجہد آزادی سے اپنے آپ کو وابستہ رکھا جو کہ برطانوی سامراج کے اس ظلم اور حق تلفی کو روکنے اور بیرونی طاقت کو ملک بدر کرنے سے تعلق رکھتا تھا جس کی ضرورت اہل وطن کو اور خاص طور سے مسلمانوں کو تھی مولانا اور ان کے رفقاء کی پرخلوص فکر دیں وملت اور جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ ملک سامراجی طاقت سے بغیر مسلح ٹکراؤ کے آزاد ہوا اور ملک کی آزادی کے بعد بھی ان علماء کرام کا اثر اکثریتی طبقہ کے ان افراد کے ذہنوں میں باقی رہا جو جدوجہد آزادی میں ان علماء کیساتھ تھے حالانکہ ملک کی آزادی ہندو،مسلم تفریق کے اصول پر انجام پائی جس کی وجہ سے ہندو اکثریت میں آنے والے ملک کے علاقوں میں

مسلمانوں کو اجنبی محسوس کیا جانے لگا تھا ان کا حصہ یعنی پاکستان ان کو الگ سے دے دیا گیا،لہٰذا اب یہاں ان کا کوئی بڑا حق نہیں رہا ہندو اکثریت کے ان احساسات کی بناء پر ہندوستان میں ملت اسلامیہ کو خاص دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اور پریشانی کے ان پیچیدہ حالات میں ملت کی سیاسی اور سماجی امور ومقاصد کے حل کی ذمہ داری جمعیۃ علماء ہند کو منتقل ہوئی جسکے نمایاں افراد میں مولانا سید حسین احمد مدنی،مولانا ابوالکلام آزاد، اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی وغیرہ تھے۔مولانا اسعد مدنی بچپن سے ان حضرات کے قریب تھے اور عملی طور پر جمعیۃ علماء سے وابستہ بھی ہوگئے تھے۔اس لئے جلد ہی ملت کی اہم اور قدیم جماعت جمعیۃ علماء ہند کے صف اول کے سربراہ کے مقام پر پہنچے اور جماعت کو ان کی برابر رہنمائی حاصل رہی اور اپنی اس رہنمائی سے انہوں نے ملت کو مختلف پہلوؤں سے فائدہ بھی پہنچایا وہ اپنی پرعزم حوصلہ اور صلاحیت کے نتیجہ میں پارلیمنٹ کے رکن بھی منتخب ہوئے اور پارلیمنٹ کے اندر انہوں نے مسلمانوں کی نمائندگی میں حصہ لیا اور متعدد اہم مسائل میں کامیابی حاصل کی۔

فدائے ملّت کی رحلت سے خسارہ

مولانا اسعد صاحبؒ بڑے عالم دین بھی تھے دارالعلوم دیوبند کے تربیت یافتہ تھے وہاں کچھ عرصہ تدریس کا فریضہ بھی انجام دیا تھا اور ایک بزرگ وربانی صفت رکھنے والی شخصیت کے فرزند ہونے کے ناطے بزرگی اور ربانی طریقہ زندگی کے اوصاف بھی وراثت میں پائے تھے اس کیساتھ ساتھ تصوف اور ربانیت کی راہ میں بھی ان سے منسلک لوگوں کی رہنمائی اور تربیت کرتے تھے اس طریقہ سے وہ رہبر ملت ہونے کے ساتھ ساتھ شیخ طریقت بھی تھے لہٰذا انکی وفات سے ملت اسلامیہ کو اس سلسلہ کا جو بھی خسارہ ہوا اس کی تلافی عام طور سے مشکل سے پوری ہوتی ہے البتہ یہ

بات خوش آئند ہے کہ مولانا اسعد صاحبؒ کے ایک ممتاز صاحبزادے مولانا سید محمود مدنی صاحب نے بڑی حد تک ان ذمہ داریوں کو سنبھالا ہے امید کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی مدد سے وہ ملک وملت کی نصرت کا فریضہ انجام دیں گے اور اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ان سے خسارہ کی بہت حد تک تلافی ہو سکے گی۔ ایک عظیم باپ کے فرزند ہونے کے تعلق سے ان پر خاص مشکل ذمہ داری آپڑی ہے جس کو انہوں نے جرأت اور ہمت کیساتھ سنبھالا اور اپنے معاصر زعماء ملت کیساتھ اس ذمہداری کو انجام دینے کی کوشش کررہے ہیں ملت کے ان زعماء کے درمیان نقطہ نظر کا اختلاف بھی پیدا ہوتا رہا لیکن اس اختلاف کے باوجود سبھی حضرات اپنے اپنے دائرے میں کام کررہے ہیں۔

مولانا سید اسعد مدنیؒ ایک پرعزم، باہمت اور مستعد شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی مسلسل جدوجہد اور عمل میں گزاری اور ہندوستان میں ملت اسلامیہ کی کمزور اور شکستہ حال حیثیت کو سنبھالنے کی بڑی کوشش کی اور جمعیۃ علماء ہند کے بعد بھی جمعیۃ علماء کے رہنماؤں نے اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوئی کسر باقی نہیں رکھا۔ تاریخی حوالے سے اگر ہم دیکھیں تو معلوم ہوجائے گا کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تحریک، پھر شہدائے بالاکوٹ کی تحریک، دارالعلوم دیوبند کا قیام، پھر تحریک خلافت، جمعیۃ علماء ہند کا قیام یہ سب اسی ولی اللہی تحریک کا تاریخی تسلسل ہے اور اسی سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کس انداز سے ان لوگوں نے سامراجیت کو سمجھا اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کے زمانے میں تو یہاں انگریز نہیں آیا تھا لیکن انہوں نے مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کو سمجھا اور مغربی سرمایہ داریت سے متعارف کرایا کہ آج بھی جو ماہر معیشت اس حوالے سے قلم اٹھائے تو حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے فلسفے اور نظریئے کو نظر انداز نہیں کرسکے گا، پھر جب انگریز آیا تو انگریز کے اصل عزائم کا بھی ہمارے اکابرین کو پتہ چل گیا انہی اکابر نے ان کی حقیقت کو سمجھا۔ دنیا میں ہر آن

موت وحیات کی پنجہ آزمائی جاری ہے۔ اور ہر وقت، ہر جگہ اور ہر موسم میں پیش آنے کی وجہ سے زندوں کا ایک ہی لمحہ میں مردہ ہوجانا اور پھر لوٹ کے کبھی نہ آنا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار کوئی نہیں کرسکتا لیکن جب کوئی انسان دنیا سے منہ موڑ لیتا ہے، اور اس کو کھودینے کے بعد اس کی قدر و قیمت کا احساس زیادہ ہوتا ہے، مولانا کی کمی پورے ملک میں شدت کے ساتھ محسوس کی جارہی ہے۔

آج خاموش ہے طوفان اٹھانے والا اسعد
وہ عالم ہی نہیں غازی گفتار بھی تھا
وہ کہ ناصح ہی نہیں صاحب کردار بھی تھا
حق پرستوں کے لئے قافلہ سالار بھی تھا
وہ کوئی شخص نہیں دور کی تاریخ تھا
قوم کے جھیلے ہوئے جو کی تاریخ تھا وہ
وہ کسی پیروی میں بھی عزم جواں رکھتا تھا
درد ملت کا سا دل میں نہاں رکھتا تھا
وہ ستائش کی تمنا ہی کہاں رکھتا تھا
آج خاموش ہے طوفان اٹھنے والا
اپنی تقریر سے سوتوں کو جگانے والا
قوم روئے گی اسے یاد کرکے برسوں
گلشن دین میں ہوا اس کی چلے گی برسوں
دل سے شاہد کے صدا یہ بھی اٹھے برسوں
تیرا بندہ تھا عطا کر اسے جنت یارب
مشعل راہ بنے اس کی صداقت یارب

☆☆☆

حضرت مولانا فیض احمد بدایونیؒ [21]

اس سے بڑا المیہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ وطن کی آزادی کے لئے اپنا سب کچھ قربانی کردینے والے انگنت مسلم مجاہدین کی قربانیاں گمنامی کی دھند میں چھپ گئیں، تنگ نظر ذہنیت نے اس تاریخ کو مٹا ڈالنے کی کوشش کی جو اس ملک کی ملت اسلامیہ کے لئے سرمایۂ افتخار ہے، لیکن یہ بھی ایک تلخ حیثیت ہے اس میں دوسروں کا ہاتھ جو ہے سو ہے لیکن ان سے زیادہ قصور خود ہماری بے خبری اور بے حسی کا رہا ہم ملک کے غلام ہوجانے کے بعد غیر ملکی اقتدار کے دکھائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے وقت کے ساتھ اتنے آگے بڑھ گئے کہ ماضی کی تاریخ اور اسلاف کے کارنامے پیچھے چھوٹ گئے۔ ہمارے مقتدر تاریخ دانوں اور تذکرہ نگاروں نے بھی مصلحتاً یا سہل پسندی میں بہت سے فرزندان ملت کو نظرانداز کردیا، حالانکہ ان بڑوں کی تحریریں آنے والی نسلوں کے لئے اپنے ماضی کے شناخت کا وسیلہ ہیں، لیکن یہ وسیلہ کس قدر نامکمل رہا، اور ایسا نقصان بھی کہ جس کی تلافی ناممکن ہے۔

1857ء کی جنگ آزادی میں لاکھوں عام ہندوستانیوں کے ساتھ ہزار ہا علماء کرام نے اپنے جان و مال کی قربانی دی ہے، ان میں لاتعداد ایسی عظیم شخصیات بھی

[21] عالمی سہارا، 8 ستمبر-2012ء

تھیں جو اپنے علم و فضل اور وقار و مرتبے کے لحاظ سے عہد ساز اہمیت کی حامل تھیں، لیکن وقت نے ان کی یادوں کو ہمیشہ کے لئے ناپید اور نابود کرکے رکھ دیا۔ لیکن صداقت ایک ایسی قوت ہے کہ جو کبھی مٹتی نہیں، کسی نہ کسی صورت میں وہ قائم ضرور رہتی ہے، اگر آج بھی ہم کوشش کریں تو وقت کی دبیز تہوں میں دبی ہوئی سچائیوں کی بازیافت ممکن ہے، ہم آج بھی اپنے اسلاف کی کھوئی ہوئی عظمتوں کو زندہ کرسکتے ہیں اس کا ثبوت ہے پروفیسر محمد ایوب قادری مرحوم کا وہ کتابچہ جس میں 1857ء کی جنگ آزادی کے ایک عظیم مجاہد حضرت مولانا فیض احمد بدایونیؒ کا تذکرہ ہے۔

مولانا بدایونی عام آدمی نہیں تھے

حیرت ناک امر یہ ہے کہ مولانا فیض احمد بدایونی رحمۃ اللہ علیہ کوئی عام شخصیت نہیں تھے۔ وہ 1857ء کے جہاد میں حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی کے ساتھی تھے، انگریزوں کے خلاف جامع مسجد سے جاری علماء اسلام کے تاریخی فتوے پر دستخط کرنے والوں میں شامل تھے، بہادر شاہ ظفر سے آخری ملاقات کرکے مایوسی کے عالم میں دہلی چھوڑنے والے نامور سالار جنرل بخت خاں کے ہمراہ ہمایوں کے مقبرے سے نکلے تھے۔ اودھ کی جنگ میں وہ مولانا احمد اللہ شاہ شہید اور شہزادہ فیروز شاہ کے ساتھ انہوں نے عملی طور پر وطن کے دشمنوں سے جنگ کی تھی یہاں تک کہ جب مولانا احمد اللہ شاہ نے اودھ کے اہم مقام محمدی کو آزاد کرالیا اور وہاں آزاد حکومت قائم کی تو اس کا نظم و نسق چلانے والے اعلیٰ عہدے داروں میں وزیر دفاع جنرل بخت خاں، قاضی القضاۃ قاضی سرفراز علی، نانا صاحب پیشوا دیوان، اراکین کونسل میں مولوی لیاقت علی الٰہ آبادی، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا فیض احمد بدایونیؒ شامل تھے اور جب محمدی پر انگریزوں نے حملہ کیا تو مقابلہ کرنے والے مجاہدین میں مولانا فیض احمد

سب سے آگے تھے۔اس خونیں معرکہ میں سیکڑوں مسلمانوں نے مادر وطن کے حضور جانوں کا نذرانہ پیش کیا، اس شکست کے بعد مولانا کا پتہ نہیں چلا، شہداء کی لاشوں میں بھی وہ نہیں پائے گئے۔مجاہدین آزادی کے سردار حضرت مولانا احمد اللہ شاہؒ نے شہادت پائی ان کے خاص ساتھی ڈاکٹر وزیر خاں اور شہزادہ فیروز شاہ بچ نکلنے میں کامیاب رہے اور ایک مدت کے بعد معلوم ہوا کہ وہ اصحاب حجاز مقدس پہنچ گئے لیکن اپنے وقت کے عظیم عالم دین اور سرفروش مجاہد آزادی مولانا فیض احمد بدایونیؒ کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ روپوش ہوئے ہوتے تو کبھی نہ کبھی ظاہر ہوتے، یقیناً وہ شہادت کے مرتبے پر فائز ہوگئے۔

مولانا بدایونی کے آباواجداد

حضرت مولانا فیض احمد بدایونیؒ بدایوں کے مشہور اور معزز عثمانی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔آپ کے جد اعلیٰ عہد شمش الدین التمش میں ہندوستان تشریف لائے اور بدایوں کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔اس کے بعد اس خاندان میں عظیم المرتبت علمی و دینی شخصیات پیدا ہوتی رہیں، اس محترم خاندان کے افراد بدایوں شہر کے محکمۂ قضا پر فائز ہوتے رہے۔ ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی اور انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کے خلاف اس خاندان کے افراد شروع سے ہی جہاد پر آمادہ رہے۔ 1816ء میں حضرت مفتی محمد عیوض، مفتی بریلی نے روہیل کھنڈ میں انگریزوں سے جہاد کیا۔پیلی بھیت، آنولہ، رام پور، سرولی، شیر گڑھ اور شاہجہاں پور وغیرہ سے پانچ ہزار مجاہدین نے مفتی صاحب کی قیادت میں زبردست جنگ کی اور پہلے ہی ہلے میں انگریزوں کو زبردست زک پہنچائی، لیکن بدقسمتی سے عین وقت پر انگریزی افواج کو تازہ دم سپاہیوں کی کمک حاصل ہوگئی اور مجاہدین ناکام ہوگئے۔مفتی صاحب اپنے

ساتھیوں کے ساتھ ٹونک پہنچ گئے۔ جہاں کے نواب نے ان کی بہت قدر و منزلت کی، آپ کا انتقال ٹونک میں ہی ہوا۔اسی نامور عثمانی خاندان کے ایک بزرگ حکیم غلام احمد کے گھر مولانا فیض احمد 1808ء میں پیدا ہوئے یہ مشیت ایزدی تھی کہ آپ تین سال کی عمر میں ہی یتیم ہوگئے، آپ کی والدہ محترمہ نے آپ کی پرورش کی، محترمہ کے والد اپنے عہد کے بہت بڑے عالم دین اور روحانی پیشوا تھے۔ان کی تعلیم و تربیت اپنے شفیق ماموں اور استاذ حضرت مولانا فضل رسول کے سایۂ عاطفت میں ہوئی۔ مولانا فضل رسول، حلم و فضل اور درس و تدریس میں مشہور زمانہ تھے۔مولانا فیض احمد بدایونیؒ قدرتی طور پر غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے۔چودہ برس کی تعلیم کے بعد ایک جید عالم بن کر مسند درس و تدریس پر فائز ہوئے۔عبادت و ریاضت اور روحانیت کی طرف قدرتی میلان تھا، علوم باطنی میں آپ حضرت اچھے میں ماہرویؒ کے خلیفہ آپ کے نانا اس وقت مسند رشد و ہدایت پر رونق افروز تھے۔چنانچہ آپ ان دست مبارک پر بیعت ہوئے۔

مولانا بدایونی استاد مقرر ہوئے

حضرت مولانا فیض احمد بدایونیؒ اپنے وقت کے متبحر عالم اور معلم ہوئے، ان سے علمی و روحانی فیض حاصل کرنے والوں میں اکثر نامور علماء و فضلاء ہوئے۔آپ انگریز حکومت میں ایک اہم عہدے پر ملازم ہوکر آگرہ میں تعینات ہوئے، آگرہ میں اس دور میں علماء و فضلاء کا مرکز تھا، مفتی انعام اللہ خاں، وکیل سرکار، مولوی کریم اللہ صدر صدور، مولانا قاسم دانا پوری، مولانا غلام امام شہید اور دوسرے زعماء کے علاوہ مشہور تاریخی شخصیت ڈاکٹر وزیر خاں کے ساتھ مولانا فیض احمد بدایونیؒ کے قریبی روابط تھے۔دونوں ہی اصحاب علم و فضل کے شیدائی تھے، مزاجوں کی یکسانیت

نے تعلق کو بہت گہرا کر دیا تھا۔ دونوں اصحاب ایک دوسرے کی ہر ممکن مدد کے لئے تیار رہتے تھے، چنانچہ جب انگریز مشنری پادری فنڈر نے دین مسیحی کی برتری ثابت کرنے کے لئے مسلمانوں کو مناظرے کے لئے للکارا اور آگرہ میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے مابین جنوری 1854ء کو تاریخی مناظرہ ہوا، اس وقت ڈاکٹر وزیر خاں اور حضرت مولانا فیض احمد بدایونیؒ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے مددگار تھے۔ پادری فنڈر کو مولانا کیرانویؒ نے چیلنج کیا تھا کہ جو فریق مناظرے میں ہار جائے گا وہ فاتح کا مذہب اختیار کرے گا۔ یہ چیلنج پورے عالم نصرانیت کی ناک کا سوال تھا، اپنی علمیت کے نشے میں چور پادری نے مولانا کا چیلنج قبول کر لیا۔ مناظرے کی شرائط طے ہوئیں۔

10 اپریل 1854ء کو آگرہ میں یہ مناظرہ ہوا جس میں عیسائی عالم کو زبردست ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا۔ اس مناظرے کی تفصیلات مولانا امداد صابری کی کتاب 'فرنگیوں کا جال' اور دوسرے تذکروں میں تفصیل سے موجود ہیں جن میں ڈاکٹر وزیر خاں کا ذکر تو ملتا ہے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ڈاکٹر عاشق دین متین اور سرفروش مجاہد آزادی تھے۔ لیکن حضرت مولانا فیض احمد بدایونیؒ کا تذکرہ نہیں ہے جو حضرت مولانا کیرانویؒ کے دست راست کی حیثیت سے اس مناظراتی مجادلے میں شریک تھے۔ تاہم پروفیسر محمد ایوب قادری مرحوم نے اپنے مقالے میں اکمل التاریخ اور دیگر علماء مورخین کی مستند کتابوں سے مولانا کی موجودگی ثابت کر دی ہے۔ اس دور کی معروف تاریخوں میں بھی مولانا بدایونیؒ کا ذکر نہیں ملتا، جب کہ پروفیسر صاحب نے بڑی کدوکاوش سے طوالع الانوار، تحفہ فیض اور بوارق محمدیہ اور اکمل التاریخ جیسی اہم کتابوں کی مدد سے یہ واضح کر دیا ہے کہ حضرت مولانا فیض احمد بدایونیؒ 1857ء کی جنگ آزادی میں دہلی سے لے کر اودھ تک پوری قوت کے ساتھ شامل رہے۔

مساجد کے حصوں پر ناجائز قبضے

حضرت مولانا فیض احمد بدایونیؒ کا ذکر حضرت مولانا محمد میاں دہلویؒ اور دوسرے مورخین نے کیوں نظر انداز کیا، یہ تحقیق کا موضوع ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ حضرت مولانا فیض احمد بدایونیؒ نہ صرف علم و فضل میں یکتائے زمانہ تھے بلکہ ملی جزبۂ حریت سے سرشار ایک باہمت انسان بھی تھے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی اور مولوی سعید احمد ماہروی کی کتابوں کے حوالے سے پروفیسر صاحب نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ 1835ء میں آگرہ کی مسجد کی دوکانیں بدعنوان متولیوں نے بنیوں کے پاس رہن رکھ دی تھیں، بنیوں نے دوکانیں ہی نہیں مسجد کے بڑے حصے پر قبضہ جما لیا تھا، مسجد کا برا حال تھا، صحن میں رسیاں بٹی جاتی تھیں، چھت پر کبوتر اڑائے جاتے تھے، مولانا فیض احمد بدایونیؒ جب آگرہ تشریف لائے تو مسجد کی حالت دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوئے۔ انہوں نے شہر کے انگریز حاکم سے شکایت کی، اس نے مسجد کی دوکانوں کا قبضہ دلانے میں قانونی مجبوری بتائی، قابضین رہن کی رقم واپس لے کر قبضہ چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔ اس پر مولانا نے تجویز پیش کی کہ قابضین پر مروجہ شرح کے مطابق سرکار کرایہ نافذ کر دے، انگریز حاکم فنلے نے اس تجویز کو مان لیا اور قابضین پر اس وقت سے کرایہ نافذ کر دیا جب سے وہ مسجد کی جائیداد پر قابض تھے، ترکیب کارگر رہی یہ کرایہ ان کی رہن کے وقت دی گئی رقم سے بہت زیادہ تھا، بنیوں نے دوکانیں خالی کرنی ہی مناسب سمجھا۔

پروفیسر محمد ایوب قادری مرحوم نے اکمل التاریخ کے حوالے سے لکھا ہے کہ آگرہ میں حضرت کی ملازمت کے دوران سر ولیم میور نے آپ سے عربی کی تعلیم حاصل کی، یہ وہی ولیم میور ہے جس نے 'لائف آف محمدؐ' نامی کتاب گستاخانہ لکھی اور

جس کے غلط بیانیوں کی رد میں سرسید احمد خاں نے مدلل کتاب لکھ کر اس وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا۔

مجموعی طور پر پروفیسر ایوب قادری مرحوم کی اس چھوٹی سی کتاب سے یہ پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت مولانا فیض احمد بدایوںؒ عظیم عالم دین اور بہادر مجاہد آزادی تھے، ان کے میدان کارزار میں شہید ہونے یا کفار کے نرغے سے بچ کر نکل کا جانے کے بارے میں خواہ دنیا کو کچھ نہ معلوم ہو، خواہ مشہور علماء مورخین کی کتابوں میں ان کا ذکر نہ ہو لیکن حضرت مولانا فیض احمد بدایوںؒ کی حب الوطنی اور ملی عظمت اپنی جگہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ (تلخیص)

☆☆☆

بیرسٹر اور صحافی مولانا مظہر الحقؒ [۲۲]

ہندوستان کی تحریک آزادی کے مسلم مجاہدین کا ذکر پوری تاریخ نہیں ہے۔ تاریخ تو تمام قوموں کی مجموعی جدوجہد کے تذکرے سے مکمل ہوتی ہے، لیکن یہ اسی تاریخ کا ایک سب سے بڑا حصہ ہے جسے ملک کی تقسیم اور آزادی کے بعد بے رحم سیاسی سازشوں نے مٹانے، چھپانے اور دھندلا کرنے کی مذموم کوشش کی ہے۔ اپنے وطن کی آزادی کے لئے صوبہ سرحد سے کلکتہ تک اور کشمیر سے کنیا کماری تک مسلمان مجاہدین آزادی کے لہو سے رنگین تاریخ آزادی پر چند منتشر اور مختصر سی تحریروں کا یہ سلسلہ محض ایک یاددہانی یا نشاندہی ہے ہندوستانی عوام کے لئے، بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی نئی نسلوں کے لئے جنہیں ان کے اس عظیم وطنی افتخار سے محروم کرنے کی منظّم کوشش گزشتہ آدھی صدی میں کی گئی ہے کہ انکی مقدس سرزمین وطن کی بنیادوں میں ان کے اسلاف کا لہو بھی شامل ہے۔

نئے ہندوستان کی تاریخ شاہد ہے کہ بہار کی عظیم الشان 'وہابی تحریک' وطن کی آزادی کے لئے اسلامی اقدار اور ایمانی جذبہ کے ساتھ ایک مقدس جہاد تھا جس کی شدت میں وہی ولی اللہی روح کارفرما تھی جو شہیدان بالاکوٹ کی صدائے حق بن کر

۲۲ راشٹریہ سہارا، 29/اپریل-2010ء

برصغیر میں گونجی اور 1857ء کے ناکام انقلاب کے بعد بھی علماء صادق پور کی بے مثال قربانیوں میں جلوہ فگن رہی۔ یہ وہی چنگاری تھی جس نے 1857 سے 1947ء تک مسلسل جاری رہنے والی تحریک آزادی میں بہاری مسلمانوں کی شعلگی کا احساس پورے ملک کو کرایا۔

ناقابل انکار حقیقت

یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ کانگریس کی تاریخ ساز جدوجہد، تحریک خلاف، ہوم رول، نمک تحریک اور ملک گیر ستیہ گرہ سے لے کر اس طویل جنگ کا کوئی مرحلہ ایسا نہیں ہے جس میں سرزمین بہار کے نامور سپوت مولانا مظہر الحق کی بے نظیر شخصیت کو نظر انداز کیا جاسکتا ہو، کیونکہ مولانا کے عظیم کارناموں کے نقوش تحریک آزادی کے منظر نامے پر اس قدر نمایاں ہیں کہ تنگ نظر سیاست کی کوئی کوشش، کوئی سازش انہیں چاہ کر بھی مٹا نہیں سکتی۔ برطانوی حکومت کے ایک اعلیٰ افسر، ایک قابل بیرسٹر، ایک انقلابی صحافی، تعلیمی بیداری کے نامور مبلغ اور جنگ آزادی کے ایک مفکر سپاہی کی حیثیت سے مولانا مظہر الحق کی 64 سالہ زندگی کا ہر پہلو اس قدر تابناک ہے کہ اس کی خیرگی سے مہاتما گاندھی کی قیادت میں لڑی گئی آزادی کی لڑائی کی تاریخ کا ہر ورق روشن ہے۔ ہمارے رہنماؤں میں وطن کی آزادی اور اہل وطن کی سرخروئی کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینے والوں کی کمی نہیں ہے لیکن گاندھی جی کے بعد صرف مظہر الحق ایسی مثال ہیں جنہوں نے مغربی تعلیم وتربیت کے بعد بیرسٹر کا باوقار پیشہ اور مغربیت کے سانچے میں ڈھلی آرام وآسائش کی زندگی چھوڑ کر محاورۃ نہیں سچ مچ فقیری اختیار کر لی ہو، لندن کے تعلیم یافتہ کامیاب بیرسٹر مظہر الحق جب آزادی کی لڑائی میں شامل ہوئے تو زندگی گزارنے کے تمام وہ طریقے ترک کر دیئے جو فرد کو اس کے معاشرے

میں ممتاز بناتے ہیں۔ انہوں نے فقیرانہ وضع قطع اختیار کی اور مسٹر سے مولوی اور مولانا کہے جانے لگے۔ تو یہ صرف دکھاوا نہ تھا۔ انہوں نے سیاست کو دنیوی قوت کے حصول کا نہیں بلکہ تزکیہ نفس اور باطن کی طہارت کا ذریعہ بنایا۔ وطن اور اہل وطن کی خدمت کو انہوں نے روحانی عبادت کا درجہ دیا۔ انہوں نے سیاست کا راستہ اختیار کرتے وقت اپنی ذات پر جو اعلیٰ انسانی اور اخلاقی اصول نافذ کئے ان پر آخری سانس تک قائم رہے۔ وہ ایک سچے مسلمان تھے لیکن ان کے نزدیک ہندوستانی سیاست میں ایسی فراخدلی لازمی تھی جہاں اپنے ہم مذہبوں کے روایتی احترام اور لحاظ کے ساتھ ہی تمام اہل وطن کے جذبات اور ان کے مفادات کا خیال سب سے اوپر ہو۔ مولانا مظہر الحق مہاتما گاندھی کی شخصیت سے اس درجہ متاثر ہوئے تھے کہ پوری طرح خود کو ان کے سانچے میں ڈھال دیا یہاں تک کہ انہیں فقیر اور درویش کے القاب سے یاد کیا جانے لگا۔

سیاست میں فقیری یا ترک دنیا کا مفہوم

جس دور میں مظہر الحق وطنی سیاست میں داخل ہوئے اسی درمیان مہاتما گاندھی نے کہا تھا: ''ہندوستان کی آزادی اور تعمیر نو کے لئے سادھوؤں اور فقیروں کی ضرورت ہے'' مہاتما کے یہ الفاظ مظہر الحق کے ذہن پر نقش ہو گئے۔ اپنی فقیری کے حوالے سے انہوں نے کہا تھا: ''سیاست میں فقیری یا ترک دنیا کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی پوری قوت اور عزائم کو ایک ہی مقصد کے حصول کے لئے وقف کر دے اور وہ ہے اپنے وطن کا مفاد۔'' مہاتما گاندھی کا انداز فکر یہی تھا۔ اپنے مشہور زمانہ انگریزی ہفت روزہ 'دی مدر لینڈ' کے 9 جون کے اداریے میں مولانا مظہر الحق نے لکھا ہے: ''مہاتما گاندھی ایک ایسے تارک الدنیا فقیر اور سنیاسی ہیں جنہوں نے اپنے وطن کی

خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا ہے۔ زندگی میں گاندھی جی کا مقصد صرف یہ ہے کہ دوسروں کی تہذیب کے مقابلہ میں اپنے ہندوستان کو اونچا اٹھایا جائے۔ ہر قیمت پر اپنی زمین کو انگریز کی غلامی سے آزاد کرایا جائے اور تمام اقوام عالم میں ہندوستان کو سربلند بنایا جائے۔ ہندوستان کیلئے وہ ہر ممکن ایثار و قربانی کے لئے تیار رہتے ہیں۔ وہ مادر ہند کی منتخب شخصیت ہیں'' مظہر الحق کے ان خیالات پر ان کے سوانح نگار اور معروف دانشور ڈاکٹر قیام الدین احمد کہتے ہیں کہ ''خود حق بھی مادرِ ہند کی منتخب شخصیت تھے اور انہیں (سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں کی طرح) اپنی خوبیوں کی وجہ سے بہار کا گاندھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

مولانا کی ملکی اور سیاسی خدمات

مولانا مظہر الحق کی ملکی اور سیاسی خدمات اور آزادی وطن کیلئے ان کی مفکرانہ خدمات کا اجمالی جائزہ لینے سے قبل شروع سے ان کے سوانحی کوائف جان لینا اس جگہ ضروری ہے۔

مولانا مظہر الحق کی ولادت پٹنہ سے تقریباً 25 کلومیٹر پر واقع موضع باہ پورہ میں 22 دسمبر 1866ء کو ہوئی۔ ان کے والد شیخ احمد اللہ علاقے کے زمیندار اور نیل بنانے کے کئی کارخانوں کے مالک ایک خوشحال اور متمول انسان تھے۔ ان کے خاندان کے کئی اصحاب نے وہابی تحریک میں بڑی بڑی قربانیاں دی تھیں جن کی یادیں اس خانوادے کے ذہنوں پر ہمیشہ تازہ رہیں۔ مولانا کی ابتدائی تعلیم مسلم اشرافیہ کی روایات کے مطابق دینیات اور عربی و فارسی میں ہوئی۔ بعد میں وہ اسکول میں داخل ہوئے۔ وہ نہایت ذہین طالب علم ثابت ہوئے۔ اسکول میں انہیں وظیفہ حاصل ہوا۔ 1847ء میں انہوں نے مڈل پاس کیا اور پٹنہ کے کالجیٹ اسکول میں

داخل کئے گئے۔ پھر جانے کیا ہوا کہ وہ گھر سے غائب ہوگئے۔ کچھ عرصہ بعد واپس آکر پھر تعلیم میں مصروف ہوئے۔ ان کی اس گمشدگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ میٹرک انہوں نے کسی نہ کسی طرح بیس سال کی عمر میں پاس کیا۔ وہ پٹنہ کالج میں آگے کی تعلیم کے لئے داخل ہوئے لیکن وہاں کسی ٹیچر سے ان کا جھگڑا ہوگیا جس کی وجہ سے کالج سے نکلنا پڑا۔ والدین نے لکھنو کے کیننگ کالج میں بھرتی کرایا۔ اس بار پھر تعلیم چھوڑ کر صرف 70 روپے لے کر وہ کالج سے غائب ہوگئے اور زائرین حج کے ایک قافلے کے ساتھ شامل ہوگئے۔ عدن پہنچ کر وہ وہاں قانون کے جال میں پھنس گئے۔ ان کے والد کی کوششوں اور بہت بڑی رقم خرچ کرنے کے بعد اس مصیبت سے آزاد ہوئے۔ اس بار انہیں لندن بھیج دیا گیا۔ ستمبر 1888ء میں لندن پہنچے تو اس وقت ان کے مزاج میں ٹھہراؤ آچکا تھا۔ انہوں نے دل لگا کر تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ برطانیہ میں ہم وطن اور ہم سبق مسٹر حسن امام سے گہری دوستی ہوئی۔ حسن امام بھی بعد میں بہت بڑے سیاسی رہنما بنے۔ دونوں دوستوں کے تعلقات ہمیشہ استوار رہے کیونکہ ان دونوں کا ایک ہی مقصد تھا 'وطن کی آزادی' اگرچہ مظہر الحق نے عملی سیاسی سفر حسن امام سے بہت بعد میں شروع کیا۔

انجمن اسلامیہ جیسی تنظیم کی تشکیل

لندن میں دوران تعلیم مظہر الحق نے وہاں مقیم ہندوستانی طلبہ کی ایک تنظیم 'انجمن اسلامیہ' کے نام سے تشکیل دی جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ سبھی ہندوستانی طلبہ ایک دوسرے کے رابطے میں رہیں۔ لیکن یہ انجمن مذہبی یا صرف مسلمان طلبہ کے لئے نہیں تھی۔ ہندو اسٹوڈنٹس بھی انجمن کی مجلسوں میں شامل ہوتے تھے۔ یہ طلبہ آپس میں تعلیمی اور علمی مسائل کے علاوہ اپنے وطن کی صورت حال پر بھی گفتگو کیا کرتے

تھے۔ ڈاکٹر قیام الدین احمد اپنی کتاب ''جدید ہندوستان کے معمار: مظہر الحق'' میں لکھتے ہیں کہ انہیں قانون کی پڑھائی کے ساتھ خطابت کے فن میں بھی خاصی دلچسپی تھی۔ وہ شیکسپیئر اور شیرڈن کے ڈراموں کے کرداروں کی نقالی اتنی عمدگی سے کرتے تھے کہ لوگ حیران ہوتے تھے۔ انہوں نے انگریزی کے ساتھ ساتھ فرانسیسی زبان میں بھی خاصی مہارت حاصل کی تھی۔ ان کی ذہانت کے سبھی قائل تھے۔ 1891ء میں مظہر الحق بیرسٹری کی ڈگری لے کر وطن واپس آئے اور پٹنہ میں وکالت شروع کی اور کامیاب وکیل ثابت ہوئے۔ 1902ء میں یوپی کے معزز خاندان میں ان کی شادی ہوئی بدقسمتی سے ان کی اہلیہ غوثیہ بیگم کا چند ماہ بعد ہی انتقال ہوگیا۔ 1906ء میں ان کی دوسری شادی خاندان کی ہی ایک خاتون کشور آرا بیگم سے ہوئی۔ ان کے بطن سے دو بیٹے حسن اور حسین پیدا ہوئے۔ صرف 6 سال کی پرمسرت ازدواجی زندگی گزارنے کے بعد 1912ء میں کشور آرا بیگم بھی داغ مفارقت دے گئیں۔ ان ناگہانی حادثات نے حق کو بہت متاثر کیا لیکن ان کی ترقی کا سلسلہ جاری تھا۔

یوپی کی عدلیہ کے منصف مجسٹریٹ

اسی دوران انہیں یوپی کے عدلیہ میں منصف مجسٹریٹ مقرر کیا گیا تھا۔ یہ 1896 کا سال تھا۔ عدلیہ میں وہ زیادہ دیر تک نہیں رہ سکے۔ اس کی وجہ یقیناً ملک کی غلامی اور انگریز قوم کی بالادستی کا احساس تھا۔ کہا جاتا ہے کہ انگریز جوڈیشیل کمشنر نے ان سے فرمائش کی کہ وہ اس کے لئے دو اچھے شکاری کتوں کا انتظام کردیں۔ اس احمقانہ فرمائش پر انہوں نے کمشنر کو ڈانٹتے ہوئے کہا: ''جو افسر آج کتوں کی فرمائش کررہا ہے وہ مستقبل میں کوئی بھی ناجائز مطالبہ کرسکتا ہے۔'' بات اتنی بڑھی کہ انہوں نے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور وہاں سے چھپرا سارن ضلع کے قصبہ انداراپنی بیوہ

بہن کے گھر چلے گئے کیونکہ انہی دنوں ان کے بہنوئی کا انتقال ہوگیا تھا۔ بہن کی تسلی اور دیکھ بھال کے لئے انہوں نے وہاں جاکر رہنا بہتر سمجھا۔ اس بار انہوں نے چھپرہ کی عدالت میں وکالت شروع کردی۔ وہ ایک جذباتی اور حساس نوجوان تھے۔ دوسروں کی تکلیف دیکھ کر بے چین ہوجایا کرتے تھے۔ 1897ء میں چھپرہ اور نواحی اضلاع خشک سالی کا شکار ہوگئے جس کا اثر غریب عوام پر بیحد تکلیف دہ تھا۔ انہوں نے غریبوں کو قحط کی آفت سے بچانے کے لئے امدادی فنڈ قائم کیا جس کے بہت اچھے نتائج برآمد ہوئے۔ عوام کی خدمت کا پرخلوص جذبہ ہی تھا کہ 1903ء میں وہ سارن میونسپلٹی کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ انہوں نے میونسپلٹی کی مالی حالت سدھارنے اور علاقہ کے عوام کو آسانیاں فراہم کرنے میں نمایاں کارنامے انجام دیئے جس کا بہت شہرہ ہوا لیکن 1908ء میں وہ پٹنہ کی عدالت میں پریکٹس کرنے لگے کیونکہ وہاں ترقی کا میدان وسیع تھا۔ پٹنہ میں ضلع جیل کے قریب جس مکان میں انہوں نے رہائش اختیار کی تھی اس کے ساتھ گزرتی ہوئی سڑک فریزر روڈ اب ان کی یادگار کے طور پر مظہر الحق روڈ کے نام سے مشہور ہے۔

بندھوا مزدور قانون پر تنقید

1912ء میں کونسل کے اجلاس میں انہوں نے بندھوا مزدور قانون پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا: ''اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو آزاد پیدا کیا ہے، لیکن اس کا یہ قدرتی حق انسانوں کے بنائے ہوئے قانون نے چھین لیا ہے، میں سرکاری قانون کے ذریعہ طے شدہ معاہدہ بندمزدوری کو غلامی سمجھتا ہوں۔ معاہدہ بندمزدوری نظام قطعی غیر اصولی ہے، یہ مالک کو جانور بنادیتی ہے اور مزدور کی اخلاقی قوت کو ختم کردیتی ہے۔ یہ طریق کار فوری طور پر بند ہونا چاہئے''۔ چونکہ قوم کی تعلیمی ترقی میں

انہیں خصوصی دلچسپی تھی اس لئے کونسل میں انہوں نے ایک بل پیش کیا جس کے تحت پرائمری تعلیم مفت حاصل کرنا ہر بچے کا بنیادی حق تھا۔

1913ء میں کانپور کی مچھلی بازار میں واقع مسجد کا سانحہ مظہر الحق کی زندگی کا اہم سیاسی موڑ ثابت ہوا۔ انگریز حکومت نے شہر کی اہم سڑک کو چوڑا کرنے کے لئے مسجد کا ایک حصہ شہید کر دیا جس پر مسلمانوں میں زبردست اضطراب پیدا ہو گیا۔ 13/اگست 1913ء کو پولیس نے احتجاجی مظاہرین پر گولی چلائی جس سے بہت سے مسلمان شہید ہو گئے۔ اس سانحے نے ملک بھر میں طوفان برپا کر دیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی اس ظالمانہ حرکت کے خلاف صف آرا ہو گئے۔

مظہر الحق بھی پورے جوش وخروش کے ساتھ حکومت کے خلاف سینہ سپر ہو گئے۔ انہوں نے قومی مسلم رہنماؤں کے ساتھ مل کر نہ صرف کانپور سانحے کے متاثرین کے لئے امداد فراہم کرنے کے کام میں دل وجان سے حصہ لیا بلکہ جن بہت سے لوگوں کو حکومت گرفتار کیا تھا ان کی مفت قانونی پیروی کے لئے کھڑے ہو گئے۔ ان کے ساتھ اور بھی کئی امور وکلاء مظلومین کانپور کی مدد کے لئے آگے آ گئے اور چند دنوں میں ہی ان کی کوششوں کا شہرہ یوں ہوا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے 20/اگست 1913ء کے 'الہلال' میں پورے صفحہ پر ان کی تصویر شائع کی۔ مسلمانوں پر حکومت کے اس ظلم کے خلاف طوفان اٹھ رہا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں ایک وفد لندن گیا کہ حکومت سے اس معاملے پر گفتگو کی جائے۔ وہاں حکومت نے تو وفد کی بات نہیں سنی مگر یہ آواز ساری دنیا میں گونجی۔ بالآخر گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ نے کانپور کا دورہ کیا، اس نے کچھ مسلم رہنماؤں کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ گورنمنٹ مسجد کا مسمار کیا گیا حصہ پھر سے تعمیر کرا دے گی، اس طرح کہ سڑک کے کنارے کے

محرابوں کے اوپر فرش بنا دیا جائے۔ اس کے عوض شہر کے مسلمانوں سے مقدمات واپس لے لئے جائیں گے۔ اس سمجھوتے کو مسلمان لیڈروں نے تو مان لیا لیکن مسلمانوں کے ایک طبقے میں زبردست ناراضگی پھیل گئی۔ مظہر الحق کے خلاف تو سخت تنقید کی گئی، اخباروں میں انہیں برا بھلا کہا گیا۔ لیکن ہوا یہ کہ اس واقعے کے بعد وہ اگلی صف کے مسلم مجاہدین آزادی جیسے علی برادران، مولانا حسرت موہانی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مختار انصاری وغیرہ کے اہم ساتھیوں میں شمار ہونے لگے۔

کانگریس کی نمائندگی لندن میں

18/اپریل 1914ء کو آپ کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے لندن گئے۔ اس کے بعد انہوں نے ترکی کا دورہ کیا جہاں انہوں نے خلیفۃ المسلمین اور دوسری اہم شخصیات سے ملاقات کی۔ اس سفر سے حاصل شدہ معلومات نے خلافت تحریک میں اہم کردار ادا کیا۔

1917ء تک وہ کانگریس اور مسلم لیگ کی مشترکہ جدوجہد کے مسلمہ رہنما بن چکے تھے۔ بہار کانگریس اور مسلم لیگ کی ذمہداریوں کے ساتھ مرکزی سیاست میں بھی ان کی سرگرمیاں بڑھتی گئیں۔

1917ء میں ہوم رول تحریک میں انہوں نے زبردست حصہ لیا۔ انہوں نے خاص طور پر ریاست بہار میں بغاوت کا طوفان برپا کر دیا تھا۔ گیا شہر میں ہوم رول کا جھنڈا پھیرانے میں ایک مقامی کانگریس کارن درگا پرساد پر کی گئی سرکاری کارروائی پر زبردست ہنگامہ ہوا۔ ہوم رول کا یہی ترنگا جھنڈا کانگریس کا پرچم تسلیم کر لیا گیا جس پر چرخے کے نشان کا اضافہ بعد میں ہوا۔

ترکوں سے ہمدردی کا اظہار

خلافت تحریک میں مولانا مظہر الحق اور بہار کے مسلم علماء وعمائدین کا تعاون بیحد موثر تھا۔ تحریک خلافت میں ریاست بہار کے اشتراک کے حوالے سے نامور صحافی اور ادیب ڈاکٹر منور حسن کمال لکھتے ہیں:

''اما کن مقدمہ سے متعلق بہار کے مسلمانوں میں بھی حکومت کے خلاف ناراضگی اور بیزاری کا کھلا ہوا اظہار بہت عام تھا۔ اس وقت کے حساس مسلم نوجوانوں میں ان اسلام ازم اور ترکوں سے عقیدت کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ وہ مصلحتوں سے بے نیاز ہوکر علی العموم ترکوں کے ساتھ اپنی ہمدردی کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ رائے عامہ کا دباؤ اتنا مضبوط تھا کہ ڈر سے وفاداری کا اظہار کرنے والوں کو تو چھوڑیئے دل سے حکومت کی خیر خواہی کرنے والے سرکار پرست رہنما بھی ترکی پر تنقید کرتے ہوئے اپنے کو اس کا ہمدرد ظاہر کرتے تھے۔ لیکن حقیقی کام کرنے والوں پر حکومت کی نظر بہت سخت تھی۔ اسی بنیاد پر تحریک خلافت کے رہنماؤں، محمد علی جوہر، شوکت علی، حسرت موہانی، ظفر علی خاں، ابوالکلام آزاد اور اس طرح کی سرگرمیوں سے وابستہ دوسرے رہنماؤں کو نظر بند کر دیا گیا تھا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن نے اس سلسلے میں بہار کے اندر بھی اپنے مراکز قائم کئے تھے اور مسلح بغاوت کی ان کی اسکیم کے تحت نجات دہندہ فوج تیار کرنے کا جو منصوبہ تھا، اس کے تحت بہار میں حسب ذیل مقامات پر مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنے تین لیفٹیننٹ مقرر کئے۔ مولوی عبد العزیز رحیمی آبادی دربھنگہ، مولوی عبد اللہ غازی پوری آرہ، مولوی عبد الرحیم عظیم آبادی پٹنہ، برطانوی حکومت کے ترکی کے خلاف جنگ میں شرکت کے اعلان کے بعد مولانا محمد علی جوہر اور ابوالکلام نے کئی مرتبہ بہار کا دورہ کیا تھا۔ بہار کے مسلمانوں میں ترکی کی جنگ کے

خلاف پہلے ہی بہت جوش اور غصہ تھا، ان میں حکومت کے خلاف بے زاری اور برہمی پیدا کرنے میں اصل ہاتھ مولوی مظہر الحق کا تھا۔ اس وقت وہ بہار کے سب سے بڑے عوامی رہنما تھا۔ صرف بہار کے نہیں برادران وطن کے بھی۔ مولوی صاحب نے پورے بہار کا دورہ کیا جگہ جگہ جلسے کئے اور ترکوں کا مسئلہ عوام کے سامنے پیش کیا۔ چنانچہ جنگ بلقان کے وقت ترکوں کی امداد کے سلسلے میں عام لوگوں نے بڑی فراخدلی کے ساتھ ان سے تعاون کیا۔

اس وقت مسلمانوں کے اندر نئی بیداری کی لہر پیدا کرنے میں مولوی مظہر الحق کے علاوہ مولوی فخر الدین، چودھری کرامت حسین، خان بہادر سرفراز حسین خاں، ڈاکٹر سید محمود (مولانا مظہر الحق کے قریبی عزیز) اور عبد الوہاب نے بھی بڑی دلیری اور جوش سے کام لیا۔ مولوی مظہر الحق کا اذہن اس معاملے میں اتنا صاف تھا اور وہ خود اعتمادی سے اتنے بھرے ہوئے تھے کہ کانگریس کے پٹنہ اجلاس میں اجلاس میں مجلس استقبالیہ کے صدر کی حیثیت سے جو خطبہ پڑھا تھا اس میں بھی اسلامی ممالک پر مغربی اقوام کی طرف سے کی جانے والی زیادتیوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ مغربی قوموں نے صاف صاف جہاد (Crusade) کا نعرہ دیا ہے۔ یہ لڑائی ترکی کے خلاف نہیں بلکہ اسلام کے خلاف یورپ کی لڑائی ہے'' (تحریک خلافت اور جدوجہد آزادی)

مظہر الحق ایک عظیم وطن پرست

2/جنوری 1939ء کو وہ اس جہاں فانی سے رخصت ہوئے۔ مولانا مظہر الحق رحمۃ اللہ علیہ کے قومی سیاست سے الگ ہوجانے کی وجہ کا کچھ اشارہ مہاتما گاندھی کے اس تعزیتی خط سے ملتا ہے جو انہوں نے انکی رحلت پر منیرہ بیگم کو لکھا تھا:

''مظہرالحق ایک عظیم وطن پرست، ایک سچے مسلمان اور مفکر تھے۔ وہ عیش وآرام کے شائق تھے لیکن جب عدم تعاون تحریک میں حصہ لیا تو انہوں نے آسائش کے تمام لوازمات کو اس طرح خود سے الگ کر دیا جیسے ہم اپنے بدن سے مردہ کھال کی پپڑی نوچ کر پھینک دیتے ہیں وہ درویشی کے بھی اتنے ہی شوقین تھے جتنے شاہانہ زندگی کے تھے۔ ہماری اندرونی مناقشت سے دکھی ہو کر وہ گوشہ نشیں ہو گئے تھے اور ایسی نظر نہ آنے والی خدمت کرنے لگے جو وہ کر سکتے تھے، وہ سب کی بھلائی کے لئے دعائیں کرنے لگے''۔

☆☆☆

ایڈوکیٹ شہید شاہد اعظمیؒ [۲۳]

.....شاہد اعظمی، آبائی وطن.....ابراہیم پور محمد آباد اعظم گڑھ، والد گرامی.... انیس احمد اعظمی، والدہ محترمہ.....ریحانہ اعظمی، سابقہ سکونت ومقام ولادت گوونڈی ممبئی موجودہ رہائش مع اہل خانہ.....ٹیکسی مینس کالونی کرلا ممبئی، برادران..... عارف، طارق، راشد، خالد، بہن کوئی نہیں۔ رنگ گورا ملیح ،شکل وصورت انتہائی خوبصورت تعلیمی لیاقت....انگلش میڈیم سے ہائی اسکول، بی۔اے، ایل۔ایل۔بی، ایل۔ایل۔ایم، مشغلہ ممبئی ہائی کورٹ میں وکالت ،تاریخ ولادت 1978ء تاریخ شہادت 11/فروری 2010 شب جمعہ بوقت ساڑھے سات بجے، شہادت کے وقت عمر 32 سال، مقام شہادت...اپنی ذاتی آفس ٹیکسی مینس کالونی کرلا ممبئی نماز جمعہ میں شرکاء کی تعداد کم وبیش دس ہزار، نماز جنازہ امام وخطیب مسجد ٹیکسی مینس کالونی مفتی رضوان اللہ صدیقی صاحب نے پڑھائی ،تدفین قریش نگر کے قبرستان میں عمل میں آیا۔ایڈوکیٹ شاہد اعظمی شہید کی مختصر سی زندگی بچپن ہی سے مختلف ناگفتہ بہ حالات اور گوناگوں حادثات سے دوچار رہی، بچپن ہی میں والد کی شفقت کا سایہ اٹھ گیا والدہ نے انتہائی صبر واستقلال، عزم وہمت کے ساتھ اپنے اس ہونہار بچے کی

۲۳ امام وخطیب مسجد ٹیکسی مینس کالونی، ریاض الجنۃ، اپریل-2010ء

بہترین تربیت کی تعلیمی اخراجات نانا نے برداشت کئے، ابھی وہ اپنی تعلیم کے ابتدائی مراحل میں تھے کہ 1992ء میں ممبئی کے اندر منظّم پلاننگ کے تحت مسلم کش فساد کی آگ بھڑکائی گئی اور دیکھتے دیکھتے ممبئی کا تمام مسلم اکثیرتی علاقہ فساد کی زد میں آ گیا، فساد کے وقت شاہد اپنی والدہ اور بھائیوں کیساتھ ممبئی کے کثیر مسلم آبادی والے علاقہ گوونڈی میں سکونت پذیر تھے جہاں پر مسلمانوں کا بہت زیادہ جانی و مالی نقصان ہوا تھا۔ شاہد اعظمی کی عمر اس وقت تقریباً چودہ پندرہ سال رہی ہوگی اپنی اس کم عمری کے باوجود مسلمانوں کا قتل عام اور مالی نقصان دیکھ کر تڑپ اٹھے، لہٰذا انہوں نے اپنی بساط کے مطابق لٹے پٹے اور زخم خوردہ مسلمانوں کی مدد کا بیڑہ اٹھایا۔ مسلمانوں کے حالات جاننے، اور انہیں کن کن چیزوں کی ضرورت ہے معلوم کرنے کے لئے جہاں تک ہوسکا بے خوف وخطر ایسے ایسے علاقوں میں گئے جہاں پر بڑے بڑے جیالے جانے سے کانپتے تھے۔

شاہد اعظمی کی پر جسارت اور رہمت فرقہ پرست پولیس کو نہیں بھائی اور ایک فرضی کیس بنا کر ٹاڈا کے تحت انہیں گرفتار کرلیا، اور پانچ سال کیلئے انہیں تہاڑ جیل میں ڈال دیا، ٹاڈا کی تاریخ میں یہ سب سے کم عمر ملزم تھے۔ اسکے باوجود ظالم پولیس نے اس معصوم پر ظلم وتشدد کی انتہا کردی یہیں سے شاہد کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ قربان جایئے شاہد اعظمی کے عزم وحوصلہ کو کہ انہیں انتہائی تکلیف دہ حالات کا سامنا کرنا پڑا مگر عزم وحوصلہ کی چٹان بن کر بارہویں اور بی۔ اے کی تعلیم مکمل کی پانچ سال بعد انتھک کوششوں سے بفضلہٖ تعالیٰ رہائی ملی، جیل سے باہر آئے تو گریجویٹ ہو چکے تھے ایک سال جرنلسٹ کا کورس بھی کیا تھا بہر حال جیل کی صعوبت نے اس نازک سونے کو تپا کر کندن بنا دیا تھا اور انہوں نے کچھ کرنے کا عزم بالجزم کرلیا، اب نئی تاریخ رقم کرنے کا پروگرام بنالیا، چنانچہ اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہناتے ہوئے

ممبئی کے کسی لاء کالج میں داخلہ لیکر LLB-LLM کی ڈگری حاصل کی اوت باضابطہ بار کونسل کا ممبر بن کر ممبئی ہائی کورٹ میں وکالت شروع کردی۔ جیل کے اندر انہوں نے بے قصور مسلمانوں کی اذیت ناک زندگی کا بچشم خود مشاہدہ کیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیس لڑنے کو ترجیح دی جو غریب لاچار اور مجبور مسلمانوں سے متعلق تھا۔

مسلمانوں کے ساتھ پولس کی زیادتی

ہندوستان کے مختلف شہروں خصوصاً ممبئی واطراف میں ہونے والے بم دھماکوں میں جس طرح آنکھ بند کر کے مسلمانوں کو گرفتار کرنا اور بغیر کسی ثبوت کے جیل کی سلاخوں میں ڈال کر ان کی زندگی کے بہترین ماہ وسال کو برباد کردینا، آج کی پولیس اور انتظامیہ کا بہترین مشغلہ ہے شاہد ایسے ہی مسلم نوجوانوں کا کیس بغیر فیس کے لڑتے تھے جب کہ اس طرح کے کیس کے فیس ایک تاریخ پر لاکھ سے کم نہیں ہوتی وہ تقریباً اس طرح کے ڈیڑھ سو کیس تنہا لڑ رہے تھے۔ مزید برآں وہ اپنے موکلین کے والدین کا مالی تعاون بھی کرتے تھے، یوں تو وہ غریب اور مظلوم کی مدد کرتے تھے خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم ہر وقت تیار رہتے تھے۔

لیکن خاص طور سے انہوں نے اپنی وکالت کی قلیل مدت میں زیادہ تر کیس ان بے قصور مظلوم مسلم قیدیوں کے ڈیل کئے جن کا کوئی پرسان حال نہیں تھا ان کیسوں میں کامیاب پیروی کی جس کے نتیجہ میں بہت سے مسلم قیدی باعزت بری بھی ہوئے وہ جمعیۃ العلماء مہاراشٹر کے قانونی مشیر بھی تھے اور جمعیۃ کا بہت سے کیس کی پیروی کررہے تھے بہت سے کیس میں سرکاری وکلا اور حکومت کو منھ کی کھانی پڑی یہی سب وجوہات تھیں جس کی بنا پر ہندو دہشت گرد تنظیمیں اور سرکاری مشنریاں بوکھلا گئیں۔

شاہد اعظمی کو شہید کر دیا گیا

ابھی شہادت سے قبل ممبئی کے 11/26 بم بلاسٹ کے ایک فرضی ملزم فہیم انصاری باعزت بری ہو جائے اور ساتھ ہی ہندوستان کی ہندو دہشت گرد تنظیموں سے لے کر امریکہ اور اسرائیل کی سی آئی اے اور موساد کی دہشت گردی اور 11/26 کے اصل مجرمین کے گھناؤنے چہرے بے نقاب ہو جائے لیکن ایسا ہوتا ہوا دنیا کے بڑے بڑے سفید پوش دہشت گرد اسے کیسے دیکھ سکتے تھے اس لئے جس طرح اصل ہندو دہشت گردی کے نیٹ ورک کو پہلی مرتبہ بے نقاب کرنے والے اے ٹی ایس چیف کرکرے کو راستہ سے ہٹا دیا اسی طرح شاہد اعظمی جو قانونی لڑائی کے ذریعہ دنیا کے ان خونخوار بھیڑیوں کے بھیانک چہروں کو بے نقاب کرنے والے تھے انہیں بھی انتہائی آسانی سے اپنے راستہ سے ہٹا دیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ایڈوکیٹ شہید اعظمی کو دھمکی

ایڈوکیٹ شاہد اعظمی نے اپنے لئے جس راستے کا انتخاب کیا تھا وہ کانٹوں سے پر تھا قدم قدم پر خطرات تھے آگ کا ایک دریا تھا جسے وہ بے خوف خطر عبور کر رہے تھے وکالت کے دوران اے ٹی ایس کے معزول چیف رگھونشی کی طرف سے دھمکی ملی ہندو مافیاؤں نے ڈرایا کہ جو کیس لڑ رہے ہو اسے چھوڑ دو ورنہ پچھتاؤ گے۔ مگر شاہد اعظمی نہ تو کسی دھمکی سے مرعوب ہوئے نہ کسی ہندو مافیا کا خوف دل میں آیا بلکہ ان دھمکیوں نے انہیں اور زیادہ قوت بخشی، وہ بظاہر ایک وکیل تھے مگر حقیقت میں ایک مجاہد عظیم تھے وہ دیکھنے میں ممبئی ہائی کورٹ میں وکالت کر رہے تھے مگر حقیقت میں وہ ہندو دہشت گردوں کے خلاف جنگ لڑ رہے تھے وہ فرقہ پرست آر

ایس ایس جیسی تنظیموں کا تنہا مقابلہ کر رہے تھے۔ وہ ہندوستان کی درندہ صفت تنظیم انٹیلی جنس بیورو، امریکہ کی سی آئی اور اسرائیل کی موساد سے نبرد آزما تھے، قوم وملت کے وقار کی حفاظت کے لئے اور بے قصور مسلم قیدیوں کی رہائی کے لئے انہوں نے اپنی جان کو وقف کر دیا تھا، چنانچہ اپنے دوست واحباب سے کہا کرتے تھے میری موت طبعی نہیں ہوگی شہادت سے چند روز قبل ان کی امی نے کہا کہ بیٹے شادی کے بعد آپ کی ذمہ داری بڑھ جائے گی گویا وہ کہنا چاہ رہے تھے کہ میں بہت جلد شہید کر دیا جاؤں گا اس لئے میرے بعد بال بچوں کی ذمہ داری آپ پر آجائے گی، وہ اپنی والدہ سے بہت پیار کرتے تھے والدہ بھی اپنے تمام بچوں میں انہیں بہت چاہتی تھیں۔ الغرض شاہد اعظمی اپنی بے لوث خدمت وقربانی سے ملت کے کروڑوں مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئے تھے، پانچ سالہ وکالت کی قلیل مدت میں شہرت، عزت اور محبوبیت کی جس بلندی پر پہونچ گئے اس کی مثال نایاب نہیں تو کامیاب ضرور ہے۔ ان کے سامنے بڑے بڑے نامی گرامی وکلاء نظر آرہے تھے۔

اعظمی کی شہادت پر رنج وملال

یہی وجہ ہے کہ شہادت کی خبر سن کر ہر ایک دم بخود تھا، بوڑھے، جوان، بچے، مرد وعورت، شناسا، ناآشنا ہر ایک آنسو بہا رہا تھا۔ اور ان کے والدین اور بھائیوں کا حال پوچھئے جن کے بیٹوں اور بھائیں کا وہ کیس لڑ رہے تھے جنہیں امید ہو چکی تھی کہ اب ہم کیس جیت جائیں گے شہادت کی خبر سن کر ان کا برا حال تھا کیوں کہ شاہد ان کے لئے کسی فرشتہ سے کم نہیں تھے، بہر حال شہادت کی خبر سن کر تعزیت کرنے والوں کا تانتا لگ گیا اور یہ سلسلہ تقریباً ایک ماہ چلتا رہا اور ابھی تک جاری ہے۔ جنازہ میں انسانیت کا سیلاب امنڈ آیا، کسی جنازے میں اتنی بڑی تعداد کم از کم ممبئی میں ابھی تک

دیکھنے میں نہیں آئی، جنازہ جلوس کی شکل میں فرافت کے ساتھ احتجاج کرتا ہوا بہت شان سے اٹھایا گیا فضا نعرۂ تکبیر سے گونجتی رہی اور بالآخر ہر ایک طرح ان کی آخرت کی پہلی منزل تک پہونچا دیا اس طرح نوشتۂ تقدیر پورا ہوا۔ شاہد اعظمی کی دلی خواہش پوری ہوئی، جام شہادت سے سرشار ہو کر اپنے چاہنے والوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر محبوب حقیقی کے وصال سے شاداں ہیں لیکن جاتے جاتے انہوں نے ملت کے نوجوانوں کو یہ پیغام دید دیا کہ میرے دوستو! حالات چاہے کتنے ہی سنگین کیوں نہ ہوں حالات سے لڑنا سیکھو، اور مشکل ترین حالات میں مایوسی کو قریب نہ آنے دو، اور قوم وملت کی آبرو اور وقار کے لئے اگر جان کا نذرانہ پیش کرنا پڑے تو پیچھے مت ہو بلکہ بڑھ کر جان دیدینا اپنی سعادت سمجھو کہ یہی مرد مومن کا شعار ہے۔

بہر کیف شاہد اعظمی کے جذبۂ خدمت خلق، ایثار وقربانی، جرأت وبے باکی، عزم واستقلال، مصائب وآلام میں ثابت قدم رہنا، دشمنوں کیلئے شمشیر بے نیام ہونا وغیرہ جیسے اوصاف حمیدہ کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا اس قدر دنیا سے جلد چلے جانا ملت اسلامیہ کا عظیم ترین اور نا قابل تلافی خسارہ ہے۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ اپنے خزانۂ لامحدود سے کوئی اس سے زیادہ بیش بہا موتی پیدا کر دے، جو ملت کی آبرو کیلئے سینہ سپر ہو جائے۔

☆☆☆

آمنہ قریشی اور بہن ریحانہ [۲۴]

دنیا کا عظیم سیکولر جمہوری ملک ہندوستان بابائے قوم مہاتما گاندھی کی تاریخی جدوجہد اور فلسفۂ عدم تشدد کے ذریعہ ملک کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لئے ہمیشہ یاد رکھے گا۔ گاندھی جی 1869ء میں پور بندر (گجرات) میں پیدا ہوئے۔ وطن میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد مزید اعلیٰ تعلیم کے لئے 1888 میں انگلینڈ گئے۔ 1891ء میں وہ بیرسٹر بن کر ہندوستان لوٹے اور وکالت شروع کی لیکن انہیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔ 1893ء میں انہیں جنوبی افریقہ کے ایک بڑے بزنس مین سیٹھ عبد اللہ نے اپنی کمپنی کے قانونی کاموں کے لئے بلایا۔ یہ ملک بھی برطانیہ کا غلام تھا۔ انگریز وہاں کے سیاہ فام باشندوں اور اس ملک میں جا کر بس گئے ہندوستانیوں کے ساتھ غیر انسانی برتاؤ اور وحشیانہ مظالم کرتے تھے۔ گاندھی جی نے 1894ء میں انگریزوں کے شرمناک نسلی امتیاز اور سیہ فام قوموں کے ساتھ نفرت وتعصب کی پالیسی کے خلاف تحریک شروع کی جو 1914ء تک جاری رہی۔ جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کی جدوجہد تاریخ عالم کا نا قابل فراموش باب ہے۔ جس وقت جنوبی افریقہ میں گاندھی جی سفید فام قوم کی نسلی کمینگی کے خلاف صف آرا ہوئے تو وہاں آباد

۲۴ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ

ہندوستانیوں میں ایک سرکردہ شخصیت امام عبدالقادر کی تھی جو وہاں گھوڑوں کے بڑے تاجر تھے اور شاہانہ انداز میں زندگی گزار تھے تھے۔ وطن کی محبت میں سرشار ہوکر وہ گاندھی جی کی تحریک سے وابستہ ہوگئے اور اپنی اہلیہ جمن بی اور دو بیٹیوں فاطمہ اور آمنہ کے ساتھ اس طرح گاندھی جی کے رفیق اور جاں نثار ہوئے کہ اپنا کاروبار، تمول اور عیش وعشرت سب کچھ چھوڑ کر پوری طرح گاندھی وادی ہوگئے۔

آمنہ کی خدمات کا تذکرہ

امام صاحب کے ایثار وقربانی اور ان کی بیٹیوں، بالخصوص چھوٹی بیٹی آمنہ کی خدمات کا تذکرہ کانگریس کی تاریخ اور گاندھی جی کی تحریروں میں موجود ہے لیکن اپنی وطنی اور ملی تاریخ سے ہماری عدم توجہی یا پھر تقسیم کے بعد پنپنے والی متعصّبانہ سیاست کا یہ کرشمہ، کہ بہت کم لوگ اس بارے میں جانتے ہیں۔ ہماری موجودہ نئی پیڑھی تو خیر بالکل بھی واقف نہیں۔ افریقہ میں گاندھی جی کی بیس سالہ جدوجہد میں امام عبدالقادر اور ان کی اہلیہ وبیٹیوں کی خدمات اور ایثار کا دائرہ افریقہ کے فینکس آشرم سے لے کر گجرات کے سیواگرام اور سابرمتی آشرم تک پھیلا ہوا ہے اگرچہ عوام تک پہنچنے والے نصابی اور اطلاعاتی لٹریچر کے ساتھ ساتھ ملکی ذرائع ابلاغ میں گاندھی جی کے تذکار میں بہت سی غیر مسلم خواتین یہاں تک کہ ان کی یوروپین چیلیوں کے حالات تفصیل سے ملتے ہیں مگر امام عبدالقادر اور ان کی بیٹیوں کا ذکر شاید جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا جن کے بارے میں خود مہاتما گاندھی نے لکھا ہے: ''امام صاحب کا گھر انگریزی وضع پر آراستہ تھا۔ ان بچیوں کی پرورش بھی اسی عیش وعشرت کے ماحول میں ہوئی تھی۔ وطن کی آزادی کے لئے عیش وآرام کی زندگی ترک کر دینا بیحد دشوار کام ہے۔ لیکن امام عبدالقادر اور ان کی ناز ونعم میں پلی اولاد نے آزادی کی جنگ میں حصہ لینے کے

لئے سب کچھ چھوڑ دیا۔ اپنی تجارت بند کر کے وہ فینکس میں ہمارے ساتھ آشرم میں رہنے لگے۔ امام صاحب کی زوجہ جمن بی صاحبہ، فاطمہ اور آمنہ چاروں آشرم کے چھاپہ خانے میں کام کرتے تھے۔ حالانکہ امام صاحب کی صحت ٹھیک نہیں تھی مگر وہ روزانہ پانی کی بالٹیاں پچاس فیٹ اونچی عمارت کی سیڑھیاں چڑھ کر پہنچایا کرتے تھے۔ امام صاحب ان کی اہلیہ اور بیٹیاں بہت دیندار اور نماز روزہ کی پابند تھیں۔ امام عبدالقادر کو کئی بار پولیس نے گرفتار کیا، ان کے کنبے نے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں مگر کبھی شکوۂ حالات نہیں کیا۔ 1914 میں یہ سب ہمارے ساتھ ہی ہندوستان آئے اور سیواگرام میں ساتھ ہی رہے۔ میری خواہش ہے کہ امام صاحب سے متعلق سبھی اشخاص اپنی اپنی یادوں کو تحریر کر لیں۔ اور انہیں یکجا کر کے مرتب کر لیں''۔

آشرم میں شادی کا اہتمام

امام صاحب اور مہاتما گاندھی کے مابین اپنائیت کا کیسا رشتہ تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ امام صاحب کی بڑی صاحبزادی کی شادی گاندھی جی کی سرپرستی میں سابرمتی آشرم میں ہی 2/اپریل 1920ء کو انجام پائی۔ شادی کا دعوت نامہ گاندھی جی کی طرف سے ہی تھا جس میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد درج تھا: ''عزیزہ فاطمہ جو کہ میرے عزیز دوست امام عبدالقادر کی بیٹی ہے، کی شادی 26/ اپریل 1920ء بوقت سات بجے شام ہونا قرار پائی ہے۔ اس سے پہلے ساڑھے چھ بجے میلاد شریف ہوگا۔ آپ سے گزارش ہے کہ تقریب میں شریک ہوکر دولہا ودلہن کو اپنی دعاؤں سے نوازیں۔ آپ کا موہن داس کرم چند گاندھی''۔

شادی کا ذکر کرتے ہوئے 9/مئی 1920ء کے 'نوجیون' میں گاندھی جی نے لکھا تھا: ''شادی کی رسم دو گھنٹے چلی، سب کی پھلوں اور شربت سے تواضع کی گئی، رخصتی

کے وقت فاطمہ رونے لگی تو اس سے کہا گیا کہ اب اس کا فرض یہ ہے کہ وہ سودیشی اور قومی خدمت کے پیغام کو اپنے نئے گھر میں عام کرے''۔

''جنگ آزادی میں ممتاز علماء اور مسلم خواتین کا کردار'' کے مولف خان عبد الودود خان نے مستند حوالوں کے ساتھ لکھا ہے کہ امام عبدالقادر کی بیٹی آمنہ نے آزادی کی تحریک میں آگے بڑھ کر حصہ لیا۔ آمنہ کی شادی 31/مئی 1924ء کو گجرات کے ہی ایک نوجوان غلام رسول قریشی سے ہوئی جس کے بعد وہ آمنہ قریشی کہی جانے لگیں۔ آمنہ کی شادی پر بھی دعوتی کارڈ گاندھی جی کی طرف سے تھا۔ ڈانڈی مارچ میں آمنہ اور ان کے شوہر غلام رسول قریشی نے شرکت کی۔ ان دنوں امام عبدالقادر بیمار تھے۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے ستیا گرہ کے پہلے دستے کی پیشوائی کی اور پولیس کے وحشیانہ مظالم کا پامردی سے مقابلہ کیا۔ امام صاحب اور ان کے داماد غلام رسول دونوں گرفتار ہوئے۔ آمنہ نے بھی ستیا گرہ کر کے گرفتاری دینی چاہئے تو گاندھی جی نے انہیں یہ کہہ کر منع کر دیا کہ ''تم آشرم میں رہ کر کام کرو''۔

16/جولائی 1930ء کو آمنہ قریشی ایک بچی کی ماں بنیں۔ اس وقت ان کے والد اور شوہر دونوں جیل میں تھے۔ گاندھی جی نے خود انہیں خط لکھ کر مبارکباد دی تھی۔ انہوں نے غلام رسول قریشی کو لکھا۔ ''میں نے بیٹی آمنہ کو لکھ دیا ہے کہ وہ آزاد رہ کر اپنی بچی کی پرورش اور آشرم کی دیکھ بھال کرتی رہے''۔

امام عبدالقادر کا انتقال

امام عبدالقادر کی صحت جیل میں بہت خراب ہوگئی، اس لئے وہ رہا کر دئے گئے۔ 9 دسمبر 1930ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ 17/دسمبر 1930ء کے 'نوجیون' میں گاندھی جی نے لکھا: ''مجھے امام صاحب کی وفات کا گہرا صدمہ ہے۔ افسوس یہ ہے کہ

ان کا انتقال میرے ان تک پہنچنے سے قبل ہوگیا''۔ گاندھی جی نے اس تحریر میں آگے لکھا ہے: ''امام صاحب اور ان کے خاندان نے شاندار اور فارغ البالی کی زندگی کو چھوڑ کر وطن کی آزادی کے لئے قید و بند کی صعوبتوں کو پسند کیا۔ پہلے امام صاحب کی اہلیہ اور بڑی بیٹی فاطمہ کا انتقال ہوا اور اب وہ خود دنیا سے رخصت ہوگئے۔ لیکن ان کی یادگار بیٹی آمنہ اور داماد غلام رسول قریشی ہمارے آشرم میں ہیں''۔ جس وقت گاندھی جی نے گجرات کی عورتوں کو تحریک میں عملی طور پر شامل ہونے کی اجازت دی تو آمنہ قریشی اس دستے کی لیڈر تھیں۔ جس میں شامل عورتوں نے شراب اور ولایتی سامان کی دکانوں پر پکیٹنگ کی۔ آمنہ کے ساتھ ریحانہ طیب جی اور حامدہ بہن بھی تھیں۔ نوساری میں آمنہ کو گرفتار کیا گیا۔ انہیں چھ ماہ کی سزا ہوگئی۔ ان کے جیل جانے کے بعد ان کی بچی کو انسوئیا بہن کے ہریجن آشرم میں رکھا گیا۔ آمنہ پرجوش ستیا گرہی تھیں وہ وقفے وقفے سے گرفتار ہوتی رہیں۔ گاندھی جی نے اپنے ایک خط میں آمنہ قریشی کو لکھا تھا: ''بار بار کی گرفتاری اور بچی کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ تحریک میں سرگرم حصہ لے کر تم نے بے مثال جرأت اور صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا ہے لیکن اگر امام صاحب کی بیٹی یہ سب نہ کرتی تو بھلا ہم کس سے اس کی توقع کر سکتے تھے''۔

ڈاکٹر کچلو کا خاندان

30/اکتوبر 1915ء کو ان کی شادی فخر قوم ڈاکٹر سیف الدین کچلو بارایٹ لا سے ہوئی۔ ڈاکٹر کچلو کا خاندان کشمیر سے ترک وطن کر کے بہت عرصہ پہلے امرتسر میں آباد ہوگیا تھا۔ انہوں نے وکالت کا پیشہ چھوڑ کر کانگریس اور تحریک خلافت کے لئے خود کو وقف کر لیا تھا۔ سعادت بانو کچلو نے اس دشوار گزار سفر کے ہر مرحلے پر اپنے شوہر کا ساتھ دیا۔ 1920ء کی تحریک عدم تعاون کے سلسلے میں جب ڈاکٹر کچلو گرفتار

کر لئے گئے تو سعادت بانو گھر کی چہار دیواری سے نکل کر خود بھی آزادی کی تحریک میں شامل ہوگئیں۔ انہوں نے ڈاکٹر کچلو کے قائم کردہ سوراج آشرم کی ذمہ داریاں یا سنبھالیں اور آل انڈیا ویمنس کانفرنس کی سرگرم رکن کی حیثیت سے انہوں نے عورتوں کے جلسوں میں اپنی پرجوش تقریروں سے انقلاب کی لہر پیدا کردی۔ ڈاکٹر کچلو شروع سے آخر تک ایک سرفروش سپاہی کی طرح عوامی جدوجہد میں مصروف رہے۔ انہوں نے اپنی اقتصادی حالت اور گھر کی طرف بہت کم توجہی۔ انہیں جو جائداد اپنے بزرگوں سے ملی تھی وہ بھی وطن کے لئے قربان کردی۔ بیگم کچلو اور ان کے بچوں نے سخت ترین مالی مشکلات کا سامنا کیا۔

لیکن اس محبّ وطن خاتون نے مردانہ وار ہر طرح کی صعوبتوں کو برداشت کیا لیکن حرف شکایت ان کی زبان پر نہیں آیا۔ آزادی کے بعد جس وقت کانگریسی رہنما آزاد جمہوری حکومت میں عہدوں اور مفادات کے حصول میں سرگرداں تھے ڈاکٹر کچلو نے عالمی امن کی بقا کے لئے کام کرنا شروع کردیا۔ انہوں نے وطن کے تئیں اپنے خلوص کو مادی مفادات کے قریب بھی نہیں جانے دیا۔

1948ء میں روس کے مارشل اسٹالن نے وارسا سے عالمی امن تحریک شروع کی تو ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے محسوس کیا کہ امن کی تحریک ہی تیسری دنیا کو سامراجیوں کی ایٹمی جنگ کی تباہ کاریوں سے بچاسکتی ہے۔ انہوں نے عالمی امن تحریک کے سلسلے کو کل ہند امن کانفرنس سے جوڑ دیا جس میں مشہور ادیب کرشن چندر، ملک راج آنند، آر کے کرنجیا اور رومیش تھاپر جیسے سرکردہ اصحاب شامل ہوگئے۔ فارورڈ بلاک اور بائیں بازو کی سیاسی جماتیں بھی اس تحریک میں شامل ہوگئیں اور امن تحریک کو بہت جلد عالمی حیثیت حاصل ہوگئی۔

ڈاکٹر کچلو کا نعرہ

ڈاکٹر کچلو سوشلسٹ ممالک اور ہندوستان کے مابے مفاہمت کیلئے بہترین رہنما تسلیم کئے جانے لگے۔ انکا نعرہ تھا: ''ہندوستان ہی دنیا کو جنگ سے بچا سکتا ہے۔'' 1952ء میں ہندوستانی امن تحریک نے کوریا میں جنگ کے خاتمے کے سوال پر عالمگیر تحریک چلائی اور ڈاکٹر کچلو امریکی جارحیت اور ایٹمی وجراثیمی جنگ کے خلاف آواز اٹھانے والے ہندوستان کے سب سے اہل لیڈر بن کر عالمی منظر نامے پر ابھرے۔ انہوں نے عالمی امن کیلئے دنیا بھر میں شہرت اور عزت حاصل کر کے ہندوستان کا نام روشن کیا۔

1952 میں انہیں روس کے سب سے بڑے اعزاز ''اسٹالن امن ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔ جس میں بہت بڑی رقم انہیں پیش کی گئی، لیکن اس عظیم انقلابی کے ایثار کی یہ انتہا تھی کہ وہ خطیر رقم انہوں نے ہندوستان امن کونسل کی نذر کردی۔ 1955ء میں پنڈت نہرو کے دورہ سوویت یونین اور پھر ہندوستان میں ارشل بلگاسن اور خرش چیف کی آمد، سوویت یونین اور ہندوستان کے مابین تاریخ ساز معاہدے میں ڈاکٹر کچلو کی لیاقت اور محنت شامل تھی۔ یہ تفصیلات اس جگہ اجمالی طور پر بیان کرنے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ ڈاکٹر کچلو اس ملک کے کتنے بڑے رہنما تھے جنہیں اس دور میں سب سے زیادہ بین الاقوامی شہرت حاصل تھی۔

1963ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اسکے بعد بیگم سعادت بانو نے اپنی زندگی کے آخری سات سال کس طرح گزارے یہ اس ملک کی خودغرض سیاست اور بے حسی کی شرمناک تصویر ہے۔ نامور دانشور پروفیسر عابدہ سمیع الدین کے الفاظ میں: ''ڈاکٹر

کچلو کے انتقال کے بعد یہ خاندان منتشر ہوگیا۔ روشن خیال ادیبہ وشاعرہ اور وسیع تناظر میں ہندوستان کی آزادی کا خواب دیکھنے والی بیگم سعادت بانو کچلو جب بیمار ہوئیں تو آزاد ہندوستان میں بغیر دوا وعلاج کے 18/اگست 1970ء کو اپنے مالک حقیقی سے جاملیں''۔

☆☆☆

جنوبی ہند کے نامور مؤرخ

محمود خان محمودؔ [۲۵]

جنوبی ہند کے نامور مؤرخ، مشہور زمانہ صحافی محمود خاں محمود کی شخصیت غیر معمولی صلاحیتوں اور اعلیٰ قدروں کا مجموعہ رہی ہے۔ اس ذات باوقار نے اپنی جہد مسلسل بھری زندگی میں یقیں محکم، عمل پیہم، بے باک کردار، غیرت وحمیت اور اصول پسند رویے سے ثابت کر دکھایا ہے کہ انتہائی مشکل اور مخالف حالات میں بھی اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے اولوالعزمی اور ثابت قدمی سے کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔ محمود خاں محمود ریاست کرناٹک کے منظر نامے ایک نامور اور مستند تاریخ نویس کے طور پر دیکھے جاتے ہیں۔ یوں تو ان کی جھولی میں کئی علمی کمالات آئے۔ وہ بیک وقت غزل گو شاعر، ناول نویس، بلند پایہ ادیب ونقاد بے باک صحافی اور نامور مؤرخ تھے۔ لیکن ان سب پر صحافت اور تاریخ کا رنگ غالب رہا۔ یہ دونوں موضوع ایک ہی شخصیت کے دو الگ رخ ہیں۔ دونوں پہلوؤں سے جب آپ نے قلم کے جوہر بکھیرے تو جنوبی ہند کی تاریخ کا ایک زمانہ آپکے علمی کارناموں سے عبارت ہوگیا۔

۲۵ راشٹریہ سہارا، 12/جون 2011ء

محمود خان کے آباواجداد

محمود خاں محمود جالنہ کے پٹھان قبیلے میں 21 جون 1888ء میں آنکھیں کھولیں۔ نام محمود خاں رکھا گیا۔ والد کا نام صفدر خان تھا۔ جو انگریزی فوج کے صوبے دار تھے۔ آبائی پیشہ سپہ گری تھا۔ والد ماجد 1896 میں وظیفہ یابی کے بعد سکندر آباد سے منتقل ہوکر بنگلور میں مقیم ہوگئے۔ اس وقت آپ کی عمر کوئی سات سال تھی۔ ابتدائی مرحلہ میں عربی کی تعلیم حافظ سید محمود صاحب، مالک مطبع فردوسی سے حاصل کی۔ اردو وفارسی کی تعلیم شہاب الدین سلیم اور قادر شریف بنگلوری سے پائی۔ یہ فن شاعری میں کمال کا عبور رکھنے کے ساتھ عالم وفاضل اور کہنہ مشق خطاط تھے۔ اس کے بعد آپ کو مدرسہ اسلامیہ میں داخل کردیا گیا جہاں سید غوث محی الدین سبزواری سے انگریزی اور عبداللہ حسین سے فارسی کا درس لیا۔ تعلیمی سفر جاری رکھنے کی غرض سے سینٹ جوزف کالج میں داخلہ لیا۔

یہاں انگریز اور ہندوستانی طلباء کو مشترکہ طور پر تعلیم دی جاتی تھی۔ برطانوی اساتذہ کی تدریسی خدمات اس ادارہ کو حاصل تھیں۔ ان میں تاریخ کے موضوع پر دسترس رکھنے والے اساتذہ میں فادر ویزاک، فادر ذی ویذ ڈور اور فادر شاملک بطور خاص جانے جاتے تھے۔ تاریخ کے یہ برطانوی اساتذہ بڑے آزاد نقاد اور حقیقت پسند تھے۔ سینسٹ جوزف کالج میں ان اساتذہ سے علمی استفادہ کا دور آپ کی زندگی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کالج میں زیر تعلیم رہنے کے دوران ہی محمود خاں کی علمی شغف میں ایک بھونچال سا آیا اور باضابطہ حصول تعلیم کی ڈگر سے بھٹک کر ایک نئی راہ اختیار کرلی۔ وہ راہ شعر وشاعری اور مضمون نگاری کا چسکہ تھا۔ جو تاحیات آپ کے ذوق ادب کی تسکین کا سامان بنا رہا۔ اس کا جادو ایسا سر چڑھ کر بولا

کہ حصول تعلیم کی رغبت پر حاوی آ گیا اور پھر دل میں حصول تعلیم کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہی۔ نتیجہ کے طور پر کالج کے امتحانات میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ بالآخر 1908ء میں کالج سے تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ پھر آپ کی اقلیم زندگی پر موضوع تاریخ اور صحافت کی حکمرانی قائم ہوگئی۔ اپنے ہتھیار قلم کو انہی دونوں موضوع کے تابع کر کے صفحات کے صفحات سیاہ کئے۔ یہاں تک کہ دونوں میدان عمل میں آپ کی حیثیت مسلم ہوگئی۔

محمود خان کے جذبات

تاریخ اور ادب وصحافت کے میدان میں آپ کے علمی کارناموں کی قدر ومنزلت اپنی جگہ مسلم ہے۔ لیکن ان کارناموں کے پیچھے کو عوامل کارفرما ہیں اور جن سے اس کام کی آپ کو ترغیب وتحریک ملی ہے۔ اگر اس کا ذکر نہ کیا جائے تو مضمون تشنہ رہ جائے گا۔ جب سوال یہ اٹھتا ہے کہ تاریخ کے موضوع سے آپ کو دلچسپی کیوں کر پیدا ہوئی اور اپنا زور قلم اس موضوع پر کیوں صرف کیا تو اس سوال کے جواب میں سینٹ جوزف کالج کا دور طالب علمی بطور خاص یاد کیا جاتا ہے۔ آپ کی حیات وخدمات پر جو تحریریں ملی ہیں ان میں تاریخ کے موضوع سے خصوصی دلچسپی کی کئی وجوہات بیان کی گئی ہیں۔ ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ جب آپ سینٹ جوزف کالج میں زیر تعلیم تھے۔ وہاں تاریخ کے ماہر اور آزاد نقاد اساتذہ سے علمی استفادہ کا موقع ملا۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ اساتذہ تاریخ پڑھاتے ہوئے ٹیپو سلطان کا جب ذکر آتا تو کہتے کہ ''انگریزوں نے ان پر بڑا ظلم کیا تھا۔ انہیں متعصب، تنگ نظر اور ہندوؤں کا دشمن قرار دے کر تاریخ سے بڑی ناانصافی کی ہے''۔ بتایا جاتا ہے کہ تاریخ سے فطری طور پر لگاؤ تھا لیکن اس واقعہ نے آپ کی آنکھ کھول دی۔ انگریزوں سے بغض وعناد کی جو چنگاری

اب تک دبی ہوئی تھی۔ اب کسک محسوس کرنے لگی۔ حضرت ٹیپو شہیدؒ سے عقیدت ومحبت کا دل میں ایک چشمہ پھوٹ پڑا۔ اس عقیدت ومحبت نے ایک عظیم فیصلہ لینے پر مجبور کر دیا۔ محمود خان صاحب نے دل میں ٹھان لی کہ تاریخ پر ملمع سازی اور تعصب کا جو گرد وغبار پڑا ہوا ہے، اسے وہ صاف کر کے تاریخ کا اصل روپ پیش کریں گے۔ محمود خاں صاحب نے جب اپنے اس اولوالعزمی کو عملہ جامہ کی شکل دینا شروع کیا خصوصاً جب حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ کی تاریخ رقم کرنے کا عزم لے کر چلے تو یکے بعد دیگرے تصنیفات کا ایک سلسلہ لگ گیا۔ ان کتابوں کی مقبولیت اور شہرت کا چرچا حدود ہند سے نکل کر مشرق ومغرب تک جا پہنچا۔ اس کارنامے نے آپ کو بھی حیات جاوید دے گیا۔

تاریخ کے موضوع سے دلچسپی

تاریخ کے موضوع سے دلچسپی کے ضمن میں یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ معسکر بنگلور چونکہ فوجیوں کا اڈہ تھا۔ فوجی افسروں کی ٹکڑیاں یہاں آئے دن جمع ہوتی رہتی تھیں۔ ان کے درمیان اسلاف کے تذکرے ہوتے رہتے تھے۔ ان میں ٹیپو سلطان شہیدؒ کے خلاف ارکاٹ کے نواب اور حیدر آباد کے نظام کی انگریزوں سے ملی بھگت، میر صادق، لنگڑا غلام علی اور پورنیا وغیرہ غداروں پر لعنت ملامت کی جاتی تھیں۔ اسی محفل میں محمود خان میں شعوری بیداری آئی اور ذہنی تربیت پائی۔ تاریخ کی طرف طبیعت کا میلان آج کل کی مروجہ تاریخ پر بے لاگ تنقید، تاریخ سلطنت خداداد کی وجہ تصنیف اور اس کے پیچھے کارفرما عوامل اور جو پرخلوص جذبات پنہاں ہیں، خود محمود خاں کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے: ہندوستان کی آج کل کی مروجہ تاریخیں اور خصوصاً عہد عالمگیر اورنگ زیب سے آج تک کی تاریخ کچھ اس طرح لکھی ہوئی ہے کہ صحیح حالات کا پتہ نہیں چلتا۔ اور ایک مورخ کو باوجود کوشش کے بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ

جن واقعات کو لکھ رہا ہے ان میں کس قدر صداقت ہے۔ آج کل جتنی تاریخیں مروج ہیں وہ تمام کی تمام ایک ہی رنگ میں اور ایک خاص مقصد کو لی ہوئی ہیں۔ یعنی ہندوستان کے قدیم طرز حکمرانی پر نکتہ چینی ہو اور دیسی حکمرانوں کی برائیاں کھول کھول کر دکھائی جائیں اور واقعات پر کچھ اس طرح پردہ ڈالا گیا ہے کہ اصل اور نقل کی تمیز ہی نہیں ہوتی۔ مدارس میں پڑھانے کے لئے ہر سال نئے نئے مورخین کی تصانیف پیش کی جاتی ہیں۔ مگر دراصل ایک دوسرے کی نقل ہوتی ہیں۔ اور مؤرخین کا مصنفین کا مقصد تحقیق نہیں بلکہ جلب منفعت ہوتا ہے۔ ان تاریخوں سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ ہندوستان کے متعلق جو نقش ایک ناظر کے دل پر بیٹھتا ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان طوائف الملوکی اور لوٹ مار کا جولانگاہ بنا ہوا تھا۔ انسانیت کے نام پر یہاں کے باشندوں کو اس ظلم وستم سے بچانے کے لئے جن میں وہ گرفتار تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس ملک پر قبضہ کر لیا۔ اگر ہندوستان کو اس کی حالت پر چھوڑ دیا جاتا تو آج یہ ملک چند وحشیوں کی مامن گاہ بنا ہوا ہوتا۔ بلکہ آج بھی انگلستان میں یہی کہا جاتا ہے کہ ہندوستان پر انگریزی قبضہ صرف ہندوستانیوں کی بھلائی کے لئے ہے۔ اس لئے کمپنی اپنا روپیہ اور خون بہا کر ہندوستان کی نجات کا باعث ہوئی۔ اور دوسرا الزام دیسی حکمرانوں پر یہ دیا جاتا ہے کہ ان میں حد درجہ مذہبی تعصب تھا۔ جس کی بنا پر انہوں نے غیر مذہب والوں پر تشدد کیا۔ اور اس سلسلہ میں علاوہ اورنگ زیبؒ اور ٹیپو سلطان شہیدؒ خاص طور پر ہدف ملامت بنے ہوئے ہیں۔

فرقہ وارانہ گندے اثرات

دراصل یہ اسی قسم کی تاریخوں کا اثر ہے جو بچوں کے دل میں سرایت کر کے انہیں ایک دوسرے سے عناد رکھنے کے لئے بچپن ہی سے آمادہ کر دیتا ہے اس لئے

ضرورت ہے کہ ہندوستان کی ایک صحیح اور اصل تاریخ لکھی جائے اور واقعی اگر دیسی حکمرانوں میں برائیاں موجود ہیں تو انہیں واضح طور پر دکھایا جائے۔ تاکہ دوسرے حکمرانوں کی آنکھیں کھلیں اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور انگریزوں کا دعویٰ کس حد تک حق بہ جانب ہے اور انہوں نے ملک پر قبضہ کرنے کے لئے کن وسائل سے کام لیا''۔ تاہم محمود خاں نئے سرے سے تاریخ ہند لکھنے کے سلسلے میں دو چند مشکلات کا ذکر کرنے کے بعد مزید لکھتے ہیں کہ ''مگر کچھ نہ کئے جانے سے بہتر ہے کہ کچھ کیا جائے اور اس کے لئے جو کچھ مواد مل سکتا ہے وہ ان تاریخوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے جن کو چند انصاف پسند مورخین نے لکھا ہے اور اس کے ساتھ ہی موجود تواریخ میں بھی بہت کچھ مواد ہے اور ایک نکتہ رس نظر اس ڈھیر میں بھی حق کو باطل سے علیحدہ کر سکتی ہے۔ ایک ہندوستانی تاریخ کی ضرورت کا شدت سے احساس کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک قوم کے لئے اس کی اپنی تاریخ کی جس قدر ضرورت ہے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے امید ہے کہ ہندوستانی مورخ اس ضروری اہم کام کو اپنے ہاتھ میں لیں گے۔ سلطنت خداداد میسور کی تاریخ بھی تاریخ ہندوستان کی ایک کڑی ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں مورخ ہوں اور نہ ادیب، صرف ایک فرض منصبی اور تاریخ کی اہمیت کا خیال کرتے ہوئے میں نے اس کتاب کی تصنیف اپنے ذمہ لی''۔

محمود خان کی شاہ کار تصنیف

تاریخ سلطنت خداداد محمود خاں محمود کی دوسری شاہکار تصنیف ہے۔ یہ 1935ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب اس قدر مقبول عام ہوئی کہ ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور بہت جلد پہلا ایڈیشن کا نسخہ ختم ہو گیا اور دوسرے اڈیشن کا تقاضہ سامنے آ کھڑا ہوا۔ 1939ء

میں دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس سلسلہ کی محمود خاں کی اولین تصنیف 'سلطان شہید' ہے جو 1928ء میں منصۂ شہود پر آیا۔ یہ ٹیپو سلطان شہیدؒ کی سوانحی کتاب ہے۔ اس کتاب کے ماخذ اس دور کی فارسی کی تاریخی کتابیں اور انگریزی میں تاریخ کی کتابیں ہیں۔ محمود خاں کو علامہ اقبال سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہے۔ ایک سفر کے موقع پر 29/جنوری 1929ء کو محمود خاں نے علامہ اقبال سے ان کے واپسی کے سفر میں اننت پور ریلوے اسٹیشن پر ملاقات کی اور کنٹگل اسٹیشن تک علامہ کی رفاقت نصیب رہی۔ اس دوران اپنی تصنیف 'سلطان شہید' علامہ کی خدمت میں پیش کی اور دوسرے مضامین بھی دکھائے۔

علامہ اقبال نے اسے سراہتے ہوئے مشورہ دیا کہ وہ سلطان پر ایک مستقل تصنیف پیش کرنے کی کوشش کریں۔ محمود خان نے علامہ کی اس بات کو سنجیدگی سے لیا اور اسے عملی شکل دینے کی کوشش میں جٹ گئے۔ چنانچہ محمود خاں اس کی بابت لکھتے ہیں ''میں نے اس نصیحت پر عمل کیا۔ تاریخ سلطنت خداداد پر مواد جمع کرنا اور لکھنا شروع کر دیا۔'' ان کی دیگر تصنیفات میں حیدر علی ہے جو 1938ء میں منصۂ شہود پر آئی۔ یہ ایک تاریخی ناول ہے جو حیدر علی کے عہد کے تاریخی احوال و واقعات کی عکاسی کرتا ہے۔ تاریخ جنوبی ہند جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، جنوبی ہند کی تاریخ پر اردو کی پہلی کتاب مانی جاتی ہے۔ 1939ء میں یہ کتاب شائع ہوئی۔

آپ کے علمی کارناموں کی چکا چوند چونکہ پورے برصغیر میں پھیل چکی تھی۔ چنانچہ ملک کے تقسیم ہونے کے بعد پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے ٹیپو سلطان کی فوجی اصلاحات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے پاکستان آنے کی پیش کش کی تھی۔ لیکن یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ جس سرسبز مین کی حفاظت کے لئے ٹیپو سلطان کو شہادت کی سعادت نصیب ہوئی اس سرزمین کو میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔''

محمود خاں محمود نے اپنی زندگی کے آخری ایام نہایت کسمپرسی میں گذارے، گھر میں مالی تنگی کا بسیرا تھا۔ لیکن جس طرح قلم کے دھنی تھے دل بھی اتنا کشادہ اور فراخ تھا۔ بڑے محنتی اور دیندار تھے۔ جذبہ ہمدردی اور تعاون کے جذبہ سے دل سرشار تھا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کو بھی ضرورت پیش آئی تو انہیں بھی مالی تعاون کیا۔ نیز اپنے اثر ورسوخ سے جہاں تک ممکن ہوا دوسروں کا تعاون کیا۔

محمود خاں محمود کو اپنی تصنیفات اور علمی کارناموں سے کوئی مالی منفعت نہیں پہنچا۔ جن ناشروں نے آپ کی کتاب شائع کی، آپ کی غیرت وحمیت کا ناجائز فائدہ اٹھا کر ہمیشہ وعدہ وعید میں ٹالتے رہے۔ اور ایک پیسہ کا مالی فائدہ نہیں پہنچایا۔ حالات جب بہت زیادہ دگرگوں ہوئے اور گزر بسر مشکل نظر آنے لگا تو پہلے کچھ کتابوں کو فروخت کر کے ضرورت پوری کی، لیکن اس سے کہاں تک ضرورت کی بھرپائی ہوسکتی تھی۔ چنانچہ حکومت ہند سے وظیفہ کا مطالبہ کیا۔ اس کے لئے وزیر خارجہ ہند اور وزیر تعلیم کو درخواست دی گئی۔ پھر اس سلسلے میں کئی بار خط وکتابت کا تبادلہ ہوا تب جا کر مشروط طور پر کہ اپنی تصانیف کا ایک ایک نسخہ وزارت تعلیم ہند کو بھیجیں، پھر اس پر غور کیا جائے گا۔ یہ شرط بھی پوری ہوئی۔ تب جا کر 25/اپریل 1957ء میں وزارت تعلیم ہند دہلی سے محمود خاں کو ایک خط موصول ہوا جس میں ماہانہ سو روپے امداد کی منظوری دی گئی تھی۔ وہ بھی صرف ایک سال تک کے لئے تھی۔ جنوبی ہند کی یہ سرمایہ افتخار شخصیت کسم پرسی اور مالی تنگی کے گرداب میں گزار کر 15/اکتوبر 1958 بہ مطابق یکم ربیع الثانی 1357ھ میں بہ وقت صبح آٹھ بجے اپنی قیام گاہ پر مالک حقیقی سے جا ملے۔ آپ کی عمر 71 سال تھی۔ قدوس صاحب قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

☆☆☆

غم خوارِ ملت مولانا محمد شفیع مونس رحمۃ اللہ علیہ [۲۶]

مرکز جماعت اسلامی ہند میں 6/اپریل 2011ء کو عجیب افسردگی کی کیفیت تھی۔ جماعت کے 93/سالہ بزرگ قائد اور ممتاز ملی رہنما 1944ء سے 2011ء تک مسلسل دین اور ملک وملت کی خدمت کرتے ہوئے اس طویل مدت میں جماعت اسلامی کے پلیٹ فارم سے فریضۂ اقامت دین کی ادائیگی کی بے مثال اور لازوال یادیں چھوڑ کر اپنے سفر آخرت پر رخصت ہو چکے تھے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا محمد شفیع مونس صاحب قابل رشک انداز میں موت سے ہمکنار ہوئے۔ وہ ایک انتہائی وفا شعار اور فرض شناس مسافر کی طرح آخری لمحے تک اپنے کارواں سے وابستہ اور تمام ہرودان شوق کی معیت میں رہے۔ مرکز جماعت اسلامی ہند میں 3 تا 7 اپریل کے لئے جاری اس کی مجلس نمائندگان کے اجلاس میں اپنی بزرگی اور تمام تر کمزوری کے باوجود مولانا شفیع مونس صاحب 5 اپریل کے اجلاس کی شب میں اختتام پذیر نشست میں شریک رہے۔ یہ عجیب حسن اتفاق تھا کہ وہ جس تحریک سے تادم حیات وابستہ رہے اس کی مجلس نمائندگان کے اجلاس میں آسام سے گجرات اور پنجاب سے تمل ناڈو اور کیرالہ سے آئے پوری تحریک اسلامی ہند کے نمائندہ رفقاء سے ان کو آخری

۲۶ انتظار نعیم: وحدت نو، یکم مئی تا ۱۵/مئی ۲۰۱۱ء

ملاقات کا موقع ملا اور رفقاء تحریک نے بھی اپنے بزرگ قائد و رفیق کی معیت میں کئی روز گزارے اور ان سے ملنے کے مواقع حاصل کئے۔ 5 اپریل کی شام کو مرکز جماعت سے قریب ہی اپنے ذاتی گھر میں روانہ ہوتے وقت ہی مولانا مونس صاحب کی کمزوری عیاں تھی تاہم گھر پر رات پرسکون طریقے سے گزاری، جیسے دنیا کی آخری رات میں نہ کوئی شکایت تھی، نہ آرزو اور نہ دنیا کے چھوٹ جانے کا کوئی غم، بلکہ ہر طرح سے مطمئن کہ اب اپنے رب کی طرف کوچ کرنے کے خوبصورت و پرمسرت لمحے آ گئے ہوں۔ صبح طبیعت بگڑی تو صاحب زادے جناب جلیل اصغر اسپتال لے گئے اور دوپہر ڈیڑھ بجے کے قریب گھر لا رہے تھے کہ سفر آخرت شروع ہو چکا تھا اور پھر اچانک مرکز جماعت میں ان کی رحلت کی غمناک خبر پورے قافلے کو رنجیدہ کر گئی۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے کیسی خوشگوار زندگی کہ دین حق کی اقامت کی جدوجہد میں گزاری اور کیسی قابل رشک موت کہ آخری سفر پر اس طرح روانگی کہ تحریک کے پورے ملک کے تمام نمائندوں سے ملاقات ہوئی۔ سب نے ان کی نماز جنازہ میں شرکت کی، سب نے ان کیلئے دعائے مغفرت کی اور سب نے ان کے جنازے کو کاندھا دے کر جامعہ کے بٹلہ ہاؤس قبرستان میں سپرد خاک کیا۔

محمد شفیع مونس کا وطن

محترم محمد شفیع مونس صاحب 1918ء میں مغربی اتر پردیش کے ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے تھے، ضروری تعلیم حاصل کر کے غازی آباد کے ایک مڈل اسکول اور اس کے بعد دہلی میں اینگلو عربک اسکول میں درس و تدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے کہ جماعت اسلامی کی دعوت سے متعارف ہوئے۔ ہر چند کہ کانگریس پارٹی سے قربت تھی لیکن دین حق کی دعوت اور شہادت حق کے فریضے کی ادائیگی کے لئے پکار سنی

تو اس پر لبیک کہنے میں تاخیر نہیں کی۔ قائد تحریک مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ملاقات اور تحریک کو قریب سے سمجھنے کے لئے اس کے مرکز دارالسلام پٹھان کوٹ (پنجاب) پہنچے تو قائد تحریک نے محبت آمیز استقبال کیا۔ وہیں قیم جماعت میاں طفیل محمد سے قربت پیدا ہوئی۔ راقم الحروف کو میاں صاحب سے بارہا ملاقات کی سعادت ملی، لیکن جس رفیق سے 1947 کے بعد پھر کبھی نہیں مل سکے تھے اس کی یادوں کو وہ تازہ رکھتے اور مونس صاحب کی خیریت ضرور معلوم کرتے۔

تقسیم وطن کے بعد ہندوستان میں تحریک اسلامی کی دعوت محمد کو زندہ رکھنے اور جماعت اسلامی ہند کی تشکیل میں اس کے جن اولین قائدین اور بزرگوں کی ناقابل فراموش خدمات ہیں ان میں مولانا شفیع مونس کا کردار، اخلاق، یکسوئی، جدوجہد اور استقامت ہمیشہ سنہری حرفوں میں لکھے رہے ہوں گے۔ مولانا مونس صاحب مزاجاً کوہ استقامت تھے۔ لیکن ہمیشہ پیکر اضطراب نظر آتے کہ ہمارا وطن اسلام اور اس کی دعوت سے کیسے آشنا ہو جائے۔

اقامت دین کے جذبہ سے سرشار

ان کو تحریک سے غیر معمولی عشق تھا اور فرمایا کرتے تھے کہ اقامت دین کے عظیم فریضے کی ادائیگی جماعت کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے۔ تحریک سے ان کے والہانہ عشق کی تحریک میں غیر معمولی قدر کی گئی۔ وہ تحریک کے محبوب ترین بزرگوں میں سے ایک تھے۔ یہی سبب تھا کہ تحریک کو جب جہاں ضرورت ہوئی اس نے محترم مونس صاحب کو اس محاذ پر لگا کر ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا۔ غازی آباد شہری امارت مقامی سے کر حلقہ دہلی و پنجاب، حلقہ آندھرا پردیش، حلقہ اتر پردیش کی امارت کی ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی۔ معاون قیم اور قیم جماعت اور پھر نائب امیر جماعت کے

ذمہدارانہ منصوبوں پر فائز کر کے تحریک نے انکی غیر معمولی خدمات سے استفادہ کیا۔ امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ اور قیم جماعت مولانا محمد یوسفؒ نے جن اولین دو حضرات کو اپنی معاشی کشتیوں کو آگ لگا کر تحریک کیلئے یکسو ہونے کی آواز لگائی تھی ان میں محترم افضل حسین صاحب اور محترم محمد شفیع مونس صاحب بھی تھے۔ دونوں حضرات نے جماعت کے مرکز ملیح آباد (لکھنو) پہنچ کر جماعت کی مرکزی درس گاہ اسلامی شروع کی تھی۔ پھر دونوں حضرات یہ فریضہ مرکز اور درس گاہ کے رامپور منتقل ہوجانے کے بعد بھی ساتھ ساتھ انجام دیتے رہے اس کے بعد یہ دونوں رفیق مرکز رامپور سے دہلی منتقل ہونے کے بعد دہلی آ گئے اور یہیں کے ہوکر رہے۔ جناب محمد شفیع مونس صاحب نے تحریک میں بڑے کاموں کی انجام ہی کا سلسلہ 1955ء میں شروع کر دیا تھا۔ جب ان کو جبل پور مدھیہ پردیش کے بھیانک مسلم کش فسادات میں جماعت کے ریلیف ورک کا انچارج بنایا گیا۔ جماعت کی نگرانی میں بڑے پیمانے پر ریلیف کا کام تو انجام دیا ہی گیا لیکن مونس صاحب کی منصوبہ بندی، سلیقہ شعاری، متاثرین کیلئے فکرمندی دردمندی، دیگر مسلم تنظیموں کے ذمہ داران سے بے لوث مخلصانہ روابط اور غیر مسلم حضرات سے برادرانہ تعلق نے ہندو مسلمانوں سب کو ہی متاثر کیا، بالخصوص مسلم تنظیموں کے ذمہ داران ان کی حسن کارکردگی، جذبہ ملی اور باہمی تعاون کی روش سے بے حد متاثر رہے۔ مونس صاحب کی جبل پور کے مظلومین کی خدمت نے گویا ان کیلئے ملی خدمات کی راہموار کی۔ پھر ملک میں جہاں جہاں فرقہ وارانہ صورت حال خراب ہوئی مسیحائے ملت مونس صاحب امن وامان کے قیام کیلئے کوششیں کرنے کیلئے مرکز سے بھیجتے جاتے رہے اور فسادات کے بعد جہاں بھی جماعت نے ریلیف کا کام کیا وہاں مونس صاحب نے کسی نہ کسی انداز میں خدمت انجام دی۔ یہاں تک کہ اسی خدمت کیلئے ایک بار اپنے رفقاء

کیساتھ ریلیف کا سامان پہنچانے کے ''جرم'' میں میرٹھ کی فرقہ پرست پولیس نے بزرگ رہنما اور انکے ساتھیوں کو گرفتار کرنے میں کوئی تکلف نہیں کیا!

قید و بند کی صعوبتیں

مونس صاحب کے ساتھ قید و بند کے اس سلسلے کی انتہا 1975ء میں اس وقت ہوئی جب جماعت اسلامی ہند کے ان قائدین کو گرفتار کر کے جیلوں میں ڈالا گیا اور ہتھکڑیاں لگا کر ان کو عدالت میں لایا گا جن کی امن پسندی کی قسمیں کھائی جاسکتی تھیں۔ امیر جماعت مولانا یوسف صاحب، مولانا محمد شفیع مونس صاحب اور دیگر قائدین ورفقاء کے ساتھ اس راقم کو بھی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے ہندوستانی دواخانہ بلیماران دہلی میں عوام کو ''خطاب کرنے کے جرم'' میں گرفتار کر کے جیل میں رکھا گیا تھا۔ مونس صاحب کی جیل کی زندگی کے بارے میں شاید یہ عرض کرنا کافی ہو کہ وہ غرور ستمگراں کو خاطر میں لائے بغیر چٹان کی طرح پرعزم اور مسلم حنیف کی طرح مطمئن و پرسکون رہتے۔

مطالعہ قرآن خصوصی شغف

مطالعہ قرآن کریم، باہر کی طرح جیل میں بھی ان کا خصوصی شغف تھا۔ آزاد دنیا کی طرح جیل کو بھی گلزار بنانے میں ان کو ملکہ حاصل تھا۔ چائے کے شوقین تھے لیکن خواہش کا اظہار بہت ہی لطیف اور کنائے کے انداز میں کرتے تھے۔ کبھی جی چاہتا تو فرماتے: انتظار صاحب، مولانا سلمان ندوی صاحب کو چائے نہیں پلائیں گے؟ سب لوگ مسکرا دیتے اور تھوڑی دیر میں چائے حاضر ہوجاتی۔ مولانا کا تحریک سے عشق مثالی تھا۔ اس کے پیغام کے فروغ واستحکام اور عوام تک اس کی دعوت پہنچنے

کے سلسلے میں بہت فکرمند رہتے تھے۔ پورے ملک سے مرکز آنے جانے والے رفقاء سے انکے مقام پر تحریکی کام کی کیفیت ضرور معلوم کرتے تھے۔تحریک کی ضروریات کی تکمیل کا بھی ان کو بہت خیال رکھتا تھا۔ جب آندھرا پردیش اور یوپی کے امیر حلقہ رہے تو اس کے دفاتر کی تعمیر کے منصوبے بنائے اور اس کی تکمیل کی۔لکھنو میں حلقہ کا عظیم الشان دفتر مولانا مونس صاحب کی فکرمندی کا مظہر اور دہلی میں جماعت اسلامی ہند کا قابل دید وسیع وعریض مرکز مولانا محمد یوسف علیہ الرحمہ کے وزن اور مولانا مونس صاحب کی بے مثال جدوجہد کا یادگار شاہکار ہے۔ وہ منظر بہت دیدنی تھا جب قائد تحریک کا اسی مرکز میں رفقائے تحریک اور عوام نے آخری دیدار کیا اور وہیں امیر جماعت مولانا سید جلال الدین عمری نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ مولانا کے عشق تحریک کے بیشمار واقعات میں ایک واقعہ دل کو بہت ہی چھو جانے والا ہے۔ بابری مسجد کی شہادت کے بعد ملک کے سنگین حالات میں مرکز جماعت کی کیفیت بھی اضطراب انگیز تھی۔ ایک شب بہت بھاری تھی۔ امیر جماعت محترم مولانا محمد سراج الحسن صاحب نے قیم جماعت جناب محمد جعفر سے خواہش کا اظہار کیا کہ اگر آج کی رات مولانا محمد شفیع مونس صاحب اپنے گھر کے بجائے مرکز جماعت میں ہی آرام فرماتے تو بہتر تھا۔ قیم جماعت نے معلوم کروایا تو محترم مونس صاحب گھر پر موجود نہیں تھے۔ تلاش کے بعد معلوم ہوا کہ وہ تو پہلے ہی اپنے طور پر مرکز جماعت پہنچ کر آرام فرما رہے ہیں۔ یہ تحریک سے ان کے عشق کی انتہا تھی!

مولانا کا پائے استقامت

مسجد کی شہادت کے بعد ایک ظلم یہ بھی ہوا کہ جماعت اسلامی ہند پر پابندی لگادی گئی۔ دوسری آزمائش جماعت پر یہ آئی کہ وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے اپنے ایلچی

کے ذریعہ قائد تحریک مولانا شفیع مونس صاحب کو بلوایا اور جس کے ساتھ مولانا سے بابری مسجد کا سودا کرنے کے لئے ورغلایا۔ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو اپنی بے پایا رحمتوں اور نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔ انہوں نے نرسمہا راؤ سے کہا کہ اوکھلا میں میرا ایک گھر ہے جس کا میں مالک ہوں، اگر اس گھر کی ملک کو کوئی ضرورت ہو اور یہ وطن کے کسی کام آسکتا ہوں تو میں یہ پیش کرنے کے لئے تیار ہوں، لیکن جہاں تک بابری مسجد کا سوال ہے، یہ اللہ کا گھر ہے اور وہی اس کا مالک، صرف میں ہی نہیں بلکہ سارے مسلمان مل کر بھی چاہیں تو اس کو کسی کو نہیں دے سکتے۔ اس لئے کہ وہ اس کے خادم ونگراں تو ہیں، مسجد کے مالک نہیں ہیں! حکمران وقت کے غرور کو ایک ٹھوکر لگا اور ملت کے وقار کو بلند کرتے ہوئے حضرت مونس مرکز تحریک کی طرف لوٹ آئے۔ محترم مونس صاحب اسی وقار اور بانکپن کے ساتھ پوری زندگی سرگرم عمل رہے۔ نظم وڈسپلن جو اسلام کے اولین تقاضوں میں ہے مونس صاحب اس کی اہمیت کا درس ہی نہیں دیتے بلکہ ہمیشہ اس کے پابند رہے۔ چاہے جماعت کا کوئی اجتماع ہو، کسی سے ملاقات کے لئے کہیں جانا ہو، چاہے کوئی ملی، اجتماعی یا عام پروگرام ہو، مونس صاحب سب سے پہلے پہنچنے والوں میں ہوتے تھے۔ شاید یہ عادت انہوں نے نماز سے سیکھی تھی وہ مسجد میں بھی ہمیشہ پہلے پہنچنے والے اور صف اول میں شریک ہونے والے ہوتے تھے۔ جماعت کے اندر نظم وڈسپلین کی پابندی کے سلسلے میں مونس صاحب بہت بلند مقام پر فائز تھے۔ یہ صفت اگر چہ تحریک کے ادنی کارکن کی بھی ہونی چاہئے۔ کہ وہ کسی مسئلے میں اپنی الگ رائے رکھتے ہوئے بھی اظہار اسی رائے اور فیصلے کا کرے جو جماعت نے اجتماعی طور پر کردی ہو۔ لیکن یہ حوصلہ جماعت کے حقیقی مزاج شناس کا ہی ہوسکتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس پہلو سے مونس صاحب بہت اونچے مقام پر متمکن تھے۔

معاملہ فہم بھی اور ذمہ دار بھی

ایک مسئلے میں مولانا محترم جماعت کے اجتماعی فیصلے سے قدرے مختلف رائے رکھتے تھے۔لیکن جب جماعت نے حلقوں میں اس فیصلے کی تفہیم کی ذمہ داری انہیں کے سپرد کی تو انہوں نے نظم وڈسپلن کی پابندی کی اعلیٰ مثال قائم کرتے ہوئے ارکان کے درمیان مسئلے کی تفہیم اس طرح کرائی جیسے ان کی خود بھی یہی رائے ہے اور تحریک کے اجتماعی فیصلے پر ان کو شرح صدر ہے۔ جماعت اسلامی ہند کی سرپرستی میں طلبہ کی ملک گیر تنظیم کے قیام واستحکام اور اس کی صحیح سمت میں تربیت میں مولانا مونس کا کردار بھی نئی نسل ہمیشہ یاد رکھے گی۔ جماعت نے بہت اعصاب شکن حالات میں اپنی طلبہ تنظیم اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (SIO) کے قیام کا فیصلہ کیا تھا۔

قائد تحریک مولانا ابواللیث صاحب علیہ الرحمہ نے خود اس تاریخ ساز اقدام میں سرپرستی کا کردار ادا کیا تھا لیکن تنظیم کے سرپرست اعلیٰ کے نمائندے کی حیثیت سے عملاً محترم مونس صاحب ہی سرپرست اعلیٰ کی ذمہ داری ادا فرماتے رہے۔ان کی شفقت ومحبت سے غیر معمولی متاثر طلبہ ان کے مشوروں اور ہدایات کو نظر انداز کرنے کے بارے میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔انہیں کی نگرانی میں ترتیب دیا گیا SIO کا دستور، تنظیم کا بہترین راہ نما ہے۔مونس صاحب بے انتہا خوش قسمت تھے کہ ان کی حیات میں SIO نے اپنی سلور جوبلی منائی اور اپنا سفر سرگرمی کے ساتھ جاری رکھے ہوئے ہے۔

مونس صاحب کو نوجوانی سے ہی شعروشاعری سے شغفت تھا۔چنانچہ تحریک کی تمام تر مصروفیات میں وہ شعر گوئی کے لئے وقت نکال لیتے اور شعری نشستوں اور

ادارہ ادب اسلامی ہند نے مشاعروں میں کلام سناتے۔نصف صدی قبل ادارہ کی تشکیل میں انہوں نے فعال رول ادا کیا تھا اور ہمیشہ ہی اس کی مجلس اعلیٰ کے رکن رہے۔ادارہ ادب اسلامی ہند نے ان کی غزلیات کے دو مجموعے حرفِ آرزو اور متاع حیات شائع کئے ہیں۔

مونس وغم خوار ملت الوداع
ہو خدا کی تم پہ رحمت الوادع

☆☆☆

خان بہادر عباس خان[۲۷]

میں نے بڑی ہمت جٹا کر کوشش کی کہ خان بہادر عباس خان مرحوم کی زندگی اور کارناموں پر کچھ روشنی ڈالوں۔ میں نے اپنی چھان بین سے جس مواد کو حاصل کیا ہے وہ بنگلور شہر کے شہریوں کے لئے یہ مضمون پیش کرنے کی جرأت کر رہی ہوں ممکن ہے کہ معلومات کی کمی کی وجہ سے کوئی ایسی باتیں چھوٹ گئی ہوں جو بہت اہم ہیں۔ خان بہادر صاحب کا تعارف کراونا میرا فرض بنتا ہے جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ عباس خان کے نام سے بنایا گیا ادارہ کالج 'عباس خان کالج فار ویمنس'' میں ۲۹ سال برائے لکچرار ۶ سال پرنسپل کی ذمہ داری کو انجام دینے کا شرف مجھے حاصل ہوا ہے اور میں اس عظیم مشہور و معروف ہستی کے پیچھے چھوڑے ہوئے مستقل کاموں کے تعلق سے بنگلور شہر کی گئی نسلوں کو آگاہ کروا رہی ہے۔

مسلمانوں کا کوئی ہمدرد نہیں

ہر دن اکثر کئی اخباروں کی سرخیاں یہی کہتی ہیں کہ ''مسلمان قوم وملت و مذہب کا کوئی ہمدرد و مددگار معاون کفیل یا بہی خواہ کوئی نہیں ہے۔ نہ ہی حکومت کی

۲۷ پروفیسر زرینہ خان۔ راشٹریہ سہارا، 22 مئی 2011ء

طرف سے اور نہ ہی معاشرے یا کسی بھی اجتماعی نمائندگی سے جب ہم حکومت یا معاشرے سے کچھ پرزور مطالعہ کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ مطالبہ کرنے کے بعد بالکل خاموش بیٹھ کر اس کے پورے ہونے کا انتظار کریں بلکہ ہمیں اپنی طرف سے ایک پر اعتماد اور شدت سے اس مطالبہ کو پورا کروانے کے لئے کام کر کے اس کو حاصل کرنا ہوگا۔ مگر بدقسمتی یہ ہے کہ ہم اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کرتے مگر سو فیصدی صرف مدد کا انتظار کرتے رہ جاتے ہیں اور نتیجہ صفر میں اپنی طرف سے ان شکوے شکایات کو سچ نہیں مانتی۔

خان بہادر عباس خان کی خدمات

خان بہادر عباس خان جیسے لوگ نہ صرف ابھرے مگر بنگلور کے شہریوں کے لئے اور انکی بہبودی کے لئے کئی کام انجام دیئے۔ آج شاید قوم کی خدمت کا جذبہ بہت ہی کم لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ زیادہ تر ہم اپنے آپ پر ترس کھاتے اور اپنا دکھڑا سنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ بجائے اس کے کہ اگر ہم سب عام لوگ ان رہنماؤں کے ساتھ مل کر کوشش کریں تو ضرور ہمیں کامیابی ملے گی۔ میں یہ بھی مانتی ہوں جن لوگوں کے پاس رتبہ پیسہ اور خوشحالی ہے وہ مطمئن بن چکے ہیں جو صرف اپنے لئے سوچا کرتے ہیں مگر ہماری پچھلی نسلوں میں ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی۔ جنہوں نے نہ صرف اپنی اور اپنی اولاد کی فکر کی بلکہ پورے ملک قوم کی فکر کی اور ان کی خدمت میں جڑ گئے وہ لوگ خودغرض نہیں تھے اور صرف ایک شخص اپنے لئے داد پانا نہیں چاہتا تھا۔ جو لوگ معاشرتی، معاشی، علمی اور اخلاقی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سے ہماری قوم فائدوں کو حاصل کرنے اور استعمال کرنے سے قاصر ہے۔ کوئی انہیں روک نہیں رہا ہے مگر عام طور پر ایک بڑی تعداد میں لوگوں کے اندر قوم کے لئے کچھ کر دکھانے کا

حوصلہ کمزور پڑ گیا ہے۔ ان کی دلچسپی جھانسہ دے کر کسی بھی طرح سے جلد سے جلد پیسہ حاصل کرنا بن گیا ہے۔

میں یہاں پر کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتی کیونکہ ہم سب اس بات کو اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ صرف شکوے شکایات کو بڑھاوا دیا جارہا ہے کیونکہ ہم اپنے آپ پر اعتبار اور اعتماد کھو بیٹھے ہیں جو کچھ بھی ہو ہم کو یہ اعتراف ضرور کرنا ہے کہ پچھلی نسلوں کے ان بزرگوں کے باعث ہی آج ہم کچھ بولنے اور کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں۔ ذرا سوچئے اگر وہ لوگ نہ ہوتے تو ہم آج کہاں ہوتے اور کیا کر رہے ہوتے۔

ہماری موجودہ نسلیں ان بزرگوں سے واقف نہیں ہیں اور خود غرضی اور ملت فراموشی، احسان فراموشی جیسی چیزیں ہم پر بہت مہربان ہوگئی ہیں جب معیاد گھٹ جاتا ہے تو ہم ضرور سزاوار اور ذلیل بن جاتے ہیں اور خود اعتمادی بکھر جاتی ہے۔ اگر ہم پچھلی نسل کے بزرگوں کی عزت اور ان کا احترام کریں انہیں صرف یاد ہی نہیں بلکہ ان کے طریق کار و خلوص اتفاق اور اخلاق کو مثال بنا کر ان کے نقش قدم پر چلیں تو شاید ہمارا کھویا ہوا مقام ہمیں ضرور مل سکتا ہے۔

قومی بیداری مہم

اگر قوم کا ہر انسان چاہے عورت ہو یا مرد صرف تھوڑی محنت اور مشقت کریں اپنا مقام بنانے کیلئے ملک میں قومی ''نشاۃ الثانیہ'' یعنی National Renasaan (قومی بیداری) کے دوران انگریزی حکومت نے اپنی Senale کے اراکین کے خطابات سے نوازا۔ اسی وقت عباس خان صاحب کو بھی اعزازی خطاب عطا کیا گیا۔ خان بہادر جو مسلمانوں کے رہنما خان بہادر عباس خان کہلائے جانے لگے۔ پھر قوم کی کچھ جماعتوں نے انہیں خطاب دیا شفیق الملک خان بہادر عباس خان کا اور انہیں

سرسید آف کرناٹک بھی کہا جانے لگا کیونکہ خان بہادر عباس خان نے وہ سبھی کام کئے جو سرسید احمد نے کل ہند سطح پر ملک کیلئے کئے جیسے کہ علمی انتظامی تحریری، تقریری، معاشی، معاشرتی، سیاسی، اخلاقی اور تمدنی اسی طرح عباس خان نے ریاست میسور میں کیا۔ سرسید احمد کی طرح عباس خان کے بھی کئی معاون اور مددگار تھے۔ ان کی ایک بڑی صلاحیت تھی۔

قابل ہستیوں کا تعاون حاصل کرنا اور بڑے بڑے کاموں کو انجام دینا ایک قابل تعریف صلاحیت عباس خان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں اور دوستوں کو تلقین کی کہ تھوڑا ذاتی پیسہ بنکوں سے نکال کر ملت پر خرچ کریں اور آئندہ نسلوں کی بہتری سے مسلم سماج کو اعلیٰ مقام دلوائیں۔ خان بہادر عباس خان نے ابتداء میں ہی انجمن کی عمارت ''مسلم ہال'' تعمیر کروائی اور جب انہیں جگہ کی تنگی محسوس ہوئی تب عباس خان نے اپنے ساتھیوں کو بینکوں میں پیسہ جمع کر کے سود کھانے کی نہیں بلکہ ملت پر خرچ کر کے اپنی آئندہ نسلوں کو بہتر بنانے کی تلقین دی۔ مالداروں سے روپیہ لے کر صرف انہیں کی تعلیم کا بندوبست نہیں کیا بلکہ غریبوں کو بھی تعلیم دی اور ترکی کے جہاد کیلئے بھی فنڈ فراہم کیا۔

مسلم ہال کی تعمیر

بنگلور کے سینکڑوں نامور مسلمان اور ہزاروں مزدور پیشہ بے نام مسلمان ملت کی تعمیر کے لئے چندہ عطا کیا اور انہیں کی بدولت C.M.A. آج مالدار ہے جب انہیں جگہ کی تنگی محسوس ہوئی تب وہ بازو والی زمین عمارت سے لگے ہوئے دو انجینئر کے باغات کو خرید کر عمارت کے ساتھ ملا لیا اور ''مسلم ہال'' کی عمارت کی بالائی منزل کی تعمیر شروع کی گئی۔ اس وقت جن لوگوں نے بھی روپیہ دیا تھا ان کے ناموں کی تختیاں

اور دی گئی رقم کی مقدار کے ساتھ چوب دار فرموں میں سجا کر مسلم ہال کے بڑے دالان کی دیواروں پر سجائے گئے تھے۔افسوس وہ آج ہم دیکھنے سے قاصر ہیں۔جب انہیں مسلم ہاسٹل کی ضرورت محسوس ہوئی عباس خان کے انجمن کی عمارت میں نئے کمرے تعمیر کروائے اور بنگلور کے اطراف واکناف سے آنے والے طالب علموں کیلئے رہائشی سہولت کے ساتھ کھانے پینے اور پانی کا بندوبست بھی کروایا۔اس ہاسٹل کی شہرت اتنی ہوئی کہ چند ہی سالوں میں طلباء کی تعداد بڑھ گئی۔ہر ایک طالب علم کو ماہانہ ۵ روپے ہاسٹل کی فیس کے تعلق سے جمع کروائی تھی۔مسلم ہال کا اوپری منزل پر ایک کمرہ نماز کے لئے بھی بنوایا گیا۔مسلم ہاسٹل بنوا کر انہوں نے بسوں تک کیلئے سہولت کردی جہاں سے ہزاروں طلباء نکلے جو آج بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ اگر بنگلور میں مسلم ہاسٹل کا وجود نہ ہوتا تو آج شاید کئی بڑے عہدے دار مسلمان گلیوں کی خاک چھان رہے ہوتے۔

مولانا امیر مسلم ویلوری نے مزید ایک اور یتیم خانہ کی بنیاد بنگلور شہر میں ڈالنے کی رائے عباس خان کو دی مگر وہ اس تجویز کے خلاف تھے۔انہوں نے کہا کہ اگر ہر مسلمان اپنے گھر میں ایک ایک یتیم کی پرورش کا ذمہ اٹھائے تو دین اور دنیا میں وہ سر خرو ہوجائے گا۔خود آپ نے اس بات پر عمل کیا۔خان بہادر پاکستان کے مطالبہ پر بھی اپنی نارضگی ظاہر کی تھی۔عباس خان نے جب محسوس کیا مسلم قوم میں مجبوروں، معذوروں، مفلسوں کی اتنی کثرت تھی تو وہ مسلمانوں میں ایک نئی جدت لانا چاہتے تھے۔رمضان المبارک میں تقسیم زکوٰۃ کو اجتماعی یا اجتماعی خیرات کو ایک خزانہ عامرہ میں جمع کرکے غریب اور بیکار لوگوں کے لئے روزگار فراہم کرکے انہیں مستقل روزگار، تجارت یا ہنر اور چھوٹی موٹی صنعتوں پر لگا کر انہیں مفلسی سے چھٹکارا دلایا جائے۔نتیجہ بیت المال کی ایجاد۔

مسلمان قیدیوں کے لئے سہولت

ایک خاص بات یہ ہے کہ خان بہادر عباس خان نے بنگلور شہر کی سنٹرل جیل کے مسلمان قیدیوں کے لئے بھی کئی سہولتوں کا بندوبست کروایا۔جیل کے اندرونی احاطہ میں ایک مسجد اور عیدگاہ تعمیر کروائی۔اور عید کے موقعوں پر قیدیوں کو بریانی وغیرہ فراہم کی جانے لگی۔شہر کے ہر ایک حصے سے نمائندوں کو مقرر کرکے شہر کے مسلمانوں کے لئے عید میلاد کا جشن منایا جانے لگا اور جلسہ کے اختتام پر تمام حاضرین کے لئے ضیافت کا انتظام ہوتا تھا۔مگر اس کی روک پر صرف شرینی کی تقسیم پر تقریب ختم کی جانے لگی۔یوں تو خان بہادر عباس خان صاحب وکالت قانون کے طالب علم نہیں تھے مگر Indian Panel Code اور دوسرے قانونی نقطوں کو گہرائی سے جانتے تھے۔ انہیں کی ہدایت پر بنگلور شہر میں عبد الجبار خلیل اور حبیب اللہ خان جیسے ماہر وکیل ابھرے جنہوں نے شہر کے غیر مسلم قوم کی نمائندگی اور منصوبوں پر مسلمانوں کو مامور کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔

حکومت میں اثر ورسوخ

محمود شریف نے ریاست میسور کی کانگریس حکومت میں عباس خان کے رسوخ سے وزارت میں عہدہ پایا۔نصر اللہ شریف ایڈوکیٹ وزیر نے جن کو یہ منصب دلوانے میں خان بہادر کا بڑا اہم کردار رہا۔حبیب اللہ خان کو بھی وکالت میں ماہر بنادیا۔خان بہادر کی عمر نے ان سے وفا نہیں کی۔ان کی جگہ پر کرنے والے سکریٹریوں کا ایک طویل سلسلہ چلا اور آج بھی چل رہا ہے۔خان بہادر عباس خان نے تا زندگی اپنا وقت انہی کاموں میں صرف کیا اور کسی نہ کسی طرح مصروف ہی پائے گئے۔آج اس انجمن

کی کئی تعلیمی ادارے چل رہے ہیں جیسے کہ جونیر کالج اور ڈگری کالج جوانہیں کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اسکولیں۔ محمود شریف پالی ٹیکنک اور Bed کالج یہ ادارہ 2007ء میں ایک صدی پوری کر چکا ہے اپنے وجود کے مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ خود کئی مسلمان بھی یہ نہیں جانتے۔ خصوصاً نوجوان نسل ان اداروں کو میں یہ تو نہیں جانتی کہ الزام کون لے۔ مگر ایک بات بالکل سچ ہے کہ آج کے ماحول کے مطابق انجمن کے عہدیداروں میں وہ جنون اور شدت نہیں ہے۔ کوئی بھی ادارے اپنے آپ کو بچا کر غرور سے کہہ سکتا ہے کہ ہم کسی سے کم نہیں ہیں۔ صرف دو چیزوں کو خیال رکھ کر ایک ہے اپنے مقصد میں سنجیدگی اور باوقار انداز اور دوسرا ذمہ داری کے ساتھ ساتھ خود گزاری۔ اور ایک اہم بات عہدیداروں کی فہرست میں خواتین کا داخلہ۔ تبھی ادارے سے زیادہ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

محمد غلام محی الدین مہکری [۲۸]

ارض قدیم ریاست میسور اپنے طویل تاریخی سفر میں کبھی نامور اور ممتاز شخصیتوں سے محروم نہیں رہی۔ سلطان شہیدؒ کی سبق آموز دلیرانہ شہادت سے لے کر دور حاضر تک یہ تاریخ خطہ علماء دین، عظیم رہنماء، بلند پایہ مصنف، سائنسداں، مدبر و مفکر اور شعر و سخن کے آفتاب و ماہتاب کا مسکن رہا ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے زمانے میں اپنی خداداد صلاحیتوں اور غیر معمولی استعداد کا لوہا منوایا ہے۔ یوں تو اس خطہ نے اسی وقت تاریخ میں اپنا ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا جب سلطنت خداداد کے ہر دلعزیز حکمراں شجاعت و بہادری کے علمبردار حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ نے انگریزوں کے تسلط سے اس ملک کو آزاد کرانے کی جان توڑ کوشش کرتے ہوئے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی اور جام شہادت نوش کر کے حب الوطنی کی بے نظیر مثال قائم کر گئے۔

مہکری صاحب حکمت کا مجسمہ

تاہم اسی قدیم میسور ریاست کی تاریخ کے جھروکے سے ایک سنہری کڑی کے طور پر جانی جانے والی محمد غلام محی الدین (ایم جی مہکری) کی ممتاز شخصیت ہے۔ جو

۲۸ خورشید عالم ندوی، ایس این بی: سہارا، ۱۷ اپریل ۲۰۱۱ء

اپنے دور میں حکمت و مصلحت اور دور اندیشی کی اپنی مثال آپ تھے۔ عام طور سے کہا جاتا ہے کہ بڑے لوگوں کی بڑی بات ہوتی ہے۔ ان کے روشن کارنامے، ان مٹ نقوش گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں جو رہ رہ کر آنے والی نسل کو انکی دور بینی، بالغ نظری اور عظمت رفتہ کی یاد دلاتا ہے اور تاریخ کے صفحات میں سنہرے حروف میں رقم ان کارناموں کو پڑھ کر یادوں کا سیلاب امڈ آتا ہے۔ قدیم میسور ریاست کی با اثر شخصیات میں ایم جی مہکری کا نام محتاج تعارف نہیں لیکن امتداد زمانہ کے سبب ان کا نام وقت کے ملبوں میں دب کر رہ گیا ہے۔ حالانکہ ان کے خاندانی سلسلہ کی ہندوستان میں ایک تاریخ رہی ہے۔

بحر کیف محمد غلام محی الدین مہکری معروف بہ ایم جی مہکری، ان شخصیتوں میں سے تھے، جنہیں اللہ نے کئی دماغی بخششوں سے نوازتا ہے۔ کئی خصوصیات کے مالک تھے۔ دوست اور دشمن سب نے ان کی مدبرانہ فراست، انتظامی صلاحیت اور مشکل حالات میں معاملہ پر قابو پانے کی غیر معمولی استعداد کا اعتراف کیا ہے۔

پرتعیش بود و باش

پورا نام محمد غلام محی الدین مہکری تھا۔ مہکری کی خاندان کے ہونہار اور روشن چراغ تھے۔ پیدائش میسور میں آبائی متمول خاندان میں ہوئی جو کئی پشت سے چلا آرہا تھا۔ یہ کوئی 18 ویں صدی کے نصف بعد کا زمانہ تھا۔ دادا کا نام سرامیر بدرالزماں خان تھا جو کرشنا راجہ وڈیار کورٹ میں عملدار کے نام سے جانے جاتے تھے۔

اس زمانے میں عام رواج تھا کہ شاہی دربار سے جڑے افراد کے بچوں کو شاہی دربار کے زیر نگرانی تربیت دی جاتی تھی۔ چنانچہ مہکری صاحب کو صغر سن یعنی چھ سال کی عمر سے ہی شاہی دربار کی پرتعیش، شاہانہ بود و باش کی آب و ہوا ملی۔ بایں طور

پر جب وہ چھ سال کے تھے تبھی میسور شاہی دربار کے یوراجا کے ساتھ ان کی بھی تربیت ہوئی اور اسی شاہی دربار کے خوش وخرم ماحول میں تعلیمی نشو ونما پائی۔ اس زمانے میں شاہی خاندان کا اسکول وہاں تھا جہاں جولوجیکل گارڈن واقع ہے۔ آگے چل کر میسور یونیورسٹی سے گریجویشن کیا اور پھر وہیں سے بدستور ایل، ایل، بی کیا۔ اسی دوران ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے یوراجا کے پرائیوٹ سکریٹری مقرر ہوئے، نیز پرنس جے چارمراجیند رڈویار کے اتالیق بھی ہوئے۔ پرائیوٹ سکریٹری ہونے کے ناطے یوراج اور اس کے اہل خاندان کے ساتھ انگلینڈ کا سفر کیا۔ لیکن جب دوسری جنگ عظیم کی آگ بھڑک اٹھی تو ان پر یہ ذمہ داری عائد ہوئی کہ اس شاہی خاندان کو بحفاظت ہندوستان واپس لائے۔

ایم جی مہکری ڈپٹی کمشنر

ایم جی مہکری نے میسور کے ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دی ہیں۔ اس وقت میسور پر انگریزوں کی غاصبانہ نظر جمی ہوئی تھی اور اس پر تسلط جمانے کی تاک میں تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب سارے ملک میں جدوجہد آزادی کی لہر چل رہی تھی۔ پورا ملک گاندھی جی کے ستیہ گرہ تحریک میں شامل تھا۔ تحریک کی لہر میسور بھی پہونچنے والی تھی۔ یہاں اس تحریک کی قیادت کے لئے میسور کانگریس پوری طرح تیار تھا۔ بالآخر اپریل 1938ء میں مدور کے شیوا پورا نامی مقام پر میسور کانگریس نے اوندھے پڑے گنے کے کھیت میں ستیہ گرہ کا جھنڈا گاڑ دیا۔ میسور کانگریس کا واحد مقصد برٹش تا نا شاہی حکومت کی مزاحمت اور یہاں ناجائز تسلط کے پنجے گاڑنے سے روکنا تھا۔ اس وقت ایم جی مہکری ضلع مجسٹریٹ تھے۔ یہ نہ تو ستیہ گرہ کی کھل کر حمایت میں تھے اور نہ یہ چاہتے تھے کہ یہاں خون خرابہ ہو اور خون کی ہولی کھیلی جائے۔

برٹش کی ظالم فورس کی قیادت ہمیلٹن کر رہا تھا۔ چنانچہ برٹش فورس نے فلیگ پوسٹ کو چاروں طرف سے گھیر لیا تا کہ میسور کانگریس جھنڈا لہرانے سے باز آجائیں۔ برٹش فورس احتجاجیوں کے خلاف سخت سے سخت کارروائی کرنے پر آمادہ تھے۔ایسی نازک گھڑی میں ایم جی مہکری کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ کہیں یہاں خون کی ندی نہ بہہ جائے۔میسور مہاراجہ کا امن وسلامتی کا یہ گہوارہ جو پرامن اور سلامتی کے لئے تاریخ کے صفحات میں اپنا نام درج کرا چکا تھا، کہیں یہ واقعہ اس کی تاریخ کو مسخ نہ کردے۔ چنانچہ ہر قسم کی بدامنی اور شر وفساد کو ٹالنے کی ہر ممکن کوشش کی اور بڑی حکمت ومصلحت سے کام لیتے ہوئے منڈلاتے ہوئے اس خطرہ کو ٹال دیا۔

مہکری کو معتمد الملک کا خطاب

وقت کے دیوان سر مرزا اسماعیل نے اپنے ماتحت افسر مہکری صاحب کو حکم دیا کہ جب کانگریس جھنڈا لہرانے کی کوشش کریں تو احتجاجیوں کو قید کرلیا جائے۔ زیر حراست لوگوں کو محفوظ مقام پر کھڑی پولس گاڑی تک پہنچا دیا جائے جو کہ جائے واقعہ سے تھوڑا فاصلہ پر ہے۔ایم جی مہکری صاحب کی اس دانشمندانہ اور مصلحت پسندانہ حکمت عملی پر برٹش آفیسر بھڑک گیا اور اس نے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے میسور مہاراجہ کو ایم جی مہکری کے خلاف ورغلانے کی کوشش کی۔لیکن مہاراجہ چونکہ بڑا دور اندیش اور صاحب بصیرت انسان تھا، اس نے اپنے معتمد افسر سے اس بابت وضاحت طلب کی۔اس پر ایم جی مہکری نے پورے اطمینان اور انکساری کے ساتھ وضاحت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''احتجاجی ریوینیو کی زمین پر اکٹھا تھے نہ کہ سرکاری زمین پر۔مزید یہ کہ وہ سب کے سب نہتے اور پرامن تھے''۔مہاراج میسور نے مہکری صاحب کے اس دور اندیشی پر مبنی فیصلہ اور حکمت عملی سے غایت درجہ متاثر ہوکر

'معتمد الملک' کا خطاب دیا۔اس موقع پر مہاراجہ نے انتہائی مسرت اور اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ایک بڑا حادثہ ٹل گیا اور بہت سی قیمتی جانیں بچ گئیں۔فرط مسرت میں خوشی کے جذبات سے مغلوب ہوکر اس نے اپنی انگلیوں سے تین نگ نکالے اور اسے محو حیرت کردینے والے ایم جی مہکری کو بطور تحفہ دے دیا۔ان کا یہ عمل ممکن ہے اظہار تشکر ہو یا ان کی تعریف وتوصیف میں دیا ہو جو کہ انہوں نے ایک نہایت حساس اور سنگین مسئلے کو نہایت چابک دستی اور دانشمندی سے نمٹا دیا۔ایم جی مہکری نے اپنی پر بہار زندگی میں فراز ہی فراز دیکھا۔ترقیوں کے سفر میں کئی ہمالیائی بلندیوں کا سفر کیا۔نشیب ان کی زندگی کی راہوں میں بھٹک کر بھی نہ گزرا۔

ان فراز میں وہ فراز بھی ہے جب وہ 1945ء میں ریزرو بینک آف انڈیا ممبئی کے ڈپٹی گورنر کے باوقار منصب پر فائز ہوئے۔یہ وہ منصب عالی ہے جس سے ہر کوئی سرفراز نہیں ہوتا۔اس عہدہ پر 1945 تا 1950 فائز رہے۔اس دوران ابتدائی تین ماہ کے اندر بینک املاک کا غائرانہ جائزہ لے کر بحسن وخوبی اپنی ذمہ داری نبھائی۔ یہ عہدہ انہوں نے اپنے قریبی ساتھی رامراؤ کے رائے مشورہ سے سنبھالا تھا جو کہ دہلی میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ریزرو بینک کے ڈپٹی گورنر کی حیثیت سے نمایاں کارکردگی کے نتیجے میں ریزرو بینک آف انڈیا آج بھی ادارے کے خصوصی شمارہ میں ان کی تصویر شائع کرتی ہے۔

قبل ازیں مہکری صاحب جموں وکشمیر کے دیوان بھی رہے جب میسور میں اڈمنسٹریٹر کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے تو کرن سنگھ نے مدعو کرکے دیوان کا باوقار عہدہ سپرد کیا۔ڈپٹی گورنر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے تو کورگ جو میسور ریاست سے علیحدہ تھا، کے اڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے۔لیکن جب صحت نے ساتھ نہ دیا اور طبیعت دگرگوں ہوتی گئی تو ڈاکٹر نے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔اس کے پیش نظر اس عہدہ سے

مستعفی ہوگئے۔ایم جی مہکری نہ صرف ایک قابل منتظم تھے بلکہ ایک عظیم انسان دوست ہستی تھے۔سماجی کاموں میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

1965ء میں مہکری صاحب نے پیرانہ سالی میں داعی اجل کو لبیک کہا۔اس وقت ان کی عمر 82 سال تھی اور وہ ممبئی میں تھے۔میر نے خوب کہا ہے:

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلوں یاں کہ بہت یاد رہو

☆☆☆

شاعر مشرق علامہ اقبالؒ [۲۹]

ڈاکٹر سر علامہ محمد اقبال (9/نومبر 1877ء تا 21/اپریل 1938ء) بیسویں صدی کے ایک معروف شاعر، مصنف، قانون دان، سیاستدان، مسلم صوفی اور اہم ترین شخصیات میں سے ایک تھے۔اردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے اور یہی ان کی بنیادی وجۂ شہرت ہے۔شاعری میں بنیادی رجحان تصوف اور احیائے اسلام کی طرف تھا۔''دار یکنسٹرکشن آف ریلجس تھاٹ ان اسلام'' کے نام سے انگریزی میں ایک نثری کتاب بھی تحریر کی جس کو بعض مسلم ممالک میں متنازع سمجھا جاتا ہے جب کہ سعودی عرب میں اس پر پابندی عائد ہے۔

علامہ اقبالؒ کو دور جدید کا صوفی سمجھا جاتا ہے۔علامہ اقبال 9/نومبر 1877ء بمطابق 3 ذیقعدہ 1294ھ کو برطانوی ہندوستان کے شہر سیالکوٹ میں شیخ نور محمد کے گھر پیدا ہوئے۔ ماں باپ نے نام محمد اقبال رکھا۔مختلف تاریخ دانوں کے مابین علامہ کی تاریخ ولادت پر کچھ اختلافات ہیں۔

اقبال کے آباواجداد اٹھارویں صدی کے آخر یا انیسویں صدی کے اوائل میں کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ آئے اور محلّہ کھیتیاں میں آباد ہوئے۔

۲۹ خصوصی پیشکش، راشٹریہ سہارا، ۹/نومبر 2010ء

تعلیم

علامہؒ نے ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں ہی حاصل کی اور مشن ہائی اسکول سے میٹرک اور مرے کالج سیالکوٹ سے ایف اے کا امتحان پاس کئے۔ زمانہ طالب علمی میں انہیں میر حسن جیسے استاد ملے جنہوں نے آپ کی صلاحیتوں کو بھانپ لیا اور ان کے اوصاف خیالات کے مطابق آپ کی صحیح رہنمائی کی۔ شعر وشاعری کا شوق بھی آپ کو یہیں پیدا ہوا۔ اور اس شوق کو فروغ دینے میں مولوی میر حسن کا بڑا دخل تھا۔

اعلیٰ تعلیم

ایف اے کرنے کے بعد آپؒ اعلیٰ تعلیم کے لئے لاہور چلے گئے اور گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور ایم اے کے امتحانات پاس کئے یہاں آپ کو پروفیسر آرنلڈ جیسے فاضل شفیق استاد مل گئے جنہوں نے اپنے شاگردگی کی رہنمائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

سفر یورپ: 1905ء میں علامہ اقبال اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان چلے گئے اور کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور پروفیسر براں جیسے فاضل اساتذہ سے رہنمائی حاصل کی۔ بعد میں آپ جرمنی چلے گئے جہاں میونخ یونیورسٹی سے آپ نے فلسفہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

تدریس اور وکالت

ابتداء میں آپ نے ایم اے کرنے کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں تدریس کے فرائض سرانجام دیئے لیکن آپ نے بیرسٹری کو مستقل طور پر اپنایا۔ وکالت کے

ساتھ ساتھ آپ شعر وشاعری بھی کرتے رہے اور سیاسی تحریکیوں میں بھرپور انداز میں حصہ لیا۔ 1922ء میں حکومت کی طرف سے سر کا خطاب ملا۔

علامہ اقبال کا مزار

1926ء میں آپ پنجاب لیجسلیٹیو اسمبلی کے ممبر چنے گئے۔ آپ آزادی وطن کے علمبردار تھے۔ اور باقاعدہ سیاسی تحریکوں میں حصہ لیتے تھے مسلم لیگ میں شامل ہوگئے اور آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے آپ کا الہ آباد کا مشہور صدارتی خطبہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ 1931ء میں آپ نے گول میز کانفرنس میں شرکت کر کے مسلمانوں کی نمائندگی کی۔

شاعری: شاعر مشرق علامہ اقبال حساس دل ودماغ کے مالک تھے آپ کی شاعری زندہ شاعری ہے جو ہمیشہ مسلمانوں کے لئے مشعل راہ بنی رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ کلام اقبال دنیا کے ہر حصے میں پڑھا جاتا ہے اور مسلمانان عالم اسے بڑی عقیدت کے ساتھ زیر مطالعہ رکھتے اور ان کے فلسفے کو سمجھتے ہیں۔ اقبال نے نئی نسل میں انقلابی روح پھونکی اور اسلامی عظمت کو اجاگر کیا۔ ان کی کئی کتابوں کے انگریزی، جرمنی، فرانسیسی اور چینی، جاپانی اور دوسرے زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ جس سے بیرون ملک بھی لوگ آپ کے معترف ہیں۔ بلا مبالغہ علامہ اقبال ایک عظیم مفکر مانے جاتے ہیں۔

اقبال کی نظموں کا فنی فکری تجزیہ شکوہ

جواب شکوہ، خضر راہ، والدہ مرحومہ کی یاد میں۔ تصورات ونظریات خودی: عقل وعشق، مرد مومن، وطنیت وقومیت، اقبال کا تصور تعلیم، اقبال کا تصور عورت، اقبال اور

مغربی تہذیب، اقبال کا تصور ابلیس، اقبال اور عشق رسول۔ شاعری کی ابتدا: اقبال کی شاعری پر اظہار خیال کرنے والے مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی شاعری کا آغاز اسی وقت ہوگیا جب وہ ابھی اسکول کے طالب علم تھے اس سلسلے میں شیخ عبدالقادر کہتے ہیں، جب وہ اسکول میں پڑھتے تھے اس وقت سے ہی ان کی زبان سے کلام موزوں نکلنے لگا تھا۔ عبدالقادر سہروردی کا کہنا ہے کہ: جب وہ اسکول کی تعلیم ختم کر کے اسکاچ مشن کالج میں داخل ہوئے تو ان کی شاعری شروع ہوئی۔ ان دونوں آرا میں اگرچہ معمولی سا اختلاف ہے لیکن یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ علامہ اقبال کی شاعری کا آغاز انہی دنوں ہوگیا تھا جب وہ اپنے آبائی شہر سیالکوٹ کے چھوٹے موٹے مشاعروں میں بھی شرکت کیا کرتے تھے۔ لیکن ان کی اس زمانہ کی شاعری کا نمونہ دستیاب نہیں ہوسکا۔ کچھ عرصہ کے بعد علامہ اقبالؒ جب اعلیٰ تعلیم کے لئے لاہور پہنچے تو اس علمی ادبی مرکز میں ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو ابھرنے اور تربیت پانے کا سنہری موقعہ ہاتھ آیا، یہاں جگہ جگہ شعروشاعری کی محفلوں کا چرچا تھا۔ مرزا ارشد گورگانی دہلوی اور میر ناظم لکھنوی جیسے پختہ کلام اور استادی کا مرتبہ رکھنے والے شاعر یہاں موجود تھے اور ان اساتذہ شعر نے ایک مشاعرے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ جو ہر ماہ بازارِ حکیماں میں منعقد ہوتا رہا۔ اقبال بھی اپنے شاعرانہ ذوق کی تسکین کی خاطر اس مشاعرے میں شریک ہونے لگے۔ اس طرح مرزا ارشد گورگانی سے وہ بحیثیت شاعر کے متعارف ہوئے اور رفتہ رفتہ انہوں نے مرزا صاحب سے اپنے شعروں پر اصلاح بھی لینی شروع کردی۔ اس زمانہ میں وہ نہ صرف غزلیں کہا کرتے تھے۔ اور یہ غزلیں چھوٹی بحروں میں سادہ، خیالات کا اظہار لئے ہوئی تھیں۔ البتہ شوخی اور بے ساختہ پن سے اقبال کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اظہار ضرور ہوجاتا تھا۔ بازار حکیماں کے ایک مشاعرے میں انہی دنوں اقبال نے ایک غزل پڑھی جس کا ایک شعر یہ تھا۔

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

اس شعر کا سننا تھا کہ محفل مشاعرہ میں موجد سخن سنجا صاحب پھڑک اٹھے اور مرزا ارشد گورگانی نے اسی وقت پیشن گوئی کی کہ اقبال مستقبل کے عظیم شعراء میں سے ہوگا۔

شاعری کی شہرت

اقبال کی شاعری کا چرچا شروع شروع میں بازار حکیماں کے مشاعروں تک محدود تھا۔ یا پھر لاہور کے کالجوں کی ادبی مجالس میں انہیں شاعر کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا۔ لیکن زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ شہر کی ادبی مجالس میں انہیں ایک خوش گو اور خوش فکر نوجوان شاعر کی حیثیت سے پہنچانا جانے لگا۔ انہی دنوں انہوں نے غزل کے ساتھ ساتھ نظم پر بھی توجہ کی۔ ایک ادبی مجلس میں انہوں نے اپنی اولین نظم ہمالہ سنائی تو اسے بہت پسند کیا گیا۔ چنانچہ اقبال کی یہ پہلی تخلیق تھی جو اشاعت پذیر ہوئی۔ شیخ عبد القادر نے اسی زمانہ میں اردو زبان وادب کی ترویج وترقی کیلئے اپنا پہلا مشہور رسالہ مخزن جاری کیا تھا۔ اس کے پہلے شمارے میں اپریل 1910ء میں اقبال کی یہ نظم شائع ہوئی یہ گویا ان کی باقاعدہ شاعری کا آغاز تھا۔ ان کے پہلے مجموعہ کلام بانگ درا کی اولین نظم یہی ہے اور اسی نظم کے چھپنے کے بعد ان کی شہرت روز بروز پھیلتی چلی گئی۔

شاعری کے مختلف ادوار

اقبال کے ذہنی وفکری ارتقاء کی منازل کا تعین اس کی شاعری کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے کیا جاتا رہا ہے کیونکہ اقبال نے اپنے افکار وخیالات کے اظہار کا ذریعہ شاعری کو ہی بنایا ہے۔ یہ طریقہ سب سے پہلے شیخ عبدالقادر نے اختیار کیا تھا۔ انہوں

نے بانگ درا کا دیباچہ لکھتے وقت اقبال کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے اور اسے تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ لیکن یہ تقسیم بعد میں اس لئے قابل قبول نہیں رہی کہ شیخ عبد القادر کے پیش نظر اقبال کا وہ کلام تھا جو بانگ درا میں شامل ہے۔ بعد کے نقادوں کے ان کے پورے کلام کو پیش نظر رکھ کر شیخ عبدالقادر کی پیروی کرتے ہوئے اسے مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے چنانچہ مولانا عبدالسلام ندوی اور طاہر فاروقی نے اقبال کی شاعری کے چار ادوار قائم کئے ہیں۔ ان دونوں کے ہاں ادوار کا تعین تقریباً یکساں ہے۔ طاہر فاروقی نے اپنی کتاب سیرت اقبال اور عبدالسلام ندوی نے اپنی کتاب اقبال کامل میں ان ادوار کا تعین کیا ہے۔ ان دونوں کے نزدیک اقبال کی شاعری کے مندرجہ ذیل چار ادوار ہیں۔

ا- پہلا دور از ابتدا 1905ء یعنی اقبال کے بغرض تعلیم یورپ جانے تک کی شاعری۔ ۲- دوسرا دور 1905ء تا 1908ء یعنی اقبال کے قیام یورپ کے زمانہ کی شاعری۔ ۳- تیسرا دور 1908ء تا 1924ء یعنی یورپ سے واپس آنے کے بعد بانگ درا کی اشاعت تک کی شاعری ۴- چوتھا دور 1924ء تا 1938ء بانگ درا کی اشاعت سے اقبال کے وفات تک کی شاعری بعد میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنی کتاب طیف اقبال میں یہی طریقہ استعمال کرتے ہوئے صرف ایک دور کا اضافہ کرتے ہوئے اقبال کی شاعری کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے۔

شاعری کا پہلا دور

اقبال کی شاعری کا پہلا دور ان کی شاعری کی ابتدا سے 1905ء تک یا بالفاظ دیگر اس وقت تک شمار کیا جا سکتا ہے جب وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر یورپ روانہ ہوئے۔ اس دور کی خصوصیات ذیل ہیں۔

روایتی غزل گوئی

اپنی شاعری کے بالکل ابتدائی زمانہ میں اقبال کی توجہ غزل گوئی کی جانب تھی اور ان غزلوں میں رسمی اور روایتی مضامین ہی باندھے جاتے تھے۔ واپس آنے کے بعد انہوں نے مرزا ارشد گورگانی سے اصلاح لینی شروع کی تب بھی ان کی غزلوں کا روایتی مزاج برقرار رہا۔ البتہ ان کی طبیعت کی جدت طرازی کبھی کبھی ان سے کوئی ایسا شعر ضرور کہلوا دیتی تھی جو عام ڈگر سے ہٹ کر ہوتا تھا۔ پہلے وہ زمانہ تھا جب استاد داغ کی زبان دانی اور شاعری کا چرچا تمام ہندوستان میں پھیلا تھا۔ اقبال نے اصلاح سخن کی خاطر داغ سے رابطہ پیدا کیا۔ وہ نہ صرف اپنی غزلوں پر داغ سے اصلاح لیتے رہے بلکہ داغ کا لب ولہجہ اور رنگ اپنانے کی کوشش بھی کی۔ اور داغ کی طرز میں بہت سی غزلیں کہیں۔ چند غزلیں جو اس دور کی یادگار کے طور پر باقی رہ گئی ہیں وہ واضح طور پر داغ کے رنگ نمایاں کرتی ہیں انہی میں سے وہ مشہور غزل بھی ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

☆☆☆

ترانۂ اقبال

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلے ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہو اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں — سمجھو وہی ہمیں بھی دل ہے جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا — وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزار ندیاں — گلشن ہے جن کے دم سے رشک جناں ہمارا
اے آبروئے گنگا وہ دن ہے یاد تجھکو — اترا تیرے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان، مصر وروما سب مٹ گئے جہاں سے — اب تک مگر ہیں باقی نام ونشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری — صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا
اقبالؔ کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں — معلوم کیا کسی کو درد نہاں ہمارا

☆☆☆

بحمداللہ تعالیٰ

''اُمت کے روشن چراغ'' جلد دوم کتاب کی تکمیل ہوئی۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ
بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ .

مولانا محمد عثمان عالم نادر قاسمی

مورخہ ۲۴ ستمبر ۲۰۱۳ء

مطابق ۱۷ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ، بروز منگل

شیخ طریقت حبیب الامت حضرت مولانا ڈاکٹر حکیم محمد ادریس حبان رحیمی ایم ڈی حفظہ اللہ
کی مزید تالیفات

۱	خوابوں کی تعبیر اور ان کی حقیقت	جلد اول ودوم (سوم زیر طبع)
۲	انوار السالکین	
۳	انوارِ طریقت	
۴	تصوف کی حقیقت	
۵	سفرنامہ جنوبی ہند تا جنوبی افریقہ	
۶	مفتاح الصلوٰۃ	
۷	ملفوظات حبیب الامت رحمۃ اللہ علیہ	دوجلدیں
۸	سوانح حاذق الامت رحمۃ اللہ علیہ	
۹	پیارے نبی کی پیاری دعائیں	
۱۰	خطباتِ رحیمی	دس جلدیں
۱۱	خطباتِ حبان برائے دفترانِ اسلام	دس جلدیں
۱۲	تفسیری خطباتِ حبان	دوجلدیں
۱۳	خطباتِ رمضان المبارک	چار جلدیں
۱۴	طالبات تقریر کیسے کریں؟	دس جلدیں
۱۵	خواتین کے لئے منتخب تقاریر	
۱۶	خواتین کے لئے اصلاحی تقاریر	
۱۷	مستورات کے لئے انقلابی تقاریر	
۱۸	الحب النبی صلی اللہ علیہ وسلم	
۱۹	زیارات حرمین شریفین	
۲۰	مجالسِ رحیمی	دوجلدیں
۲۱	فیضانِ گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ	
۲۲	اسرارِ طریقت	
۲۳	انجمن دیندار چن بسویشور امسلمان نہیں	
۲۴	رمضان المبارک کے مسائل وفضائل	
۲۵	امت کے روشن چراغ	تین جلدیں
۲۶	گناہوں کے انبار	دوجلدیں
۲۷	اسلام میں عورت کی عظمت	دوجلدیں
۲۸	فضائل اعمال کی فضیلت واہمیت	
۲۹	صحت مند زندگی کے راز	
۳۰	بیاض حبان (مجربات وآزمودہ نسخوں کا لاجواب طبی مجموعہ)	
۳۱	تصوف اور سلوک کی حقیقت	
۳۲	عملی زندگی	

☆☆☆